

# ترياق



نگہت سیمہ

”میری سمجھ میں نہیں آتا ماں کہ یہ آپا روز روز کیوں جھگڑا کر کے آجاتی ہیں۔“  
 رشک نے بیک ٹیبل پر رکھتے ہوئے کھانا گرم کرتی ہوئی آصفہ بیگم سے پوچھا۔  
 ”آہستہ بول، وہ سن لے گی۔“

انہوں نے باہر جھانک کر برآمدے میں بچے تخت پر بیٹھی مہک کو دیکھا، جو جب سے  
 آئی تھی یونہی تخت پر بیٹھی روئے چلی جا رہی تھی۔ زور پور سٹی سے آتے ہی رشک نے جو  
 اسے یوں تخت پر گھٹنوں پر سر دھرے بیٹھے دیکھا تو سمجھ گئی تھی کہ وہ ضرور لڑ کر آئی ہے، سو وہ  
 یوں ہی بیک اٹھائے کچن میں چلی آئی تھی۔  
 ”مگر ماں، یہ صحیح نہیں ہے۔ روز روز کا جھگڑا کر آنا، آپ انہیں سمجھاتی کیوں نہیں  
 ہیں۔“

”سمجھاتی تو ہوں۔“  
 آصفہ بیگم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔  
 ”پر وہ سمجھے تو۔“  
 ”مگر ہوا کیا ہے؟“  
 ”پتا نہیں کچھ بتایا تو ہے نہیں جب سے آئی ہے۔“  
 یوں ہی روئے چلی جا رہی ہے۔  
 ”آپ نے پوچھا تو ہوتا۔“

اس نے کاؤنٹر سے ٹیک لگاتے ہوئے آصف بیگم کی طرف دیکھا۔

”پوچھا تو تھا پر اس کی تو ہمیشہ کی طرح ایک ہی رٹ ہے کہ واپس نہیں جاؤں گی۔“

”آپا ایسی کیوں ہیں اماں وہ کیوں نہیں سوچتیں کہ اس طرح وہ زندگی کو ہمارے لیے اور مشکل بنا دیں گی۔ ابھی ابھی تو شا، ندا ہیں نا سمجھ وہ کیا سیکھیں گی آپا کے اس رویے سے اور پھر لوگ کیا سوچیں گے۔ ہمیں انہیں بھی بیاہنا ہے، شا اور ندا کو۔ آپا کے یہ روز روز کے جھگڑے ان کے مستقبل پر اثر انداز ہوں گے۔“

”وہ تیری طرح نہیں سوچتی چندا! وہ ہمیشہ سے ایسی ہی ہے۔ شاید میری بے جا محبتوں نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ عمار بہت نرم خو ہے۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک کب کا گھر سے نکال چکا ہوتا۔“

”مگر عمار بھائی بھی کب تک۔ اماں پلیز آپ انہیں سمجھائیں۔ ابھی ایک سال بھی شادی کو نہیں ہوا اور پچاس دفعہ لڑکر گھر آچکی ہیں۔“

”تو بھی تو کچھ بولا کرنا۔ اسے سمجھایا کر، نہ برباد کر لے اپنا گھر۔“

”میں، اماں میں بھلا کیا کہوں ان سے۔“

”اچھا چل باہر چل کر بیٹھ بہن کے پاس، میں کھانا دیں لے آتی ہوں؟“

”نہیں اماں، مجھے بھوک نہیں ہے۔“

اس نے بیک ٹیبل پر سے اٹھایا اور کچن سے باہر نکل آئی۔ مہک اسی طرح گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھی۔

”آپا!“

اس نے ہولے سے مہک کے کندھوں کو چھوا۔

”اب کیا ہوا ہے۔ اماں بتا رہی ہیں کہ آپ۔“

”ہاں میں واپس نہیں جاؤں گی۔ اماں نے تمہیں صحیح بتایا ہے۔ میں ہرگز واپس نہیں جاؤں گی۔“

”مگر آپا! ہو کیا ہے۔ کیا کلثوم اور صالحہ نے کچھ کہا ہے۔“

”کلثوم اور صالحہ، ان کی پروا کون کرتا ہے میری جوتی۔“

”امی جان نے۔“

”امی جان کو اپنے گھٹنوں کے درد سے فرصت کہاں ملتی ہے، جو وہ کچھ کہیں۔ ہر وقت

گھٹنوں کا درد لیے پڑی رہتی ہیں۔“

”تو پھر عمار بھائی نے کچھ کہا ہے۔“

”ہاں تمہارے عمار بھائی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اماں نے اور ماموں جان نے

کیا دیکھ کر عمار کا رشتہ پسند کیا تھا۔“

”عمار بھائی بہت اچھے ہیں مہک آپا! پڑھے لکھے ہیں، خوش شکل ہیں، مزاج کے بہت

اچھے ہیں اور۔“

”لیکن اپنی بیوی کی ایک چھوٹی سے خواہش کو پورا نہیں کر سکتے۔ کب سے کہہ رہی

ہوں کہ مجھے نایم کا وہ چھوٹا سیٹ لے دیں وہی جو اس روز ہم نے پٹیل جیولرز پر دیکھا تھا۔

زیادہ منگنا بھی نہیں تھا۔ صرف تیرہ ہزار کا تو تھا۔ لیکن کبھی جواب ہی نہیں دیا۔ کل رات میں

نے کہا ہماری شادی کی سالگرہ آنے والی ہے، مجھے وہی سیٹ گفٹ کر دیں۔ شادی کی پہلی

سالگرہ پر خوبصورت سا گفٹ۔ مگر پتا ہے آگے سے کہنے لگے۔

”میں اتنا قیمتی تحفہ دینے کا متمثل نہیں ہو سکتا۔ یہ سالگرہ تول کی خوشی ہے، میں نے

تو سوچا تھا تمہارے لیے مہجے کے پھول لے کر آؤں گا اور تم اپنا وہی عروسی لباس پہن کر۔“

”آپا!“ رشک نے تیزی سے بولتی ہوئی مہک کو ٹوک دیا۔

”ٹھیک تو کہتے ہیں عمار بھائی، چار ہزار تو ان کی تنخواہ ہے۔“

”اور کلثوم، صالحہ، خالد، امی جان، تم، اتنی بچت کہاں ہوتی ہوگی، ان کے پاس کہ وہ

تمہارے لیے تیرہ ہزار کا سیٹ خرید سکیں۔“

”تیرہ ہزار کا نہ سہی۔ ایک اور میں نے دیکھا تھا۔ چھ ہزار کا، وہی لے دیتے مگر تو یہ اودھ

مجھ پر کہاں پیسہ خرچ کر سکتے ہیں۔ انہیں تو کلثوم اور صالحہ کی شادی کے لیے پیسہ جمع کرنا

ہے۔ خالد کو تعلیم دلانی ہے۔ مجھ سے انہیں محبت نہیں ہے۔ میری تو زندگی تباہ کر دی ہے تم

نے اماں نے اور ماموں جان نے، تم سب نے مل کر میرے ساتھ دشمنی کی ہے۔“

وہ زور زور سے رونے لگی تو آصف بیگم گہرا کر کچن سے باہر آگئیں۔

ریشک نے دونوں ہاتھوں سے سر حام لیا۔

یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی، جب سے مہک کی شادی ہوئی تھی، وہ یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر عمار سے جھگڑا کر کے آجاتی تھی، پھر کبھی امی جان، کبھی صالحہ، کلثوم اور کبھی خود عمار آکر اُسے لے جاتا۔ یہ تو مہک کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے اتنے اچھے لوگ ملے تھے، عمار بے حد نفیس انسان تھے۔ صالحہ، کلثوم محبت کرنے والی لڑکیاں تھیں۔

امی جان بہت شفیق اور مہربان۔ مگر پتا نہیں کیا بات تھی مہک کسی کے ساتھ ایڈ جسٹ نہیں ہوئی تھی۔

صالحہ اور کلثوم اُسے مغرور لکنتیں، امی جان ظالم اور سفاک۔ خالد بد تمیز اور گستاخ۔

اور عمار بے حس اور کنگال

وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔

اور شاید وہ کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اُسے صرف اپنے آپ سے محبت تھی

اور بس۔

پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ بابا اور اماں کی بہت لاڈلی تھی اور تھی بھی وہ بہت خوبصورت۔ خدا نے اُسے حسن کی دولت بہت فراخ دلی سے دی تھی۔

لانی لانی آنکھیں، ان پر گھنیری پلکیں۔

بے حد لمبے سیاہ چمکیلے بال۔

دمکتا ہوا گلابی رنگ۔

گلاب کی کلیوں کیسے ہونٹ۔

اور اُسے اپنے حسن کا احساس بھی تھا۔

دن میں کئی بار وہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی تھی۔

”میری سیلیاں کتنی ہیں ریشک، تجھے تو کہیں اور پیدا ہونا چاہیے تھا کسی محل میں کسی

بادشاہ کے گھر۔“

کبھی کبھی وہ موڈ میں ہوتی تو ریشک سے کہتی۔

”مگر آپ! آج کل بادشاہ کہاں ہوتے ہیں۔“

شاپانی قابلیت کا رعب جھاڑتی تو وہ اُسے ڈانٹ کر بھگادیتی۔

”کیوں کوشی، بتانا مجھے کہیں اور پیدا ہونا چاہیے تھا۔ یہ گھر بھلا میرے شایان شان ہے

۔“

”پتا نہیں۔“

وہ بے بسی سے اُسے دیکھتی۔

”جس نے جہاں پیدا ہونا ہوتا ہے وہ وہاں ہی پیدا ہوتا ہے۔“

”اور پھر کیا پتا آپا۔“

نذا کو بھی کبھی اُس کی یہ بات پسند نہ آتی تھی۔

”آپ کسی بادشاہ کے گھر پیدا ہوتیں تو وہ اماں اور ابا کی طرح آپ سے پیار نہ کرتے۔

اماں ابا کتنے اچھے ہیں، آپ سے کتنا پیار کرتے ہیں۔“

”اور میں اماں ابا کو اور ریشک آپا اور حسام کو چھوڑ کر کبھی کسی بادشاہ کے گھر نہ جاؤں۔“

شا پھر آمو جو ہوئی۔

”اور آپا کو تو کوئی بادشاہ اپنی بیٹی بنا لے تو وہ ابھی اٹھ کر چلی جائیں اور ہم سب کو بھول

جائیں ہے نا۔“

”ہوں چلی تو جاؤں مگر تمہیں بھولوں گی نہیں۔“

وہ اُن کا دل رکھ لیتی، جبکہ ریشک کو یقین تھا کہ اگر ایسا ہو جائے تو وہ کبھی بھول کر بھی

کسی کو یاد نہیں کرے گی۔ اُسے تو یہ گھر پسند ہی نہیں تھا اور نہ ہی اس گھر کی کوئی چیز پسند تھی۔

ابا ہمیشہ اس کے لیے سب سے اچھی اور بہتر چیز لاتے تھے، اپنی حیثیت سے بڑھ کر مگر اُس کو

کبھی پسند نہیں آتی تھی۔

”اونہ! یہ بھی کوئی کپڑے ہیں۔ میری سیلیوں کے کپڑے دیکھیں اور جو تے

دیکھیں۔ پانچ پانچ سو کا ایک جو توں کا جوڑا ہوتا ہے اور یہاں دو سو کا سوٹ پینتیس کا جو تاد لو اگر

اماں سمجھتی ہیں، پتا نہیں کیا معرکہ مار لیا ہے۔“

”آپا! ریشک کا دل اُس کی باتوں پر دکھتا تھا۔

”ایسا تو نہ کہا کریں۔ اماں اور ابا کتنے شوق سے تمہارے لیے یہ سب لائے ہیں۔ وہ سنیں

مے تو ان کا دل دکھے گا۔“

”تو جھوٹ کہہ رہی ہوں میں، وہ ناظمہ نے تو عید کی ساری شاپنگ لبرٹی سے کی ہے، ملی شوز سے جوتے لیے ہیں اور مجھے پتا ہے لاس گئی ہوں گی!! چھروہ اور۔“

”آپا پلیز۔“

وہ منت کرتی۔

”تم دیکھو تو ذرا۔ اماں تمہارے لیے تو جاپانی سوٹ لائی ہیں اور یہ تمہارا جوتا بھی مینتیس کا کب ہے ایک سو چھپیس کا ہے۔“

”ہوں پتا ہے میں خرید لیے ہوں گے۔“

”نہیں دیکھو تو آپا، سوٹ ہے پورا اور پھر یہ رنگ کتنا خوبصورت ہے۔ تمہارے اوپر کتنا بچے گا۔“

وہ ہولے ہولے اُس کا دل نرم کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

”اور پھر آپا ناظمہ کے ابو تو اتنے بڑے بزنس مین ہیں اور ہمارے ابو تو سترہ گریڈ کے آفیسر ہیں اور ہم ماشاء اللہ اتنے سارے بہن بھائی ہیں۔“

”فرح کے ابو بھی تو سترہ گریڈ کے آفیسر ہیں لیکن گاڑی میں آتی ہے اسکول۔ ابو چھپا چھپا کر جمع کرتے ہیں خرچ نہیں کرتے ہم پر۔“

”نہیں آپا۔“ اُس کے دل میں جیسے برچھی سی لگتی۔

”ہمارے ابو جان نیک اور ایماندار ہیں اور ہم سے بہت محبت کرتے ہیں وہ ہم سے کچھ نہیں چھپاتے غلط گمان نہ کیا کرو اور پھر تم سے تو وہ بہت محبت کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ۔“

لیکن مہک کو یقین نہ آتا۔ اُس کے دل پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ پتا نہیں وہ اتنی بے حس کیوں تھی۔ ثناء اور ندا کی کوئی چیز پسند آتی تو مزے سے چھین لیتی۔ اُن کے ذرا ذرا سے منہ نکل آتے اور تو اور ابابکھی حسام کے لیے کوئی کھلونا لاتے تو وہ بھی چھین کر خود کھیلنے لگتی۔

”او نہ! ہمیں تو کبھی ایسا کھلونا لے کر دیا نہیں۔“ وہ بس ایسی تھی۔ اب تو آصفہ بیگم بھی پریشان رہنے لگی تھیں۔

”یہ مہک کا مزاج ایسا کیوں ہے۔“

کبھی کبھی وہ سوچتیں۔

کیا کہیں اُن کی تربیت میں کوئی خامی رہ گئی تھی۔ مگر رشک بھی اُن کی بیٹی تھی۔ اُس سے بالکل مختلف، سنجیدہ، حساس اور ہر ایک کے لیے سوچنے والی۔

ماں باپ کے دکھ سکھ شیئر کرنے والی ذرا ان کے سر میں درد بھی ہوتا تو ان کے پاس سے نہ ہٹتی تھی۔ جبکہ مہک نے کبھی پوچھا تک نہیں تھا۔ حالانکہ میٹرک کے بعد اُس نے مزید پڑھنے سے انکار کر دیا تھا اور سارا دن گھر میں لیٹی رہ سالی پڑھا کرتی اور آصفہ بیگم اکیلی کام کرتی تھیں۔ البتہ رشک کالج سے آکر شام کا سارا کام خود کرتی تھی۔

”ارے تو تھکی ہوئی ہے نا۔“

وہ اُسے منع کرتی رہ جاتیں۔

”نہیں اماں بس آپ اب آرام کریں۔ بیٹیاں کس لیے ہوتی ہیں۔ اتنا سکھ بھی نہ ملے اُن کے دم سے تو کیا فائدہ اور پھر جب اباجانک بیمار پڑے تو رشک نے جس طرح سارے گھر کو سنبھالا، ہاسپٹل، گھر، کالج وہ ساری ذمہ داریاں نبھاتی تھی۔ ملک صاحب ہاسپٹل سے گھر آگئے تو ان کی دوائیں لانا، کالج سے آکر اُن کے پاس بیٹھا۔ اماں کو تسلی دینا، ثناء اور حسام کا خیال رکھنا۔ اُن کی فیسیں جمع کرانا۔ بازار سے ضروری شاپنگ کرنا۔

ابا کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا۔ سارے کام خود بخود ہی اس نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ مہک کو ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ وہ بس اپنے رسالوں کی دنیا میں گم رہتی تھی۔ بیماری کے دنوں میں وہ ملک صاحب کے بہت قریب ہو گئی تھی۔ وہ بالکل دوستوں کی طرح اُس سے ہر بات پر ڈسکس کرتے، آفس کے معاملات میں بھی مشورہ لیتے حسام، ثناء، ندا کا خیال رکھنے کو کہتے۔

”اگر مجھے کچھ ہو گیا۔ میں نہ رہا تو بیٹا تم ان سب بہن بھائیوں کا خیال رکھنا۔ حسام کو اعلیٰ تعلیم دلوانا۔ میں نے اس کے لیے بڑے خواب دیکھے ہیں اور مجھے پتا ہے میں جانتا ہوں کہ مہک ان سب ذمہ داریوں کی اہل نہیں تھی نہ ہے۔ بیٹا وہ تمہاری بڑی بہن ہے۔ اگر کبھی زیادتی بھی کر جائے تو نظر انداز کر دینا میں چھتا ہوں، وہ بعض اوقات تم سب کی حق تلفی کر جاتی ہے۔ وہ ایسی ہی ہے، میں نے اپنے کم و سائل میں بھی اُس کی ہر خواہش پوری کی ہے۔ پتا

نہیں کیوں مجھے لگتا ہے، جیسے میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا۔“

”نہیں ابو بلیز آپ اس طرح نہیں کہیں۔“

وہ اُن کا ہاتھ تھام کر رونے لگتی۔

”نہیں بیٹا! تم آنسو نہ بہاؤ، تمہیں تو بہت بہادر بننا ہے۔ میری جان ان سب کو میرے

بعد تم نے ہی سنبھالنا ہے۔ کسی کو دکھی نہ ہونے دینا۔ اپنی ماں کا بہت خیال رکھنا۔ میں اُسے کوئی بہت زیادہ سکھ نہیں دے سکا اور شاید تم لوگوں کو بھی تمہارے حسبِ مثال زندگی سیکھانے کا

”نہیں ابو! آپ نے ہمیں سب کچھ دیا ہے۔ ہم سب تو بہت خوش ہیں، بہت مطمئن

ہیں۔“

”پر تیری آپا تو کبھی مطمئن نہیں رہی۔ میں اُس سے ہمیشہ شرمندہ رہا۔ بیٹا اُس کے

خلاف مرضی کبھی کچھ نہ کرنا وہ جو کئے ایسا ہی کرنا۔ اُس کا دل بہت چھوٹا ہے۔ اُس میں ذرا بھی برداشت نہیں ہے۔ تو اپنا دل بڑا کرنا۔“

بلک صاحب وقفاً وقتاً اُسے آنے والے لمحوں کے لیے تیار کرتے رہتے تھے۔ مگر اُسے

یقین تھا انہیں کچھ نہیں ہو گا ابھی وہ بہت سارے سال زندہ رہیں گے۔ اُس نے کئی لوگوں کو

دیکھا تھا دل کے مریضوں کو جنہیں دس دس، بارہ بارہ سال یہ تکلیف تھی اور وہ زندہ تھے۔

لیکن ملک صاحب تو دوسرے ایک میں ہی دنیا سے منہ موڑ گئے۔ اب جبکہ بظاہر وہ بالکل صحت

مند لگتے تھے اور وہ ان کی طرف سے بالکل مطمئن تھی کہ ایک رات اچانک انہیں شدید درد

اٹھلا فوراً ہی انہیں ایمر جنسی میں لے گئی تھی۔ مگر ساری کوششیں بیکار گئیں۔

اُسے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیے چھ ماہ ہی تو ہوئے تھے۔ اس نے سوچا وہ پڑھائی چھوڑ

کر نوکری کر لے۔ مگر آصف بیگم نے منع کر دیا۔

”نہیں چندہ، یہ ڈیڑھ سال کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گا۔ تو اپنی تعلیم مکمل کر لے

یہ تیرے ابا کی خواہش تھی۔“

یوں اُس نے کچھ ٹوشن وغیرہ کر لی تھیں۔ ملک صاحب کے واجبات وغیرہ کے سلسلے

میں دلدار ماموں نے بہت مدد کی تھی۔ دلدار ماموں آصف بیگم کے چچا زاد اور دودھ شریک

بھائی تھے۔ اتفاق سے ملک صاحب اور آصف بیگم دونوں ہی اکلوتے تھے۔ قریبی رشتہ داروں

میں دلدار ماموں کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور وہ حقیقی معنوں میں ہمدرد تھے۔ دس پندرہ دن

بعد ضرور پھر لگاتے۔ رشک کا حوصلہ بڑھاتے آصف بیگم سے اُن کے مسائل پوچھتے۔

حسام کو وقت دیتے۔ ملک کے لیے رشتہ بھی وہی لائے تھے۔

”عمار بہت اچھا لڑکا ہے سمجھدار اور بااخلاق خاندان بھی بہت اچھا ہے۔ ذاتی طور پر جانتا

ہوں۔ عمار کے والد میرے دوست تھے۔ اُن کی وفات کے بعد عمار نے گھر کو جس طرح

سنبھالا اور اپنی پڑھائی جاری رکھی، قابلِ تعریف ہے۔ میری کوئی بیٹی ہوتی تو میں بلا تامل

اُسے اپنی فرزندگی میں لے لیتا۔“

آصف بیگم کو بھی وہ سب بہت پسند آئے تھے اور عمار تو تھا ہی قابلِ تعریف رشک کو بھی

اچھا لگا۔ پھر بھی ملک کے مزاج کے پیشِ نظر اس نے آصف بیگم سے کہا کہ وہ ملک کی مرضی

پوچھ لیں۔ ملک نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ عمار اس کے خوابوں کے شہزادے کی طرح ہی تو تھا

۔ یوں ملک رخصت ہو کر عمار کے گھر چلی گئی تھی۔

عمار کی دو چھوٹی بہنیں تھیں۔

کلثوم اور صالحہ دونوں کالج میں پڑھتی تھیں۔

ایک بھائی تھا خالد جو اسکول میں تھا۔

ایک اور بھائی تھا عمار سے چھوٹا لیکن جسے بچپن میں ہی اس کے تایا نے گود لے لیا تھا۔

اس لیے رشک نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عمار کی شادی پر بھی نہیں۔ عمار سے ہی پتا چلا تھا

کہ تایا چند سال پیشتر کسی بات پر خفا ہو گئے تھے۔ اُس کے بعد انہوں نے کوئی تعلق ہی نہیں

رکھا۔

اور عمار کی والدہ تھیں۔

بہت نرم خور اور سادہ مزاج۔

سب لوگ ہی بہت محبت کرنے والے اور پیارے تھے۔ رشک کو تو خالد بالکل حسام کی

طرح اور کلثوم اور صالحہ، شائردہ کی طرح لگی تھیں۔ لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، ملک ذرا بھی

خوش نہیں تھی۔

کلوٹم اور صالحہ سے وہ ٹھیک طرح سے بات ہی نہ کرتی تھی۔

خالد اس کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا اور وہ اکثر لڑ بھگڑ کر گھر آ جاتی تھی اور رشک حیران ہو کر سوچا کرتی اتنے پیارے پیارے لوگوں سے کوئی کیسے نفرت کر سکتا ہے، اور یہ مہک کا دل اتنا پتھر کیوں ہے اور خالد تو اتنا پیارا بچہ ہے کہ اس پر خود بخود پیار آتا تھا۔ کلوٹم اور صالحہ اتنی خاموش طبع اور دھیمے مزاج کی تھیں کہ ان سے تو لڑائی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پتا نہیں مہک کیوں ایڈ جسٹ نہیں کر پار ہی تھی۔

”رشک بیٹا! کیا ہوا۔“

آصفہ بیگم نے اسے یوں سر ہاتھوں میں تھامے دیکھ کر پریشانی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں اماں! یوں ہی بس تھک گئی ہوں۔“

”صبح خالی پیٹ چلی جاتی ہے۔ تھوڑا سا کچھ کھ لے۔“

”آپا نے کھالیا؟“ اس نے بدستور روتی ہوئی مہک کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“

”اچھا آپا! اب رو بادھونا چھوڑیں اور کھانا کھالیں۔“

”نہیں۔“ اس نے ناک اور آنکھیں پونچھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”پلیز آپا۔“

”میری کسی کو پروا نہیں ہے ابا ہوتے تو کاہے کو بھلا میرے ساتھ یہ ظلم ہوتا۔ وہ اتنے کنگال آدمی سے مجھے کیوں بیاہتے اور وہ ابھی آئے گا عمار کا بچہ تو اماں مجھے اس کے ساتھ بھیج دیں گی۔ مگر میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔“

”اماں تمہاری مرضی کے خلاف تمہیں ہرگز نہیں بھیجیں گی، بس اب اٹھو شاباش منہ ہاتھ دھو کے کھانا کھاؤ، اماں کتنی پریشان ہو رہی ہیں۔“

”پکی بات ہے“ وہ رشک کو دیکھنے لگی۔

”اماں مجھے زبردستی تو نہیں بھیجیں گی۔“

”نہیں۔“ رشک افسردگی سے مسکرائی۔

”بس اب اٹھ بھی جاؤ۔“

”اچھا!“ وہ منہ ہاتھ دھونے کے لیے ہاتھ روم چلی گئی تو آصفہ بیگم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”ایسے وعدے کیوں کرتی ہے بیٹی، عمار لاکھوں میں ایک ہے۔ آئے گا لینے تو میں خود بھیج دوں گی اسے، بلکہ خود چھوڑ آؤں گی۔“

”نہیں اماں! ابونے کہا تھا کہ کبھی اس کی خلاف مرضی کوئی بات نہ کرنا۔ ابا ہوتے تو بھلا آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ سکتے بس مجھے ابا کا خیال آ جاتا ہے۔“

وہ بیک کندھے پر لٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

”اچھا اماں میں ذرا ماموں کے ہاں جا رہی ہوں۔ راجیل نے ایک دو ٹیوشنز دلانے کا کہا تھا۔“

”ابھی تو تھکی ہوئی آئی ہے۔“

”شام کو پھر ٹیوشنز کے لئے پڑھانے جانا ہو گا۔ اگر دیر ہو گئی تو میں وہاں سے ہی ٹیوشن کے لئے چلی جاؤں گی۔ اور ابھی آپ آپا کے کچھ مت کئے عمار بھائی آ جائیں تو انہیں سمجھا کر بھیج دیجئے گا کہ ایک دور روز میں آ جائیں گی۔ اچھا خدا حافظ۔“

وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر گھر سے باہر نکل آئی۔ حالانکہ اس پتا تھا کہ راجیل آفس سے نہیں آیا ہو گا۔ اور نہ ہی دلدار ماموں گھر پر ہوں گے۔ شاید فکیل اور عقیل کالج سے آ گئے ہوں۔ اس نے سوچا ان سے گپ شپ لگائے گی تو شاید ذہن پر دھرا یہ بوجھ کم ہو جائے گا۔ آج وہ یونیورسٹی سے جلدی چلی آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا۔ اماں کے ساتھ بازار جا کر ننداٹا اور حسام کے لئے گرمیوں کے کچھ کپڑے خریدے گی کل شام اسے منیر احمد نے ٹیوشن فیس دی تھی۔ مگر مہک کی اس بے وقت آمد نے اس کا دل برا کر دیا تھا۔

کیا مہک کبھی خوش رہ سکے گی۔

کیا وہ کبھی عمار کو قبول کر لے گی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اسے عمار پر ترس آتا تھا۔

مہک اس کے ہرگز قابل نہ تھی۔

اتنے نفیس شخص کے لئے تو کوئی اتنی ہی نفیس لڑکی ہونی چاہئے تھی مگر جب قسمت

نے دونوں کو ایک کر دیا تھا تو۔

مہک خوبصورت تھی؛ دلکش تھی۔

کوئی بھی مرد اس کی ہمرانی پر فخر کر سکتا تھا۔

اگر۔ اگر وہ تھوڑا سا اپنا مزاج بدل لیتی۔

میں اسے سمجھاؤں گی۔

اس نے تقریباً دوڑ کر چلتی ہوئی بس کا ڈنڈا پکڑا۔ اگر یہ بس نکل جاتی تو پھر دوسری بس تو

بست دیر سے آتی۔

”آپ پلیز ادھر بیٹھ جائیں۔“

کسی نے قریب سے کہا۔

”شکریہ!“

اُس نے اجنبی شخص کی طرف دیکھتے بغیر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پورے آدھے گھنٹے کا

سفر تھا اور وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔

”دنیا میں ابھی اچھے لوگ ہیں اور ہم یونہی مایوس ہوتے رہتے ہیں کہ دنیا اچھے لوگوں

سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔“ بیک کندھے سے اتار کر گود میں رکھتے ہوئے اس نے یونہی

سر اٹھا کر سرسری نظر سے اس اچھے آدمی کو دیکھا تو ذرا سا چوکی، وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس

کے ہونٹوں پر ایک دل فریب سی مسکراہٹ تھی۔

یہ صورت اتنی اجنبی تو نہیں لگ رہی تھی، شاید پہلے بھی کہیں دیکھا تھا اسے، مگر کہاں

۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

شاید یونیورسٹی میں کہیں دیکھا ہو۔

اور مہک آیا۔

اُس کا دھیان پھر مہک کی طرف چلا گیا۔

پتا نہیں عمار بھائی کیا سوچتے ہوں گے۔

اور امی جان کیا کہتی ہوں گی۔

کس قدر احقانہ ضد ہے۔ نیلم کا سیٹ اور عمار بھائی بے چارے کہاں سے لائیں گے۔

پھولوں سے زیادہ خوبصورت تھنہ بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ مگر آپا سمجھیں تو۔

”یا اللہ! میرا دل اور میرا دماغ آپا کو دے دے۔“

اُس نے بے آواز دعا کی اور آنکھیں بند کر کے سیٹ سے سر ٹیک لیا۔

”آپ کا اسٹاپ آگیا ہے خاتون۔“

کیسی خوبصورت آواز تھی۔ بیٹھی بیٹھی سی مگر بے حد شفیق، بے حد مہربان سی۔

وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔

”شکریہ!“ بس سے اتر کر ایک بار پھر اس نے اجنبی کو دیکھا۔

”کہاں دیکھا تھا بھلا اسے؟“

اجنبی کی نظریں ملیں تو اس نے جلدی سے منہ موڑ لیا اور تیز قدموں سے چلنے لگی۔

اس اسٹاپ پر اترنے والی وہ اکیلی تھی۔ اجنبی کی منزل شاید آگے کہیں تھی۔

”پتا نہیں کون تھا۔ کیا نام تھا۔“

وہ غیر ارادی طور پر اُسی کے متعلق سوچے چلی گئی۔

پتا نہیں کیا بات تھی سوچیں کہیں کسی ایک مرکز پر مرکوز ہی نہیں ہوتی تھیں۔ سوچنے

کے لیے اس کے پاس اتنی بہت ساری باتیں تھیں۔ مگر وہ کچھ سوچ ہی نہیں پار ہی تھی۔

آج صبح سے سید صاحب کے لیکچر کے دوران بھی وہ یونہی خالی الذہن سی بیٹھی رہی

تھی۔ پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہے تھے۔ اس نے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ اس لیے توجہ انہوں نے

اس کی رائے پوچھی تو وہ یونہی ان کا منہ دیکھتی رہی۔

”کیا بات ہے؟ آپ کہاں تھیں؟“

”یہاں ہی سر۔“

اُس نے گھبرا کر سب کی طرف دیکھا۔

فرج، نجم، کوثر، کاشف، سمیرا سب مسکرا رہے تھے۔

”یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟“

کال بیل پر انگلی رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

”ابھی تو ابو کو اس دنیا سے گئے صرف آٹھ ماہ ہوئے ہیں اور میں ابھی سے تھکنے لگی ہوں



کیا؟ ابھی تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ چند ٹیوشنز پندرہ سولہ سو روپے بھلا ان سے ہوتا ہی کیا ہے۔ جانے اماں کیسے سارے خرچ پورے کرتی ہیں۔

”آہا! آج تو رشک ماہ صاحبہ تشریف لائی ہیں۔“  
دروازے پر عقیل کھڑا تھا۔

”گھر کا رستہ مل گیا تھا۔“

عقیل کے پیچھے سے کلیل نے سر نکالا۔

”ہاں مل گیا تھا، مگر تمہیں تو کبھی نہیں ملتا۔“

اس نے بیگ کھینچ کر کلیل کو مارا جسے کلیل نے کیچ کرتے ہوئے زور سے چیخ کر آواز

دی۔

”لیجے آپ کی لاڈلی اگئی ہیں۔“

”کون رشک آئی ہے۔“

ممائی جان آنکھیں ملتے ہوئے کمرے سے نکل آئیں۔

”السلام علیکم ممائی جان۔“

اُس نے انہیں سلام کیا اور انہوں نے گلے سے لگا کر اُس کی پیشانی چومی۔

”بڑے دنوں بعد آئی ہو۔“

”بس وقت ہی نہیں ملتا۔“

”بڑی آدمی ہو گئی ہیں۔“ عقیل نے لقمہ دیا۔

”بڑے آدمی میری طرح بسوں میں لٹک کر نہیں آتے۔“

”آج پھر لٹک کر آئی ہیں حسبِ معمول۔“

کلیل ہنسا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ہر وقت خواب کیوں دیکھتی رہتی ہیں۔ بس اسٹاپ پر

کھڑی ہیں اور دماغ جانے کہاں ہے۔ آنکھیں آسمان پر لگی ہوئی ہیں اور بس جب پاس آکر گزر

جاتی ہے تو پھر بھگتی ہیں اس کے پیچھے۔“

”تم تو ہر وقت میرے ساتھ ہوتے ہو۔“

وہ وہیں برآمدے میں پچھی چارپائی پر دھپ سے گر پڑی جیسے بہت تھکی ہوئی ہو۔

”یونیورسٹی سے آئی ہو۔“ ممائی جان نے پوچھا۔

”نہیں گھر سے آئی ہوں۔“

”آپا کیسی ہیں اور بچے۔“

”سب ٹھیک ہیں۔“

وہ ایک دم مطمئن سی نظر آنے لگی تھی۔ پتا نہیں کیا تھا۔ اس گھر کی فضا میں یہاں آکر

تھوڑی دیر کو وہ ساری پریشانیاں بھول جاتی تھی۔

”حسام کو لے آئیں۔ بہت دونوں سے نہیں دیکھا۔“

”خود تو لٹک کر آئی ہیں۔ اسے کہاں لٹکائیں۔“

کلیل کو اُسے ٹھک کرنے میں مزا آتا تھا۔

”آج لٹک کر نہیں آئی۔“ وہ مسکرائی۔

”واقعی۔“ کلیل نے آنکھیں پھاڑیں۔

”یقین نہیں آ رہا۔“

”سچ کہہ رہی ہوں۔“

”کیا آپ نے آج اسٹاپ پر کھڑے ہو کر کوئی خواب نہیں دیکھا۔ یا اللہ! یہ آج میں کیا

سن رہا ہوں یعنی محترمہ رشک ماہ صاحبہ آج صبح وقت پر بس میں سوار ہوئیں اور سیٹ پر بیٹھ

کر آئی ہیں۔ انقلاب۔“

”کیا آپ بس کے ریٹکنے سے پہلے ہی سوار ہو گئی تھیں۔“

”نہیں تو بس تو چل پڑی تھی۔“

اس نے پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر پیچھے کیا۔

”پھر کیا آج بس میں رش نہیں تھا۔“

”تھا تو بس ایک بھلے آدمی نے سیٹ دے دی۔“

وہ ہنسی۔

”سب تمہاری طرح بد اخلاق تو نہیں ہوتے۔“

”ہاں کچھ آپ کی طرح بااخلاق بھی ہوتے ہیں۔“

ٹھیکل نے چڑ کر کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ آخر دیر کیوں کر دیتی ہیں۔“

”پتا نہیں کیوں۔“

اُس نے معصومیت سے کہا اور پھر مڑ کر ممائی جان کی طرف دیکھنے لگی۔

”آج کیا کھا تھا۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“

”ارے آتے ہی کیوں نہ کہا۔ میں ابھی لاتی ہوں گرم کر کے۔ کر لیے گوشت پکایا ہے۔“

راحیل کو بہت پسند ہے۔ ابھی آتا ہی ہو گا۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آپ بیٹھیں میں خود گرم کر کے روٹی ڈال لیتی ہوں۔“

”نہ نہ بچی تم بیٹھو باتیں کرو بھائیوں سے۔ راحیل کے لیے بھی تو ڈالنی تھی۔“

”ہاں جناب رشک ماہ صاحبہ اور کیا حال چال ہیں یہ چہرے پہ بارہ کیوں بچ رہے ہیں

کیس۔ آئی نے مارا تو نہیں۔“ ٹھیکل نے پوچھا۔

”بارہ تو ہمیشہ ہی بجے رہتے ہیں۔“

عقیل نے جواب دیا۔

”تمہاری شکلیں دیکھ کر۔“

”کیوں ہماری شکلوں کو کیا ہے۔ کیا چندے آفتاب چندے متاب صورتیں ہیں کہ اگر

کوئی پری دیکھ لے تو اغوا کر کے ہی لے جائے۔“

”تو کیا تمہارے کالج میں کوئی پریاں نہیں۔“

”نہیں۔“ عقیل نے برا سامنہ بنایا۔

”کو ایجوکیشن نہیں ہے وہاں؟“

”چلو خیر ادھر ادھر راستے میں تو نظر آتی ہوں گی۔“

”دیوں کی قید میں ہوتی ہیں۔“

”ویری سیڈ۔“

اُس نے دیوار سے ٹیک لگالی اور انہیں دیکھنے لگی۔ دونوں جڑواں تھے۔ بی۔ ایس۔ سی کر رہے تھے اور دونوں ہی اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ بالکل دوستوں کی طرح انہوں نے اسے ابو کی موت کے بعد کمپنی دی تھی۔ کتنی کتنی دیر تک اس کے پاس بیٹھ کر اپنی دلچسپ باتوں سے اس کا دل ہلاتے تھے۔ وہ اکثر سوچتی اگر اس کے کوئی بھائی ہوتے تو ایسے ہی ہوتے۔

یوں ہی ہمدرد اور نرم خو۔

خوش مزاج اور ہنس کھ۔

”نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا۔“ ٹھیکل نے شوخی سے اسے دیکھا۔

”بہنوں کی نظر بھائیوں کو نہیں لگتی۔“

اس نے آنکھوں میں نمی سی اتر آئی تو وہ سر جھکا کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

اگر جو یہ سب نہ ہوتے۔ دلدار ماموں ممائی، ٹھیکل عقیل اور پھر سب سے بڑھ کر راحیل۔

تو وہ ابو کے بعد کیسے جی پاتی۔

اُسے تو یوں لگتا تھا جیسے اُس کا سارا حوصلہ ساری ہمت بس ابو کے دم سے ہی تھی۔ وہ جو بھاگ بھاگ کر سارے کام کرتی تھی۔ تو ابو نے جانے اسے کتنا بہادر سمجھ لیا تھا کہ وہ ساری ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈال کر چلے گئے تھے۔

میں اتنی بہادر نہیں ہوں راحیل۔

بہت کمزور ہوں۔

میں کیسے سب کا خیال رکھوں گی۔

کیسے سب کو خوش رکھوں گی۔

وہ کتنی ہی دیر تک راحیل کا ہاتھ تھامے روتی رہی تھی اور راحیل اسے دلاسا دیتا رہا تھا۔

”کیوں گھبراتی ہو کوشی ہم سب جو ہیں تمہارے ساتھ تم اکیلی تو نہیں کسی بھی لمحے کسی

معی مشکل میں مجھے آواز دے لینا تم ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ پاؤ گی۔ اپنے ہم قدم۔“

راحیل بہت اچھا تھا، بہت مہربان۔

بچپن ہی سے اس کی اور راحیل کی بہت دوستی تھی۔ مہک تو ہمیشہ راحیل سے لڑتی رہتی تھی۔ اس کے کھلونے چھین لیتی اس کی نظر بچا کر اس کے کھلونے توڑ دیتی تھی اور اس کی جھوٹی شکایت لگا کر ماموں سے اسے ڈانٹ پڑواتی۔ مگر وہ جب بھی اس کے گھر جاتی، راحیل مہک سے چھپ کر اسے چاکلیٹ دیتا، اپنے نئے کھلونے اور کتابیں دکھاتا۔ یوں بچپن کی یہ دوستی بڑھتے بڑھتے ایک گہری محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ جس سے وہ خود بھی بے خبر تھے۔ بس اسے اتنا پتا تھا کہ جب بھی پریشان ہوتی تھی راحیل کے پاس بھاگی آتی تھی۔ اور وہ مہربان دوست کی طرح اس کی پریشانیاں شیر کرتا۔

”گئیں“ ٹکیل نے اسے سوچوں میں ڈوبے دیکھ کر کہا۔

”کہاں؟“ عقیل نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرائے۔

”دوسری دنیا میں۔“

”کیا دوسری دنیا اس دنیا سے زیادہ خوبصورت ہے رشک ماہ صاحب۔“ عقیل نے پوچھا۔

”نہیں مجھے کیا پتا۔“ وہ جھینپ گئی۔

”اور یہ جو آپ بیٹھے بیٹھے چلی جاتی ہیں وہاں تو میں نے سمجھا، وہ بہت خوب صورت جگہ ہوگی۔“

”رشک.....!“

”بڑی ہوں تم سے لیکن کبھی جو تم نے باجی یا آپا کہہ کر پرکارا ہو۔“ اس نے ٹکیل کو بات مکمل نہ کرنے دی۔

”آپا تو بس مہک آپا ہی ہیں۔ آپ تو آپا لگتی ہی نہیں۔“

”ہاں مہک!“

اس کا دھیان پھر مہک کی طرف چلا گیا۔

اور اگر مہک واپس نہ گئی تو ضدی بھی تو بہت ہے پھر۔ پھر کیا ہوگا کیا عمار بھائی آپا کو.....

میں میرے خدا نہیں۔ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ راحیل بھی تو ابھی تک نہیں آیا۔

”رشک بیٹی!“ ممانی جان نے آواز دی۔

”بیٹی! ادھر آ جاؤ کچن میں۔“

”جی!“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بات کیا ہے خاتون؟“ ٹکیل نے اس کا آنچل پکڑ کر کہا۔

”صاف صاف بتا دیں ٹیوشن ختم ہو گئی ہیں۔“

”نہیں تو۔“

”پھر کیا ہے۔ یہ بار بار آپ مراقبہ میں چلی جاتی ہیں۔ آنکھیں نم ہو رہی ہیں۔ دن کے

تین بجے پہنچ رہی ہیں اور کھانا کھایا ہی نہیں اور.....“

”کچھ بھی نہیں۔“

”چھوڑو پار، ہمیں کچھ سمجھیں تو بتائیں نا۔“

عقیل نے ٹکیل کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

”ہم ہی پاگل ہیں بس۔“

”نہیں..... نہیں تو قسم سے ایسے ہی ادھر تو..... نہیں بھاگی چلی آتی۔ تم سب کو اپنا

سمجھتی ہوں اس لیے نا۔“

”صرف زبانی زبانی۔“ ٹکیل نے بدستور روٹھنے کی ایکٹنگ کی تھی۔

”وہ..... وہ اصل میں بات تو کوئی نہیں ہے بس ایسے ہی وہ مہک آپا ہیں نا وہ پھر عمار بھائی

سے ناراض ہو کر چلی آئی ہیں۔“

”تو.....؟ ٹکیل نے بھنویں اچکائیں۔

”دو چار روز میں غصہ اتر جائے گا تو چلی جائیں گی۔“

”نہیں۔ وہ کہتی ہیں اب ہر گز نہیں جائیں گی اور میں نے وعدہ بھی کر لیا ہے کہ ان کو

اماں زبردستی نہیں بھیجیں گی، مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں عمار بھائی انہیں.....“

اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اسی وقت راحیل

گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا اور برا آندے میں کھڑی دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے روتی

ہوئی رشک کو دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

”کیا ہوا رشک؟ گھر میں سب خیریت تو ہے نا۔“

اس نے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹا کر راحیل کو دیکھا۔

”ہاں!“

”پھر یہ رویا کس سلسلے میں جا رہا ہے؟“

”یوں ہی“ اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھے۔

”پتا نہیں کیوں وہ اتنی کمزور ہو جاتی تھی۔ ذرا سی ہمدردی پا کر بکھر نے لگتی تھی۔“

”مہک آپا عمار بھائی سے لڑ کر واپس آگئی ہیں۔ ٹھیکل نے بتایا۔“

”اوہ“ راجیل نے ایک گہرا سانس لیا اور چارپائی پر بیٹھ کر جوتے اتارتے ہوئے اس نے

نرمی سے کہا۔

”کوئی نئی بات تو نہیں ہے نارٹک! ویسے ہی گھبرا جاتی ہو“

”ہاں نئی بات تو نہیں تھی۔“

اس نے سوچا اور مسکرائے کی کوشش کی۔

”آج دیر نہیں کر دی تم نے؟“

”ہاں آفس سے تو جلدی اٹھ آیا تھا پھر تمہارے کام کے سلسلے میں چلا گیا تھا۔“

”کیا ہوا۔“ وہ اس کے سامنے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”رٹک!“ ممانی جان نے پھر آواز دی۔

”امی، بھائی جان بھی آگئے ہیں ٹھیکل نے بتایا۔“

”دونوں کے لیے کھانا یہاں ہی لے آئیں۔“

اور کھانا کھائے ہوئے اس نے راجیل کو پوری تفصیل بتادی۔

”اب تم ہی بتاؤ راجیل، عمار بھائی بے چارے تیرہ ہزار کاسیٹ کہاں سے خرید کر دیں۔“

جبکہ ان کے کندھوں پر اتنی ذمہ داریاں ہیں۔ آپ کو تو چاہیے کہ ان کے مسائل شیر

کریں۔ ان کے لیے زندگی کو آسان بنائیں مشکل نہیں۔“

”وہ تمہاری طرح نہیں سوچتی رٹک تم.....“

راجیل نے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے بہت غور سے دیکھا۔

دلکش براؤن آنکھیں۔

براؤن بال، جو بے ترتیبی سے کٹے ہوئے تھے۔

دستکتا ہو گلابی رنگ۔

چھوٹے چھوٹے ہموار دانت۔

اور بے حد خوبصورت ہونٹ۔

وہ کسی طرح بھی مہک سے کم خوب صورت نہ تھی۔

”تم بہت اچھی ہو اور وہ شخص بہت خوش نصیب ہو گا جس کی تم رفیق بنو گی۔“

”مگر مجھے تو شادی ہی نہیں کرنا۔“

اس نے گلاس راجیل کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

”تم نہیں جانتے کیا میرے کندھوں پر کتنی ذمہ داریاں ہیں۔“

ذمہ داریاں ہمیشہ تو نہیں ہوں گی۔

”ذمہ داریاں بھاتے بھاتے بوڑھی ہو جاؤں گی۔“

”کیا خبر کوئی تمہارا انتظار کرے۔“

”کون؟“

اس نے گلاس میز پر رکھا۔

”مثلاً میں“

”تم“

”ہاں میں۔“

”دیکھا جائے گا۔“

اس نے کندھے اچکائے۔

”اب مجھے بتاؤ میری ٹوشن کا کیا کیا؟“

”میرا ایک بہت اچھا دوست ہے اس نے ٹوشن سینٹر کھول رکھا ہے۔ شام کے

کے لیے اسے سائنس ٹیچر چاہیے۔ دو ہزار تنخواہ دے گا تین سے پانچ بجے تک پڑھانا ہو۔

نویں، دسویں کے لڑکے لڑکیوں کو سائنس کے مضامین پڑھانے ہوں گے اور پھر وہ سینٹر

تمہارے گھر سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے میں پڑھا دوں گی۔ تم مجھے کل شام لے چلنا۔“

”تم تین بجے تک یونیورسٹی سے آتو جاتی ہونا۔“

”تقریباً کبھی کبھی دیر ہو جاتی ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے میں آفس سے سیدھا تمہارے گھر آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے بیٹھو نا، ابھی تو میں آیا ہوں۔“

”مگر مجھے ٹیوشن پڑھانے جانا ہے بٹ صاحب کے بچوں کو۔ ساڑھے چار تو بج گئے ہیں

اور پانچ سے چھ بجے تک ادھر پڑھانی ہوں۔“

”اچھا چلو، میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔“

راجیل بھی اٹھ کھڑا ہوا اور پھر وہ ممانی سے اجازت لے کر اور شکیل اور عقیل کو خدا

حافظ کہہ کر راجیل کے ساتھ باہر چلی آئی۔

”راجیل.....!“

بائیک پر اس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا۔

”اگر میں تھک گئی تو کیا ہو گا۔ راجیل حسام کیسے انجینئر بنے گا نا اور ندا.....“

”تم نہیں تھکو گی کوشی، میں جو تمہارے ہوں۔“

”مگر پتا نہیں کیوں کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں بالکل اکیلی رہ جاؤں گی۔ بالکل

تہا..... اور..... اور پھر تھک جاؤں گی اور میرا اعمد جو میں نے ابو سے کیا تھا..... راجیل میں

تھکنے لگوں تو تم حوصلہ دینا۔ ہمت ہار کر بیٹھ جاؤں تو ہاتھ پکڑ کر اٹھا لینا۔“

”کیا ہو گیا ہے آج تمہیں کوشی؟“

”راجیل نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا۔“

”تم ایسی کم ہمتی کی باتیں تو نہیں کرتی تھیں۔“

”ہاں جب تمہارے گھر آتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میں نے ڈھیر دلوں کو زپنی لیا ہو۔

بہت سی انرجی پیدا ہو گی ہو مجھ میں، لیکن جب میں اکیلی ہوتی ہوں تو پتا نہیں کیا چیز مجھے اندر

سے کمزور کرنے لگتی ہے۔ میرے لاشعور میں کوئی خوف سا چھپ کر بیٹھ گیا ہے اور مجھے خود

پتا نہیں یہ خوف کیسا ہے۔ شاید میری چھٹی حس ہے جو مجھ سے کہتی رہتی ہے کہ کچھ ہو گا۔

آپ ضرور کچھ کریں گی اور زندگی کو مشکل کر دیں گی اپنے لیے بھی اور ہم سب کے لیے بھی۔

اور میں آپا کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گی بس دیکھتی رہ جاؤں گی۔“

”تم زیادہ سوچنا نہ کرو کوشی! لوگ تم سے زیادہ مشکل زندگی گزارتے ہیں تمہارا اپنا گھر

ہے پھو جان ہیں اور پھر سب ٹھیک ہی چل رہا ہے ورنہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بالکل

اکیلے رہ جاتے ہیں پھر بھی حوصلہ نہیں ہارتے۔“

”مجھے اپنی فکر نہیں ہے راجیل! مجھے تو دوسروں کا غم کھائے جاتا ہے میں آپا کے لیے

سوچتی ہوں عمار بھائی کے لیے فکر مندر رہتی ہوں۔ حسام کا سوچتی ہوں۔ ندا اور شا کے

لیے.....“

”مت سوچا کرو کچھ اپنی کچھ سوچیں مجھے دے دور شک۔“

”کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، تم نہ ہوتے تو میں تو بہت جلد تھک جاتی۔“

”میں کیا کرتا ہوں۔ میں نے کون سا تمہارا بوجھ بٹا ہے۔“

”نہیں تم سب میرے لیے بہت بڑا سہارا ہو، آسرا ہو۔“

”اچھا اب اچھی اچھی باتیں کرو پیاری پیاری سی۔“

”لیکن یہ تم جا کہاں رہے ہو؟“

”پولا پارلر جائیں گے اور وہاں تمہیں تمہاری پسندیدہ آئس کریم کھلاؤں گا۔ چاکلیٹ

فلور؟“

”اور تم کھانا ہی اپنی، سویت ڈریمز.....!“

”اوہ نو۔“ وہ ہنس دیا۔

”بچھلی بار کا تجربہ یاد ہے میں بھی چاکلیٹ کھاؤں گا۔“

”مگر راجیل.....!“ وہ پریشان ہو گئی۔

”مجھے تو ٹیوشن پڑھانے جانا تھا۔“

”رہ جاتی ہونا۔ آج نہیں جاؤ گی تو کیا قیامت آجائے گی۔“

”مگر وہ مزبٹ۔“

”یار انہیں فون کر دو کسی پی سی او سے کہ مجبوری آن پڑی ہے۔“

”کیا مجبوری؟“

”یہی آئس کریم کھانے کی۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔

”اچھا۔“ وہ ہنس دی۔

”یہ تو بہت سخت مجبوری ہے۔“

اور پھر راجیل کے ساتھ وہ گھر آئی تو بہت خوش تھی۔ اور بہت حد تک اس کے ذہن کا بوجھ اتر گیا تھا۔

ٹا، ند اور حسام اسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئے۔

”کالج سے آکر نہ دیکھیں تو یوں لگتا ہے جیسے صدیاں ہو گئیں ہوں آپ سے ملے ہوئے۔“

ٹا نے اس کے ہاتھوں پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

”کھن کم لگایا کرو شنٹی۔“

اس نے پیار سے اس کے سرخ سرخ گالوں کو تھپکا۔

”ہاں ویسے بھی کھن مزگا ہے“ ندانے لقمہ دیا۔

”اور حسام صاحب آپ کا کیا حال ہے؟“

اس نے حسام کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

”مجھے یہ ٹیسٹ دکھانا تھا آپ کو۔“

اس نے جب سے ٹیسٹ نکالا۔

”میں میں سے میں نمبر لیے ہیں“

”ویری گڈ، میرا بھائی بہت لائق ہے۔“

”نقل کی ہوگی۔“

”آپی دیکھیں ند اکو۔“ حسام نے شکایت کی۔

”جھوٹ بولتی ہے، میں نقل نہیں کرتا۔“

”بالکل، یہ خود نقل کرتی ہوگی تا اس لیے۔“

ٹا نے اس کی سائڈ لی تو حسام خوش ہو گیا اور ٹی وی لاونج کی طرف بھاگ گیا۔

”آپا بھگڑا کر کے آئی ہیں کیا؟“

ٹا نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“

اس نے ٹا کی طرف دیکھا۔

”عمار بھائی آئے تھے ابھی تھوڑی دیر پہلے، مگر آپا نہیں گئیں ان کے ساتھ وہ بہت غصے

میں گئے ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ پریشان ہو گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے کتنے خوشگوار موڈ کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تھی۔

”آپا کہاں ہیں؟“

”آپ کے کمرے میں ہی ہیں۔ رسالہ پڑھ رہی ہیں۔“

”اور اماں؟“

”اماں کچن میں ہیں رات کے لیے مٹر چاول بنانے لگی ہیں۔“

”اچھا۔“ اس نے ایک گھر اسانس لیا۔

”یہ میرا بیک رکھ آؤ میرے کمرے میں، میں ذرا اماں کا ہاتھ بٹا دوں۔“

”اماں بیٹھیں آپ میں چاول پکالوں گی۔“

اس نے کندھے سے پکڑ کر انہیں کاؤنٹر کے پاس سے ہٹایا تو اس نے دیکھا ان کی

آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جیسے روتی رہی ہوں۔

”اماں آپ فکر نہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا میں آپا کو سمجھا دوں گی۔ ابھی غصہ ہے،

ایک دو روز میں اترائے گا“ ”تو نہیں جانتی رشک اسے یہ غصہ اترنے والا نہیں۔ عمار آیا تھا۔

یہ ذرا سامنے ہو گیا تھا اس کا۔ ایک دم سے ہی بے عزتی کر دی اس کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ

نیلیم کا سیٹ لے لو تو پھر آ جانا لینے ورنہ قدم نہ دھرنا۔“

”ہوں۔“ اس نے ان کی بات پر تہمرہ کیے بغیر چاول ان کے ہاتھ سے لیے اور بھگونے

لگی۔

”آپا!“

رات کو جب فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی تو اس نے بہت نرمی سے سمجھایا۔  
 ”آپا! عمار بھائی بہت اچھے ہیں اور وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ تمہیں بھی چاہیے کہ ان سے محبت کرو۔ ان کے پرالمر کو سمجھو۔“  
 ”کیا وہ تمہیں ملا تھا؟“

ہمک نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔

”نہیں، اماں نے بتایا ہے کہ وہ آئے تھے اور تم.....“

”ہاں، میں نہیں گئی اور تم اس کی وکالت مت کرو۔“

”ان کے پاس گنجائش ہوتی تو نلیم کا سیٹ تم سے زیادہ قیمتی نہیں تھا ان کے لیے۔“  
 ”جتنے نہیں پتا، اس کے پاس بہت گنجائش ہے۔ گھٹتا ہے وہ۔ ابھی پچھلے دنوں اس کے

بھائی کا خط آیا تھا نا کراچی سے.....“

رئشک نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”ارے وہی بھائی جسے تایا نے گود لے لیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ تایا بہت بیمار ہیں۔ کینسر

ہو گیا ہے شاید، تو پورے دس ہزار روپے بھجوائے اسے اور میرے لیے نہیں ہیں۔“

”بیماری پر تایا کی مدد کرنا تو احسن کام ہے تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہارا خاوند اتنا

ہمدرد ہے، اتنے بڑے دل والا ہے ورنہ آج کل تو کوئی کسی سے ہمدردی نہیں کرتا۔“

”ہوں، ایسی ہمدردی کس کام کی، گھر کو تکلیف دے کر دوسروں کو سکھ پہنچانا اور

دوسرے بھی وہ جو پچھلے چار سالوں سے ناراض تھے“

”تمہیں کیا تکلیف ہے آپا؟“

رئشک نے شاکي نظروں سے اسے دیکھا۔

”سب تم سے محبت کرتے ہیں اچھا کھاتی ہو اچھا پہنتی ہو،“

”محبت کو میں چاؤں گی کیا؟ پتا نہیں کیا کیا سوچا تھا۔ شادی کے بعد یہ کروں گی وہ

کروں گی۔ ساری حسرتیں دل میں رہ گئیں۔“

”آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا آپا! ہمیشہ یوں نہیں رہے گا۔ صالحہ، کلثوم کی

شادیاں ہو جائیں گی اور وہ ترقی کرے گا۔ اس کا مستقبل بہت روشن ہے آپا! پھر سب کچھ تمہارا

ہی ہو گا۔“

”روشن مستقبل کی اس میں حال کی پروا نہ کروں۔ واہ اچھا سبق دے رہی ہو۔ نہ بابا آج

اگر میں نے عمار کے ساتھ یہ رویہ نہ رکھا تو وہ کل سب کچھ ماں، بہنوں کو ہی دے دے گا۔“

”ماں بہنوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا۔“

”صاف صاف کہو رشک کیا کہنا چاہتی ہو۔ یہ لیکچر مت دو مجھے۔“

ہمک نے بیزار ی سے کہا۔

”آپا گھر اتنی آسانی سے نہیں بنا کرتے، انہیں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر.....“

”تم چاہتی ہو نا کہ میں واپس چلی جاؤں۔“

ہمک نے اس کی بات کاٹ دی۔

”مگر کوشی بیگم! میں تمہارے اوپر بوجھ تو نہیں ہوں۔ تم کیا کر رہی ہو۔ ابھی تو خود پڑھ

رہی ہو اور ابھی تو یہ گھر ابا کے پیسوں سے ہی چل رہا ہے۔ ہاں جب خود کماؤ گی تو پھر تمہارے

گھر نہیں آؤں گی۔“

آپا! رشک نے تڑپ کر اسے دیکھا اور ہونٹ کاٹنے لگی۔

کاش میں اس گھر کے لیے کچھ کر سکتی اور تمہارے لیے بھی۔

میرا یہ مطلب نہیں تھا آپا، میں تو.....“

”مجھے پتا ہے تم کیا چاہتی ہو لیکن مجھے عمار کے ساتھ ہرگز نہیں جانا۔“

اس نے قطعی انداز میں کہا اور چادر لپیٹ کر منہ موڑ لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سکون اور اطمینان تھا۔

اور آپ کیسے مطمئن ہیں عمار بھائی کو خفا کر کے، انہیں دکھ پہنچا کر بھی اور وہ کتنی بے

چین اور مضطرب ہے۔

رات بھر اسے ٹھیک طرح سے نیند نہ آسکی۔

صبح نماز پڑھ کر وہ چائے بنانے کے لیے کچن میں آئی تو آصفہ بیگم وہاں پہلے سے موجود

تھیں۔

”تم سوئیں نہیں رات؟“

انہوں نے اس کی سرخ اور سوجی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔

”نیند نہیں آئی۔“ اس نے چائے کے لیے پانی چوڑھے پر رکھا۔

”آپ چائے پیئیں گی؟“

”میں چائے بنانے ہی آئی تھی۔“

”آپ بھی نہیں سوئیں۔“

”مجھے بھی نیند نہیں آئی، بس مہک ہی کا سوچتی رہی کہ کیا بنے گا اس کا۔“

”اماں آپ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کیسے فکر نہ کروں۔ یہ لڑکی پتا نہیں کیا کرے گی۔ کیا بنے گا اس کا۔“

”اماں! رشک نے کچھ سوچتے ہوئے آصفہ نیگم کی طرف دیکھا۔

”اگر ہم..... میرا مطلب ہے اماں، اگر آپ آپا کو سیٹ لے دیں۔“

”میں کہاں سے لے دوں، میرے پاس تو وہی دس ہزار کے سیونگ سرٹیفکیٹ ہیں

حسام کے، تیرے ابا کو ملنے والا سارا پیسہ تو اس کی شادی میں خرچ ہو گیا۔ تیس پینتیس ہزار

بچا تھا۔ وہ میں نے دلدار بھائی کو دے دیا۔ انہوں نے کاروبار میں لگا لیا ہے۔ اور ہزار روپے

خرچ دیتے ہیں ہر مہینے۔ یہ بھی ان کی بڑائی ہے ورنہ..... یا پھر تیرے ابا کی پینشن اور تیرے

ٹیوشن کے پیسے۔ مشکل ہی سے کھینچ سکتا کر مہینہ پورا ہوتا ہے۔“

”ہوں۔“

رشک نے گہری سانس لیتے ہوئے چائے کی پیالی ان کے سامنے رکھی۔

”اور تو اس طرح کی عادت نہ ڈال اسے۔ پچھلے مہینے تو نے اسے آرگنر اکا سوٹ لے دیا۔

بچوں کے کپڑے لینے تھے نہ لے سکے۔ اس طرح تو وہ ہر مہینے کوئی نہ کوئی فرمائش لے کر

آجائے گی۔ بس تو اسے سمجھا کہ عمار کے ساتھ چلی جائے۔“

”سمجھایا تھا اماں مگر.....“

اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

کئی دن گزر گئے۔ مہک اپنی بات پرازی رہی۔ سب نے اسے سمجھایا تھا لیکن اس کی ایک

ہی ضد تھی کہ یہ اس کا اور عمار کا معاملہ ہے۔ دوسرے لوگ دخل اندازی نہ کریں۔ اس روز

وہ یونیورسٹی سے نکلی تو راجیل بائیک لیے اس کا منتظر تھا۔

”تم یہاں، خیریت؟“

”ہاں سوچا آج تمہیں پک کر لوں۔“

”آفس نہیں گئے تھے؟“

”گیا تھا مگر جلدی اٹھ آیا۔ چلو گھر چلیں، اکٹھے کھانا کھائیں گے اور باتیں کریں گے اور

پھر شام کو میں تمہیں تمہارے ٹیوشن سینٹر پر چھوڑ دوں گا۔“

”مگر اماں کو فکر ہو گی۔“

”میں نے انہیں بتا دیا تھا۔“

”اچھا تو پھر چلو۔“

”تم پریشان ہو؟“

”نہیں تو۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”میرے ساتھ بھی جھوٹ۔“

”نہیں بھلا میں تم سے کیوں جھوٹ بولوں گی۔ کوئی نئی بات نہیں ہے مہک کے لیے

پریشان ہونا۔“

”ہاں کچھ۔“

پتا ہے، کل عمار آیا تھا ابو کے پاس۔

اس نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے بتایا۔

”بہت پریشان لگ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا اگر اس کے پاس رقم ہوتی تو وہ مہک کی ضد پوری

کردیتا لیکن اس کے تایا کو بلڈ کیسرس ہو گیا ہے۔ بہت مہنگا علاج ہے اور عمار نے بھی اپنی جمع شدہ

ساری رقم ان کے حوالے کر دی ہے۔ کہہ رہا تھا تایا نے برے وقت میں ان کا بہت ساتھ دیا

تھا۔ اس کے بھائی کو گود لے لیا تھا۔ اور اسے اپنے بچوں کی طرح پالا۔ اپنا کوئی بیٹا نہیں ان کا۔“

وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

”تم مہک کو سمجھاتی کیوں نہیں ہو کہ بیکار کی ضد نہ کرے“

گھر کے پاس پہنچ کر راجیل نے کہا۔



”سمجھایا تھا مگر.....“ وہ اسی سے بولی۔

”ابو شاید آج جاکیں ادھر۔“

راجیل نے کال بیل بجائی۔

”وہ ماموں کی بات نہیں مانیں گی۔“

ریشک منک کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی۔

ہمیشہ کی طرح ممانی، شکیل، عقیل سب ہی اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔

اور یہاں اس گھر میں اس کے لیے کتنی محبت اور سکون ہے۔

ممانی بچن میں تھیں، وہ بھی ان کے پاس بچن ہی میں چلی گئی۔ اور جب راجیل اسے

واپس چھوڑنے جا رہا تھا تو اس نے آہستگی سے راجیل سے پوچھا۔

”تمہارے پاس کچھ پیسے ہوں گے؟“

”کتنے؟“

”سات ہزار۔“

”کیا کرنے ہیں۔“

”تمہیں اس سے کیا۔ اگر ہیں اور ادھار دے سکتے ہو تو بتا دو۔ نہیں تو یہ مت پوچھو۔“

”مجھے پتا ہے، میں جانتا ہوں کہ تمہیں کس چیز کے لیے ضرورت ہے مگر کوشی یہ صحیح

نہیں ہے۔ اسے معلوم ہونے دو کہ غلط ہے۔“

وہ کچھ نہ بولی۔

”کوشی! راجیل نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”میں سمجھتی تھی کہ تم میرے اچھے دوست ہو اور تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ جب

ضرورت پڑے تو بلا لینا مگر..... سوری میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔“

تم اب غلط سمجھ رہی ہو کوشی میں.....“

”پلیز جب تم رقم نہیں دے سکتے تو بحث مت کرو۔“

سارا راستہ دونوں خاموش رہے۔ ٹوشن سینٹر کے پاس راجیل نے اسے اتار دیا۔

”ریشک تمہاری سوچ غلط ہے اس طرح کب تک تم اس کی غلطیوں کو نبھاتی رہو گی۔“

”یہ میرا پر اہم ہے کی مجھے کیا کرنا ہے تم سے تو میں نے ادھار مانگا تھا۔ لو نا دیتی۔“

”یہ بات نہیں ہے کہ میں.....“

مکروہ اس کی بات سننے بغیر گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

شام کو جب وہ گھر واپس آئی تو بے حد تھکی ہوئی اور افسردہ تھی۔

منک برآمدے میں تخت پر لیٹی اونچی آواز میں گانے سن رہی تھی سب کو بے سکون اور

پریشان کر کے وہ خود کتنی مطمئن اور خوش تھی جیسے کچھ نہ ہوا ہو۔ اور کچھ لوگ ہمیشہ کتنے

مطمئن اور پرسکون رہتے ہیں منک آپا کی طرح۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس سے گزر کر اپنے کمرے میں آگئی

اور یونہی جو توں سمیت بیڈ پر گر گئی۔ اور راجیل سے اسے اتنی امیدیں تھیں۔

وہ اسے اپنا دوست سمجھتی تھی۔

اور پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ زندگی میں جب کوئی مشکل لمحہ آیا تو راجیل کے

سہارے وہ اس مشکل سے گزر جائے گی۔

عجیب سا یقین عجیب سا بھروسہ تھا اسے راجیل پر۔ مگر راجیل تو اتنی چھوٹی سی آزمائش

پر پورا نہیں اتر سکا تھا۔ کیا تھا..... کیا تھا اگر وہ بنا پوچھے۔ بغیر کوئی بات کیے خاموشی سے اسے

سات ہزار روپے دے دیتا۔ اس کا مان بڑھ جاتا۔ دوست تو وہ ہوتا ہے ناجو بغیر ملامت کیے

بغیر نصیحت کا ایک لفظ کہے ہاتھ تھام لیتا ہے۔

اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

دل چاہا بہت سارا رو لے۔

یہ دنیا ایسی ہی جگہ ہے یہاں کوئی کسی کا اپنا نہیں۔ سب اپنے لیے جیتے ہیں اپنے لیے

مرتے ہیں اور ہم یونہی دوسروں پر بھروسہ کر لیتے ہیں اور سوچتے ہیں جب ہم گرنے

لگیں گے تو کوئی ہاتھ ہمیں تھام لے گا۔

اور راجیل۔

پتا نہیں کب، پتا نہیں کیسے وہ کتنی آہستگی سے اس کے دل میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ اپنا

لگنے لگا تھا۔ ذرا سی کوئی پریشانی ہوتی تو وہ اس کی طرف بھاگ چلی جاتی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے بے اختیار اندے آنے والے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی۔

بھروسہ ٹوٹ جائے تو کیا ہوتا ہے۔

شیشے ٹوٹے ہیں تو کرچیاں کس طرح ہاتھوں میں چبھتی ہیں۔ اس اذیت کو وہ محسوس کر رہی تھی اور برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”آئی!“ ثنائے آہستگی سے اندر آکر اسے پکارا۔

”آپ سو رہی ہیں؟“

”نہیں تو“ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”کیا بات ہے چند!“ وہ اٹھ بیٹھی۔

”آئی! وہ راجیل بھائی آئے تھے اور یہ دے گئے تھے۔“

”کیا ہے؟“ اس نے بے دھیانی سے لفافہ ٹٹاکے ہاتھوں سے لے لیا۔

”پتا نہیں۔“ ثنائے کہا۔

”راجیل بھائی نے کہا تھا آپ کو دے دوں۔“

اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اچھا!“

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“

”ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”بالکل ٹھیک ہوں۔ یونہی ذرا تھک گئی تھی ایک کپ چائے تو پلا دو۔“

”اچھا۔“ وہ باہر چلی گئی تو اس نے لفافہ کھولا۔ سات ہزار روپے تھے اور ایک ننھے سے

کانڈر پر لکھا تھا۔

”دوستوں سے بدگمان نہیں ہوتے کوشی اور تمہارے لیے تو ایک نقد جاں ہے، سو وہ

بھی حاضر ہے۔“

وہ بے اختیار مسکرا دی۔

”تم کتنے اچھے ہو راجیل اور میں کتنی خوش ہوں کہ تم نے میرا مان نہیں توڑا۔ میرا

بھروسہ قائم رہا۔“ لفافہ بیگ میں رکھ کر وہ اٹھ کر باہر چلی آئی۔

صبح وہ یونیورسٹی نہیں گئی بلکہ صرافہ بازار سے نیکم کا چھوٹا سائٹ خرید کر عمار کے

آفس چلی گئی۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”تم..... رشک..... تم یہاں۔“

”ہاں عمار بھائی! مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔“

”یہاں آفس میں۔“

”اگر تھوڑا سا وقت ہو تو پلیز۔“

”اچھا!“ وہ حیران حیران سالے اپنے ساتھ لیے ہوئے ایک طرف بیٹھ گیا۔

”میں جانتی ہوں عمار بھائی کہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ مگر میں مہک آپا کی وجہ سے

بہت پریشان ہوں۔“

”مگر میں کیا کر سکتا ہوں رشک۔“ عمار نے افسردگی سے کہا۔

”تمہاری آپا کسی طرح بھی میرے مسائل کو سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ میں تو

چند ہی ماہ میں تنگ آ گیا ہوں رشک۔ سوچتا ہوں زندگی کا اتنا طویل سفر کیسے اس کی ہمراہی میں

طے کروں گا۔ میں تو ہانپنے لگا ہوں۔“

رشک نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ملال کے گہرے رنگ تھے اور

چہرے پر تھکن۔ رشک کا دل ایک دم ہی اس کے لیے دکھی ہو گیا۔

”اب یہ کوئی بات تھی۔“

ایک نظر رشک کے چہرے پر ڈال کر عمار نے بات جاری رکھی۔

”خواہ خواہ کی ضد۔ اب آپ ہی بتائیں رشک! میں کہاں سے کیسے اس کی یہ خواہش

پوری کروں؟“

”میں جانتی ہوں عمار بھائی آپ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ مگر آپا کو سمجھانا بہت مشکل

ہے۔ وہ بچپن سے ہی ایسی ہیں۔ تھوڑی سی ضدی۔ دراصل وہ ابو اور امی کی شادی کے چھ سال

بعد پیدا ہوئی تھیں۔ اس لیے اماں اور ابا نے ان کے..... بہت لاڈ اٹھائے۔ ان کی ہر خواہش

پوری کی ہے۔“

”مگر اب اسے ایڈجسٹ کرنا چاہیے۔ آج اگر میں کسی سے ادھار لے کر اس کی یہ ضد

پوری بھی کر دوں تو آئندہ کیسے پوری کروں گا۔“

”وہ آہستہ آہستہ سمجھ جائیں گی۔ عمار بھائی آپ کی محبت اور توجہ انہیں بدل دے گی۔“

اس نے نرمی سے کہا۔

”میں تو اب بھی اسے ساتھ لانے کے لیے تیار ہوں۔ تم کہتی ہو تو ابھی چلتا ہوں، مگر وہ نہیں آئے گی، مجھے علم ہے۔ میں نے اسے بارہا محبت سے، پیار سے سمجھایا ہے کہ ممک! وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہے گا۔ یہ مشکل وقت بھی گزر جائے گا۔ پھر میں تمہاری ہر خواہش پوری کر دوں گا۔ جو تم چاہو گی وہی ہو گا۔ مگر وہ کوئی بات سنتی ہی نہیں اور دلائل سے تو بچے بھی قائل ہو جاتے ہیں مگر وہ قائل نہیں ہوتی، سنتی ہی نہیں۔“

”عمار بھائی! یہ نیلم کا سیٹ ہے۔“

اس نے بیک سے ڈبہ نکال کر میز پر رکھا۔ ”یہ آپ آپا کو دے دیں اور انہیں منا کر گھر

لے آئیں۔“

”نہیں.....“

عمار کلرنگ سرخ ہو گیا۔

”میں ایسا نہیں کر سکتا اور نہ مجھے ایسی کوئی بات پسند ہے“

”پلیز عمار بھائی!“

ریشک کی پلکیں لرز نے لگیں اور آواز بھر آگئی۔

”آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں آپ سے اور آپا سے محبت کرتی ہوں۔ میں انہیں آباد اور

خوش دیکھنا چاہتی ہوں آپ میرے خلوص کو سمجھیں۔ میرا مقصد آپ کی توہین کرنا نہیں ہے

۔ پلیز عمار بھائی!“ آنسو اس کی پکوں تک آگئے۔ عمار بہت دھیان سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ریشک! میں تمہارے جذبے کو سمجھ رہا ہوں لیکن تم خود سوچو۔“

”عمار بھائی پلیز چھوٹی بہن سمجھ کر ہی میری بات مان لیں۔“

”دیکھو ریشک۔“ عمار نے اسے سمجھایا۔

”تمہارے حالات سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ اگرچہ میں یہ نہیں جانتا کہ یہ سیٹ

خریدنے کے لیے تم نے پیسے کہاں سے لیے ہوں گے لیکن اتنا مجھے پتا ہے کہ یہ سیٹ آسانی

سے نہیں خریدا گیا ہو گا۔ پتا نہیں کیسے.....“

”مگر وہ تو میرا مسئلہ ہے نا عمار بھائی۔“

ریشک نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ہاں، وہ تمہارا مسئلہ ہے مگر ابھی تم نے خود کو میری بہن کہا ہے اور بہنوں کے

مسائل سے بھائی بے خبر نہیں ہوتے۔ میں جانتا ہوں یہ ممک سے تمہاری محبت کی انتہا ہے۔

مگر ممک! آج اس کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔ کل اس نے ڈائمنڈ کا سیٹ مانگ لیا تو وہ کہاں سے

لا کر دوں گا۔ دیکھو ریشک! یہ سیٹ واپس کر دو اور ممک کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ آج، کل

کسی دن اسے خود ہی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔“

”اور اسے اپنی غلطی کا احساس کبھی نہیں ہو تا عمار بھائی۔“

ریشک نے دل گرفتگی سے سوچا۔

”اور نہ اب ہو گا۔“

”کہاں سے لیا تھا یہ سیٹ۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ واپس کر دیتے ہیں اور

.....“

”نہیں عمار بھائی! اس بار میری بات مان لیں۔ پھر ایسا ہوا تو.....“

عمار لمحہ بھر یونہی اسے دیکھتا رہا۔

”تم کیا چیز ہو ریشک! اپنی بہن سے بالکل مختلف، نرم دل اور حساس، وہ تمہاری جیسی

کیوں نہیں ہے۔“

”تو عمار بھائی!“

اس نے پر یقین نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ شام کو آئیں گے نا آپا کو لینے؟“

”ہاں!“

عمار نے سیٹ اٹھا لیا اور بے بسی سے اسے دیکھا۔

”میرا دل آبادہ نہیں ہو رہا ریشک! لیکن تمہارے لیے تمہاری خاطر، مگر یہ ادھار ہو گا۔

زندگی میں جب سہولت ہوئی تمہارا ادھار اتار دوں گا۔“

”تھینک یو۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تھینک یو عمار بھائی آپ بہت اچھے ہیں۔“

”جو لوگ خود اچھے ہوتے ہیں، انہیں سب ہی اچھے لگتے ہیں۔“

عمار اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو میں تمہیں اسٹاپ تک چھوڑ آؤں۔“

اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے رشک نے بڑا سکون اور طمانیت محسوس کی اور اسے یوں لگا جیسے ابا کی روح اس کے آس پاس ہی کہیں موجود ہو اور مسکرا رہی ہو۔

”میں پوری کوشش کروں گی ابو کہ آپا کی ہر خواہش پوری ہو اور ثناء، نندا اور حسام کو کوئی تکلیف نہ ہو، کوئی رنج نہ ہو۔“

اس نے دل ہی دل میں اپنا عہد دہرایا اور عمار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آفس سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆☆☆

کامو کے ناول ”اجنبی“ کی کہانی کی ابتدا اس جملے سے ہوتی ہے۔ ”میری ماں شاید آج مر گئی ہے“ اور ”اجنبی“ کا ہیرو بہ ظاہر بے حس لیکن حقیقت پرند ہے۔ زندگی کا بڑے سے بڑا دکھ بھی اسے پریشان نہیں کرتا۔ وہ ہر حال میں مطمئن رہتا ہے۔ حتیٰ کہ قتل کی سزا پانے کے بعد بھی۔

مدثر حسن نے کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر جیسے اپنے آپ سے کہا اور پھر دونوں بازو اپنے گھٹنوں کے گرد لپیٹتے ہوئے باری باری کا شف، وحید اور ذیشان کی طرف دیکھا۔

”لیکن یہ حقیقت پسندی تو نہیں یہ تو فکاکی ہے۔“

کاشف نے تبصرہ کیا۔

”کیا اجنبی کا ہیرو اپنی ماں کی موت پر بھی دکھی نہیں ہوتا؟“

”نہیں۔“

”یار! یہ بات ذہن تسلیم نہیں کرتا۔ یہ لکھنے والے اتنا جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔ دنیا میں

بھلا کوئی اتنا بے حس بھی ہوگا۔“ ذیشان نے پوچھا۔

”نہیں لکھنے والے جھوٹ نہیں بولتے۔ دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔“

مدثر نے ذیشان کی طرف دیکھا اور زمین پر پڑی اپنی فائل اٹھائی۔ وحید جو اس ساری گفتگو کے دوران خاموش بیٹھا مدثر کی طرف دیکھ رہا تھا اس نے مدثر کے ہاتھ سے فائل تمام لی۔

”یار! اب سیدھے سیدھے بتا دو، بات کیا ہے۔ کون تمہیں ”اجنبی“ کا ہیرو لگ رہا ہے۔“

”کوئی نہیں۔“ مدثر کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو اٹھو سب۔ عارف صاحب کی کلاس شروع ہونے والی ہے۔“

”مدثر!“ وحید نے اسے گھورا۔

”کیا میں تمہیں نہیں جانتا، تمہاری عادت کو؟“

”کچھ نہیں یار، یونہی ”اجنبی“ پڑھی تو خیال آگیا۔“

اور تب ہی وحید کی نظر لاہیریری سے باہر آتے ہوئے کامل پر پڑی اور اسے یوں لگا جیسے ابھی ابھی کامل اس کے پاس آئے گا اور کہے گا۔

”یار! آج شاید میری ماں مر گئی ہے۔“

اور پھر سر جھکائے عارف صاحب کی کلاس لینے چل دے گا اور عارف صاحب کا لیکچر اتنے انہماک سے سنے گا کہ اس کے چہرے سے کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ ابھی ابھی وہ کیا خبر سنا کر گیا ہے۔

اور مدثر کی بات کا ہمیشہ کوئی نہ کوئی مطلب ضرور ہوتا ہے چاہے یہ ظاہر اس کی بات کتنی ہی بے موقع اور بے معنی کیوں نہ لگتی ہو۔

”اور یہ اپنا کامل رخصاٹ، کیا اجنبی کے ہیرو کی طرح نہیں لگتا؟“

وحید نے کھڑے ہوتے ہوئے مدثر کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

”شاید۔“

مدثر نے کندھے اچکائے اور فائل لے کر آگے آگے چل پڑا۔ وہ تینوں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ راستے میں فزکس لیب کے پاس اس نے کامل کو پروفیسر امتیاز کے ساتھ باتیں

”مجھے پتا ہے۔“  
 مدر نے آہستگی سے کہا۔  
 ”تم جانتے ہو، لیکن تم نے کبھی ذکر تو نہیں کیا۔ انہیں کیا ہے؟“  
 ”بلڈ کیمر!“

”اوہ!“ وحید کو بے حد دکھ ہوا۔ کامل کو ابھی ان کے ڈپارٹمنٹ میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ وہ کراچی سے مانیٹریشن کروا کے آیا تھا مگر وہ ان کے کافی قریب ہو گیا تھا اس میں کوئی بات تھی جو انٹریکٹ کرتی تھی..... اظہارِ سنجیدہ اور کم گو سا تھا۔ مدر کے ڈیڈی اس کے بابا کے دوست تھے۔ کراچی کے حالات کے پیشِ نظر مدر کے ڈیڈی کے ہی اصرار پر وہ لوگ لاہور منتقل ہوئے تھے۔ اور کچھ عرصہ مدر کے ہاں ہی مقیم رہے تھے۔ وحید کی پہلی ملاقات وہاں ہی ہوئی تھی اور پہلی ملاقات میں ہی اس نے کامل کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ محسوس کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی اس کی طرح کشمیری تھا سرخ و سپید رنگت، بڑی بڑی اواس اور خاموش آنکھیں۔

پھر آہستہ آہستہ وہ ان کے گروپ میں شامل ہو گیا۔ مدر، وحید، ذیشان اور کاشف چاروں گہرے دوست تھے۔ ذیشان اور کاشف دونوں کزن تھے ورا ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ مدر اور وحید بچپن سے اکٹھے تھے انہوں نے ایک ہی کالج اور ایک ہی اسکول میں پڑھا تھا۔ جبکہ ذیشان اور کاشف سے کالج میں دوستی ہوئی تھی۔ وہ دونوں انقلابی خیالات رکھتے تھے۔ دنیا کو اور معاشرتی نظام کو بدلنے کی باتیں کرتے تھے۔ سارے جہاں کا درد ان کے جگر میں تھا۔ ہر وقت ہر ایک کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ وہ حقیقتاً اس ملک اور قوم کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں کوئی راستہ سمجھائی نہیں دیتا تھا۔ اب کامل بھی ان کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا اور وہ سب غیر محسوس طریقے پر کامل کی باتوں کا اثر قبول کرنے لگے تھے۔

کامل فطرتاً کم گو تھا۔ کم بولتا تھا۔ مگر اس کی بات میں بڑا وزن ہوتا۔ مختصر مگر پراثر بات۔ پروفیسر ز بھی اسے پسند کرتے تھے۔

”کم آن یار! عارف صاحب کلاس میں آچکے ہیں۔“

کرتے دیکھا تو وہیں رک گیا۔

”کامی یار! وہ تمہاری امی تو ٹھیک ہیں نا؟“  
 ”ہاں!“ پروفیسر امتیاز کو خدا حافظ کہتے ہوئے کامل نے چونک کر اسے دیکھا۔  
 ”امی تو بالکل ٹھیک ہیں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“  
 ”وہ..... سوری! ابھی پتا نہیں، میں کیا پوچھنے والا تھا۔“

وحید پر گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔

”بابا کا پوچھنا ہو گا۔“

کامل نے نرمی سے کہا۔

”بابا ویسے ہی ہیں۔ بیمار اور کمزور۔“

”ہاں بابا کا ہی پوچھ رہا تھا۔“

وحید نے جلدی سے کہا۔ حالانکہ اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ کامل کے

بابا بیمار ہیں۔

”ہاں“ بابا کا مرض ٹھیک ہونے والا نہیں ہے۔“

کامل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"HE IS ON DEATH POINT."

کامل بات مکمل کر کے مڑا اور فرسکس لیب میں چلا گیا۔ مدر جو اسے کامل کے پاس رکے

دیکھ چکا تھا مڑا اور اسے تقریباً بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا ساتھ لے گیا۔

”تم بھی احقر اعظم ہو۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ کامل کی امی.....“  
 ”تم ہی تو کہہ رہے تھے۔“

وحید ذرا سانا دم ہوا۔

”میں کامو کے ناول کی بات کر رہا تھا۔“

”میں سمجھا تم.....“

”تم ہمیشہ غلط سمجھتے ہو۔“

”لیکن میں نے بابا بیمار ہیں "HE IS ON DEATH POINT"

مدثر نے اسے خاموش کھڑے دیکھ کر کہا تو وہ چونک کر دروازے کی طرف بڑھا۔  
عارف صاحب نے لیکچر شروع کر دیا تھا اس لیے قدرے ناگواری سے انہیں دیکھا۔

”سوری سر!“

ان کا موڈ دیکھ کر وحید نے فوراً معذرت کی اور جلدی سے پیچل سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔  
مگر عارف صاحب کے لیکچر کے دوران بھی اس کا دھیان کامل کی طرف ہی رہا جو آج  
کلاس میں بھی نہیں آیا تھا۔ کئی دنوں سے وہ خاصا مصروف نظر آتا تھا اور کم ہی لیکچر اینڈ  
کرتا تھا۔ عارف صاحب کی کلاس لے کر وہ باہر نکلے تو کامل انہیں باہر ہی مل گیا۔  
”کیا بات ہے یار! آج کل کلاسز نہیں اینڈ کر رہے؟“

کاشف نے پوچھا۔

”در اصل ان دنوں میں کچھ مصروف رہا تھا۔ میں نے دراصل ایک تنظیم جو اُن کر لی  
ہے۔“

”کیسی تنظیم؟“ ذیشان نے اشتیاق سے پوچھا۔

”پروفیسر امتیاز نے یہ تنظیم بنائی ہے۔“

”کوئی دس سداہر قسم کی تنظیم ہوگی۔“

کاشف نے رائے دی۔

”یار! یہ تنظیمیں یوں ہی ہوتی ہیں۔ حقیقت میں اندر سے کھوکھلی ہوتی ہیں۔ ان کے  
پاس کچھ نہیں ہوتا۔ خالی خولی باتوں اور نعروں کے سوا۔ دو چار جنوس نکلوائیں گی توڑ پھوڑ  
کریں گی ایک دو گر فاریاں ہوں گی اور ایک دو بے گناہ طالب علم مارے جائیں اور.....“

”نہیں! کامل نے سنجیدگی سے کہا۔

”پروفیسر امتیاز نے یہ تنظیم اس طرح کے مقاصد کے لیے نہیں بنائی۔“

”پھر؟“ کاشف نے بھنویں اچکائیں۔

”یار! یہ تنظیم کشمیریوں کے لیے ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ کشمیریوں پر زندگی کس  
قدر تنگ ہو گئی ہے۔“

”تو تم لوگ کیا کرو گے کیا جہاد کرنے جاؤ گے؟“

کاشف نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔  
”نہیں ایسا کوئی لائحہ عمل ترتیب نہیں دیا گیا مگر کچھ نہ کچھ تو کریں گے ہی اور کچھ  
نہیں تو مل بیٹھ کر دعا ہی کر لیں گے۔“

”تم کہاں جا رہے ہو مدثر۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ مدثر کی طرف مڑا۔

”اگر گھر جا رہے ہو تو راستے میں مجھے پروفیسر امتیاز کے گھر ڈراپ کر دینا۔“

”ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں“ کاشف نے کہا۔

”ضرور۔“ اور پھر وہ سب مدثر کی سوز کی میں بیٹھ کر پروفیسر امتیاز کے گھر پہنچ گئے۔

پروفیسر امتیاز نے بڑی خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔

”میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا کامل۔“

”جی سر! مجھے کچھ دیر ہو گئی۔“

”راجیل کب سے تمہارا منتظر ہے۔ دراصل وہ کشمیریوں کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کے

لیے ایک پروگرام ترتیب دے چکا ہے۔ اور اس کے لیے تمہاری رائے چاہتا ہے۔“

”ہاں کچھ تو کرنا چاہیے ہیں۔ کچھ تو کریں گے ہی یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے تو

کچھ نہیں ہو گا۔“

کامل نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ اور مڑ کر ان تینوں کی طرف دیکھا۔

”تم لوگ بیٹھو گے یا.....“

”کچھ دیر بیٹھیں گے اور پھر مجھے کچھ کام ہے۔“

مدثر نے جواب دیا۔

”ہاں، ہاں چلے جانا۔“

پروفیسر امتیاز خواجہ نے سب کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

”چائے بن رہی ہے پی کر جانا اور تم سب کو یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ یوں

جیسے اکیلے چلنے والے مسافر کو بہت سارے ساتھی مل گئے ہوں کم آن۔“

اور وہ پانچوں ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ وہاں کچھ اور لوگ

فروخت کر دیتا لیکن بابا نہیں مانتے۔ انہوں نے بڑے شوق سے بنوایا تھا۔ بہت خوبصورت اور آرٹسٹک ہے ہمارا گھر۔“

رائیل نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور پھر ہاسپٹل تک خاموشی ہی رہی اور جب وہ دونوں سر جھکائے ہاسپٹل میں داخل ہو رہے تھے تو کامل نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

”میں بابا کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں رائیل! حالانکہ میں جانتا ہوں اس سب کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ موت بڑی تیزی کے ساتھ اپنے خونچ پیٹھیلے بابا کی طرف بڑھ رہی ہے۔ آج کل یارپرسوں کسی بھی دن میں یہاں آؤں گا تو بابا نہیں ہوں گے۔ اس زہر کا کوئی تریاق نہیں ہے رائیل۔“ اس کی آواز میں سوز تھا۔ لیکن چہرہ بالکل سپاٹ اور بے تاثر تھا۔ آنکھیں جیسے دور کہیں دیکھ رہی تھیں۔ رائیل نے لمحہ بھر اسے دیکھا اور پھر ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔

”خدا کی رحمت بے پایاں ہے کامی! مایوسی کفر ہے۔“

”میں مایوس نہیں ہوں رائیل! بس منتظر ہوں کہ کب..... اور زندگی کے حقائق سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں۔ سامنے کی چیز سے آنکھیں کیسے بند کی جاسکتی ہیں۔“

اور لمبے سے کوریڈور میں چلتے ہوئے رائیل کی نگاہ اچانک رشک پر پڑی جو بیک کندھے پر لٹکائے ارد گرد سے بالکل بے خبر سوچوں میں کھوئی ہوئے ہولے سر جھکائے ادھر ہی آرہی تھی۔

”کوئی!“ رائیل نے بے اختیار آواز دی۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر رائیل کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے جگنو سے اتر آئے اور ہونٹوں پر مدہم سی مسکراہٹ آکر معدوم۔ کئی۔

”ارے تم رائیل یہاں کیسے؟“

”پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیوں نظر آرہی ہو۔“

”میں صالحمہ کی مزاج پرسی کے لیے آئی تھی۔ مہک آپا کی نند یہاں ایڈمٹ ہے۔ اسے ہلٹ کی تکلیف ہے۔ مگر آج ہی وہ ڈسچارج ہو گئی۔ میں یونیورسٹی سے آئی تھی، اب واپس جا رہی ہوں۔“

”مگر وہ تو بہت چھوٹی سی ہے۔ شاید فرسٹ ایر کی طالبہ ہے۔“

بھی تھے۔ پروفیسر امتیاز نے سب سے ان کا تعارف ہو نما طالب علم کی حیثیت سے کروایا کامل، رائیل نام کے شخص کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”یہ رائیل ہے۔“

اس نے تعارف کرایا۔

”میرا دوست اور پڑوسی۔ پچھلے سال ہی ایم۔بی۔اے کیا ہے۔ اور ایک چھوٹی سے فرم کا مینیجر ہے۔“

”اور یہ چاروں میرے ہم جماعت اور ساتھی۔“

اس نے چاروں سے باری باری ہاتھ ملایا اور پھر وہ اور کامل ایک کونے میں بیٹھ کر ہولے ہولے باتیں کرنے لگے اور وہ چاروں پروفیسر امتیاز کے گرد بیٹھے ان کی باتیں سننے لگے۔ وہ جیسے مگر پر سوز لہجے میں کشمیر میں ہونے والے مظالم کا ذکر کر رہے تھے۔ بہت دیر بعد جب وہ اٹھے تو کامل ابھی تک رائیل کے ساتھ مصروف تھا۔

”کامل، تم چلو گے ہمارے ساتھ؟ مدثر نے پوچھا۔

”نہیں‘ میں ذرا رائیل کے ساتھ جا رہا ہوں۔“

”اچھا، پھر کل ملاقات ہوگی انشاء اللہ۔“

مدثر وغیرہ کے جانے کے بعد وہ دونوں بھی پروفیسر امتیاز سے اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ڈائلر کیا کہتے ہیں کامی؟“

رائیل نے بایک اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ کیا کہہ سکتے ہیں۔“

رائیل نے اس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”باہر لے جانے کو نہیں کہتے؟“

”کہتے ہیں مگر اتنا پیسہ نہیں ہے میرے پاس۔ کراچی والا گھر بھی فروخت نہیں ہو رہا۔ بہت کم قیمت لگ رہی ہے۔ جتنا خرچ ہوا تھا اس سے آدھی رقم بھی نہیں ملتی۔ آج سے کئی سال پہلے بابا نے تقریباً آٹھ لاکھ روپیہ خرچ کیا تھا۔ لیکن اب۔ میں تو کم قیمت میں بھی

”ہاں، بچپن ہی سے اس کے دل میں سوراخ تھا۔ کبھی کبھی اسے تکلیف ہو جاتی ہے۔“  
رشک نے تفصیل سے بتایا۔ ابھی تک اس کا دھیان کامل کی طرف نہیں گیا تھا۔ جو  
بڑی توجہ سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

رائیل کو اچانک خیال آیا۔

”یہ کامل ہے میرا دوست اور کامی یہ میری کزن ہے رشک ماہ۔“

”رشک ماہ کامل نے زیر لب دہرایا۔ اس کا آنکھوں میں بجلیاں سی کوئڈر ہی تھیں  
رشک نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور چونک پڑی۔

یہ تو وہی تھا وہی بس والا اجنبی جو جانا پہچانا لگتا تھا۔ جسے دیکھ کر اپنائیت کا سا احساس ہو

”یہ۔“ رشک نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

”تم جانتی ہو اسے۔ یہ تمہاری یونیورسٹی میں ہی پڑھتا ہے چند ماہ ہی ہوئے ہیں ا  
کراچی سے آئے فزکس ڈپارٹمنٹ میں ہے۔“

”شاید کہیں دیکھا ہو۔ وہاں یونیورسٹی میں۔“

رشک نے کہا۔

”مگر یاد نہیں۔“

”مگر میں نے تو تمہیں بہت بار دیکھا ہے پیاری لڑکی۔“

کامل نے دل ہی دل میں سوچا اور مسکرایا۔

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی رشک ماہ۔ آپ کو میں نے کئی بار دیکھا ہے۔“

”شکریہ! رشک نے کہا۔

”دیکھا ہو گا تم نے۔“ رائیل نے خوش دلی سے کہا۔

”مگر یہ جو کوشی ہے نا۔ اسے ارد گرد کی کوئی خبر نہیں ہوتی بقول کلیل کے، یہ ہر وقت  
دوسری دنیا میں رہتی ہے۔ ابھی دیکھا نہیں تھا تم نے۔ اگر میں اسے آواز نہ دیتا تو یہ پاس سے  
ہمیں دیکھے بنا گزر جاتی۔“

”بعض لوگوں کے اندر کی دنیا اتنی خوب صورت ہوتی ہے کہ وہ اس سے باہر نکلتا نہیں

ہی نہیں کرتے۔“

کامل نے رشک کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”نہیں، میرے اندر کی دنیا تو خوبصورت نہیں ہے۔ وہ تو.....“

رشک کے لبوں سے بے اختیار نکلا، مگر پھر جیسے اسے احساس ہو گیا کہ وہ ایک اجنبی  
کے سامنے کھڑی ہے۔ سو اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور رائیل کی طرف دیکھا۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو تم نے بتایا نہیں۔“

”میں کامل کے ساتھ آیا ہوں اس کے بابا یہاں ایڈمٹ ہیں۔ تم کہاں جاؤ گی اب۔“

”گھر ہی جاؤں گی۔“

”تو پھر اٹھنے چلتے ہیں۔ آؤ تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔“

رائیل نے اصرار کیا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔ یوں بھی کتنے سارے دن ہو گئے  
تھے رائیل سے ملے ہوئے۔ اس سے باتیں کیے ہوئے اور وہ اتنے سارے دن رائیل سے  
نہیں ملتی تھی تو اسی خود بخود اس کے اندر اتر آتی تھی۔ آج صبح بھی وہ سوچ رہی تھی کہ اگر  
جلدی فارغ ہو گئی تو رائیل سے ملنے جائے گی۔

”بابا! یہ رائیل کی کزن ہے۔“

کامل تعارف کروا رہا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ کامل کے ماما بچے سے ٹیک لگائے  
بیٹھے تھے اور وہ رائیل کے ساتھ ان کے بیڈ کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے جلدی سے سلام  
کیا۔

”جیتتی رہو بیٹا، بیٹھو۔“

وہ ایک طرف پڑے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کامل ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر کچھ دیر  
تک رائیل بابا کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ کبھی کبھی بابا اس سے بھی کوئی بات پوچھ لیتے تھے۔ وہ  
اسے بالکل اپنے ابا کی طرح لگے۔ مہربان اور شفیق سے اور جب وہ جانے کے لیے اٹھے تو  
انہوں نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائی۔ کامل ان کے پاس ہی بیٹھا تھا۔  
عاموشی سے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر رشک کی طرف بھی  
دیکھ لیتا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں بڑی مقناطیسی تھی۔ رشک کی نگاہیں جھک جاتی تھیں۔



”کامل کے بابا کو بلڈ کیسٹر ہے۔“

چلتے چلتے راجیل نے بتایا تو اس کا دل بے حد دکھا۔ تبھی وہ اتنا سنجیدہ اور خاموش لگتا ہے اور اس کی آنکھوں کی سیاہیوں میں اداسیاں سی گھلی دکھائی دیتی ہیں۔

”ہاں، اب بتاؤ کیسی ہو۔“

راجیل نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”جیسی نظر آرہی ہوں ویسی ہی ہوں۔“

”اندر کا موسم کیسا ہے؟“

”گزارا ہو رہا ہے۔“

”مہک ٹھیک ہے نا۔“

”ہوں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ مہک کوئی نہ کوئی بہانہ جھگڑا کرنے کا ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ اگرچہ وہ روٹھ کر تو گھر نہیں آئی تھی۔ لیکن عمار ملا تھا اسے، دل گرفتہ اور پریشان سا۔ مہک اس کے لیے زندگی کو مشکل بنا رہی تھی۔ اور جانے اس کا انجام کیا ہو گا اور اس نے اب اسے وعدہ کیا تھا کہ ہمیشہ مہک کی خوشی کا خیال رکھے گی۔ مگر وہ خوش نہیں تھی اور اس نے اپنے ساتھ عمار کو بھی ناخوش کر رکھا تھا۔

عمار جیسے شخص کی رفاقت پا کر بھی ناخوش رہا جاسکتا ہے۔

وہ حیران ہو کر سوچتی اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ کیا بات ہے جس نے مہک کو ناخوش کر رکھا ہے۔

”جناب مس رشک ماہ صاحبہ! بندہ آپ کے حکم کا منتظر ہے، کہاں چلیں۔“

”گھر اور کہاں۔“

”کس کے گھر؟“

”تمہارے گھر۔“ اس نے شان بے نیازی سے کہا۔

”وہ گھر تمہارا بھی تو ہو سکتا ہے۔“

راجیل شوخ ہو رہا تھا۔

”مگر ابھی تو وہ صرف تمہارا ہے۔“

”ہم بھی تو تمہارے ہی ہیں۔ دل تمہارا ہم تمہارے، پھر گھر بھی تمہارا ہونا۔“

”کیا کوئی اردو قلم دیکھی ہے؟“

وہ جھینپ گئی اور رخسار خون کی حدت سے سرخ ہو گئے۔

راجیل دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم بہت پیاری ہو رشک۔“

”اچھا اب رومینک ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”کبھی کبھی زندگی میں رومینک بھی تو ہونا چاہیے۔“

”مگر میری زندگی میں ابھی اس کی گنجائش نہیں ہے۔“

”تب ہی تو کہتے کہتے خاموش ہو جاتا ہوں۔ ورنہ دل چاہتا ہے کہ کسی دن تمہیں سامنے

بٹھا کر تمہاری ان آنکھوں کی، ان ہونٹوں کی، ان بالوں کی.....“

”اچھا اچھا، بس کوئی اور بات کرو۔“

رشک نے سے ٹوک دیا۔

”ایک تو تم اچھے بھلے موڈ کو غارت کر دیتی ہو۔ کتنا دل چاہ رہا ہے کہ آج ذرا حال دل

کہہ دوں“

”راجیل! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

رشک نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”محبت ہو گئی ہے تم سے۔“

”پہلے تو..... تم نے کبھی اس طرح کی باتیں نہیں کیں۔“

”پہلے ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ خیال تھا کہ تم سب جانتی ہو تمہیں پتا ہے کہ میں

تمہارا اسیر ہوں۔“

”تو اب کس نے مشورہ دیا ہے کہ حال دل کہو۔“

”اسی بے چارے دل نے۔“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”کیونکہ تم تو اتنی مصروف ہو چکی ہو کہ تمہیں.....“  
 ”فضول باتیں نہیں کرو راحیل، میرے خیال میں ہمیں ایک دوسرے سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں اور تم بھی جانتے ہو۔“  
 ”کیا؟“ راحیل کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”میں کیا جانتا ہوں؟“

”یہی کہ میں..... میں بھی تمہیں.....“

”تم بھی مجھے کیا.....“

”فار گاڈ سیک راحیل.....“

وہ اچک کر بایک پر بیٹھ گئی۔

”اب چلو۔ پھر مجھے ٹوشن پڑھانے بھی جانا ہے۔“

”جو حکم ملکہ عالیہ!“

”پلیز راحیل! اب سنجیدہ ہو جاؤ۔“

”چلو ہو گیا سنجیدہ، کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”نہیں کوئی خاص بات نہیں لیکن تم اتنے بہت سارے دنوں سے کہاں تھے؟ میں نہیں

آسکی تو تم بھی نہیں آئے۔“

”تم نے میری کمی محسوس کی تھی؟“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔

”تم بہت سارے دن نہ ملو تو یوں لگتا ہے جیسے زندگی میں کہیں کوئی کمی سی ہو گئی ہے۔“

کچھ کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔“

”اے پتا ہے، کیا کہتے ہیں۔“

راحیل نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”محبت!“

”تمہیں محبت ہو گئی ہے مجھ سے؟“

”آج نہیں ہوئی ہمیشہ سے ہے؟“

اس نے چڑ کر کہا۔

”اب چلو بھی یا یہاں ہاسپٹل کے باہر ہی کھڑے کھڑے شام کر دو گے۔“

”چلتے جناب۔“

راحیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور بایک اشارت کر دی

حسب معمول سب ہی اسے دیکھ کر خوش ہوئے تھے عقیل اور ثکیل، ممانی جان اور دلدار ماموں اور ہمیشہ کی طرح وہاں اس نے بہت اچھا وقت گزارا اور کچھ دیر کے لیے سب کچھ بھول گئی۔

مہک آپا، عمار بھائی، شاہ اور ندا۔ حسام اور اماں۔

کسی کا اسے خیال نہ رہا اور کاش زندگی اسی طرح گزر جائے یوں ہی ہلکے پھلکے انداز میں عقیل اور ثکیل کی شرارتوں میں۔ ماموں اور ممانی کی شفقتوں تلے اور راحیل کی محبتوں تلے۔

مگر شاید ایسا نہ ہو۔ شاید اس طرح نہ ہو جس طرح اس نے سوچا تھا۔

اور ایسا کبھی ہوتا نہیں ہے کہ ویسا ہی ہو جیسا انسان سوچتا ہے۔

کبھی کبھی اس کے دل میں خوف کا ایک کانٹا سا چبھتا تھا اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ اور راحیل ساتھ چلتے چلتے ایک دم جدا ہو گئے ہوں اور پھر..... اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔

سانس رکنے لگتی تھی۔

اگر ایسا ہو گیا کہ ساتھ چلتے چلتے وہ اور راحیل جدا ہو گئے تو کیا وہ جی پائے گی۔ جی سکے

گی۔ شاید نہیں یا شاید ہاں۔

اور راحیل کہتا تھا۔

”خواہ مخواہ فضول باتیں مت سوچا کرو، ہم دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے ہمیشہ ساتھ

ساتھ چلیں گے۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اور تم دیکھنا کوشی ہمارے راتے میں پھول ہی پھول ہوں گے۔“

”مگر تب تک..... تب تک پتا نہیں کیا ہو۔“

”کچھ نہیں ہو گا بابا۔“

”کیس تم بدل تو نہیں جاؤ گے راحیل۔“

”کیا تم بدل جاؤ گی؟“

”نہیں۔“

”تو پھر میرے لیے ایسا غلط گمان کیوں کرتی ہو۔“

”پتا نہیں کیوں کبھی کبھی بس یو نہی خیال آ جاتا ہے۔“

”زیادہ سوچا مت کرو ڈیئر، کیونکہ بقول شکیل زیادہ سوچنے سے بد ہنسی ہو جاتی ہے۔“

شام کو جب وہ راحیل کے ساتھ واپس آئی تو ممک کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”ارے آپا تم۔“

”ہاں میں۔ اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے۔ کیا یہ میرا گھر نہیں ہے۔ کیا میں یہاں نہیں

آسکتی۔“

”یہ تمہارا بھی گھر ہے آپا، میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ وہ صالحہ جو بیمار ہے تو۔۔۔۔۔“

ممک نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔

”ہوتی رہے۔ مجھے کوئی اس کی پٹی سے لگ کر نہیں بیٹھنا۔ تین چار دن کے لیے آئی

ہوں۔ عمار خود چھوڑ کر گیا ہے۔“

”اوہ شکر ہے۔“

اس نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔ ورنہ ممک کو دیکھ کر وہ ڈر سی گئی تھی کہ کہیں پھر تو

لڑائی نہیں کر لی۔

”جھینٹا تمہارے بتایا نہیں کہ اب صالحہ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”آصفہ بیگم نے پوچھا۔“

”ٹھیک ہی ہو گی۔“

ممک نے کندھے اچکائے ورنہ راحیل کی طرف دیکھا جو ابھی تک دروازے کی دہلیز پر

کھڑا تھا۔

”تم وہاں کیوں کھڑے ہو اندر آ جاؤ نا۔“

”بس رشک کو چھوڑنے آیا تھا، جارہا ہوں۔“

”کیوں رشک کے علاوہ اور کسی سے رشتے داری نہیں ہے تمہاری۔“ ممک نے مسکرا

کرا سے دیکھا۔

راحیل نے کان کھجائے اور پھر رشک کی طرف دیکھتا ہوا اندر چلا آیا۔

”ہاں بیٹا! کیسے ہو تم، بہت دنوں سے آئے نہیں، حسام بھی تمہیں یاد کر رہا تھا۔“

”کہاں ہے وہ۔“

”ذرا لمبا کیٹ تک گیا ہے۔“

”چائے پیو گے راحیل؟“

رشک ابھی تک کھڑی تھی۔

”اب بیٹھ ہی گیا ہوں تو پی ہی لیتا ہوں۔“

”تم بیٹھو کوشی! ابھی تھکی ہوئی آئی ہو۔ ٹاہنا لے گی۔“

”نہیں اماں آج ادھر چلی گئی تھی۔ ٹیوشن پڑھانے نہیں گئی۔“

”تم کبھی ادھر چلی جاتی ہو کبھی ادھر چلی جاتی ہو۔ معلوم نہیں لوگ تمہیں ٹیوشن فیس

کیسے دے دیتے ہیں۔“

ممک نے طنز کیا۔

”نہیں تو آپار و روز روز جاتی ہوں۔ آج یوں بھی صرف ٹیوشن سینٹر ہی جانا تھا۔ مسز بٹ تو

گاؤں گئی ہوئی ہیں۔“

رشک نے ممک کے طنز پر لہجہ کو نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”میں تو ہاسپٹل گئی تھی۔ صالحہ کو دیکھنے، وہاں راحیل مل گیا۔ تو اس کے ساتھ ہی گھر

چلی گئی۔“

”تمہیں کس نے بتایا کہ صالحہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔“

”وہ عمار بھائی دو تین روز ہوئے ملے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا۔“

”یہ عمار اکثر تمہیں کہاں مل جاتا ہے۔“

”اسٹاپ پر بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ دراصل ان کا آفس اسٹاپ کے قریب ہی

ہے۔ بعض اوقات اتفاق ہو جاتا ہے۔“

ریشک نے تفصیل سے بتایا اور پلٹی۔

”آپا تم بیٹھو، میں جا رہی ہوں چائے بنائے۔“

ثنا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ وہیں دروازے کے پاس پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ مہک بالکل اس کے سامنے بیٹھی عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں سے گھبرا کر ریشک راجیل کی طرف دیکھنے لگی۔

”راجیل تمہارا یہ دوست.....“

”دیکھنے میں بے حس اور کرخت لگتا ہے۔“

”یہی کہنے لگی تھیں تاہم اکثر لوگ اس کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں۔ لیکن وہ ایسا نہیں ہے بس وہ زندگی کی حقیقتوں کو قبول کر لیتا ہے۔ دکھوں اور غموں کو زندگی کا ایک حصہ سمجھ کر تسلیم کرتا ہے۔“

”نہیں راجیل میں یہ نہیں کہہ رہی تھی۔ بلکہ میں یہ پوچھ رہی تھی کہ تمہارے اس دوست کے بابا کا علاج ملک سے باہر تو ہو سکتا ہے نا۔ تو یہ انہیں باہر کیوں نہیں لے جاتا۔“

”کوشش تو کر رہا ہے وہ۔ شاید جلدی کچھ سبب بن جائے تو ہوا پر ایلیم ہے اسے پیسے کا۔“

”یہ اتنی منگنی بیماریاں غریب لوگوں کو کیوں ہوتی ہیں راجیل بھائی،۔“ ندانے پوچھا۔

”ہاں واقعی بھی یہ تو سونے والی بات ہے گزیا۔“ راجیل نے ندا کی طرف دیکھا۔

”جی راجیل بھائی وہ.....“

”ندانے کچھ کہنا چاہا تو مہک نے اسے ٹوک دیا۔“

”ندا! تم جاؤ دیکھو دھنی نے چائے بنالی ہے تو لے لو۔“

اور راجیل تم کبھی ہماری طرف بھی چکر لگاؤ نا، عمار بھی پوچھ رہا تھا ایک دن تمہارا۔“

”اچھا آؤں گا کسی دن۔ دراصل وقت نہیں ملتا۔“

”ریشک کے لیے تو وقت مل جاتا ہے تمہیں۔“

”وہ.....“ راجیل سے کچھ جواب نہ بن پڑا تو وہ ریشک کی طرف دیکھنے لگا جو نگاہیں

جھکائے نہ جانے زمین پر کیا تلاش کر رہی تھی۔

”یہ مہک کو کیا ہوا ہے، یہ آج کس طرح کی باتیں کر رہی ہے پہلے تو کبھی اس نے اس

طرح کی باتیں نہیں کیں اور پھر راجیل۔ راجیل سے تو کبھی سیدھے منہ بات نہیں کی ہمیشہ بچپن سے ہی وہ راجیل سے خار کھاتی تھی اور آج۔“ اس نے سر اٹھا کر مہک کی طرف دیکھا۔ وہ راجیل ہی کو دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ ثنا کی طرف دیکھنے لگی جوڑے اٹھائے اندر آرہی تھی۔

”آپی! آپ چائے بنالیں۔“

ثنا نے ٹرے میز پر رکھی۔

”میں ذرا کچن میں اماں کے ساتھ رات کے کھانے کی تیاری کروں گی، راجیل بھائی!“

بات کرتے کرتے اس نے راجیل کی طرف دیکھا۔

”اماں کہہ رہی ہیں آپ کھانا کھا کر جائیں۔“

”نہیں..... نہیں دھنی گڑیا اماں سے کو، مجھے دیر ہو جائے گی ضروری کام سے جانا ہے

”کیا حرج ہے راجیل۔“

مہک کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ ریشک نے گھبرا کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا

اور پھر چائے بنانے لگی۔

☆☆☆☆☆

”کامل..... کامل یاد تم کہاں تھے۔ اتنے دنوں سے ہم سب تمہارے لیے پریشان ہو

رہے تھے۔“

دور سے آتے ہوئے کامل کو دیکھ کر وحید نے بے قراری سے پوچھا۔

”تمہارے بابا کیسے ہیں۔ ہمیں تمہارا گھر بھی معلوم نہیں تھا اور مدثر بھی نہیں آ رہا تھا۔“

”بابا پتا نہیں کیسے۔ میں انہیں بہت بیمار چھوڑ کر گیا تھا۔“

”تم کہاں چلے گئے تھے اور تمہیں بابا کی خبر کیوں نہیں ہے۔ بابا کے پاس کون ہے؟“

”بابا کی پاس اماں اور خدیجہ میں۔ مدثر سے بھی میں نے کہا تھا کہ وہ بابا کی خبر لیتا ہے۔“

اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا اور وہیں پڑے سنگی بیچ پر بیٹھ گیا۔

”لیکن تم کہاں چلے گئے تھے، بتاتے کیوں نہیں ہو۔“

وہ کھڑا ہو گیا۔

”حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ میرے یہاں آنے سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی۔ وہی رہے گی۔ بابا اگر چلے گئے ہیں تو وہ پلٹ تو نہیں آئیں گے۔“

”اچھا میں چلتا ہوں۔“

وہ وحید کو وہاں حیران کھڑا چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پلٹ گیا یونیورسٹی سے باہر نکلے ہی اسے رشک مل گئی۔ وہ ذرا سی دیر کو ٹھک کر رک گیا۔

”آپ! رشک نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔“

”آپ کہاں تھے؟“

”کیوں آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔“

”اور آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں کیسے گیا ہوا تھا۔“

”میں اور راجیل کل شام ہاسٹل گئے تھے آپ کے بابا کو دیکھنے، آپ کے بابا کی طبیعت کل شام اچانک بہت خراب ہو گئی تھی۔ آپ کی سسر نے راجیل کو بتایا تھا تو ہم انہیں دیکھنے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ان کی طبیعت سنبھلی تو ہم آگئے۔“

”اوہ!“

اس کی سیاہ آنکھوں میں ڈلتی بے چینیوں کو جیسے سکون سا آ گیا۔

”تو بابا زندہ ہیں۔“

اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ تو رشک نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں، بابا کی طبیعت اب کافی بہتر ہے۔ صبح راجیل آئے تھے انہوں نے بتایا تھا۔ دراصل آج وہ مجھوں در بسوں کی ہڑتال ہے تو راجیل نے کہا تھا کہ وہ مجھے یونیورسٹی چھوڑتے جائیں گے۔“

”اوہ تو پھر آپ گھر کیسے جائیں گی۔ کیا راجیل لینے آئیں گے؟“

”نہیں، اس وقت تو وہ آفس میں ہوں گے۔ دراصل آج حسام کی طبیعت خراب تھی اس لیے میں نے احمد صاحب اور مدنی صاحب کی کلاس چھوڑ دی ہے۔“

”حسام! کامل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔“

”میں پروفیسر امتیاز کے ساتھ گیا ہوا تھا ہم نے کچھ فنڈ اکٹھا کیا تھا کشمیری مجاہدوں کے لیے گبن اسی سلسلے میں ہم گئے ہوئے تھے اور مدثر کب سے نہیں آرہا؟“

”چھ سات دن سے۔“ وحید نے بتایا۔

”اور تم گھر جانے کے بجائے سیدھے یونیورسٹی آگئے ہو۔“

”ہاں!“

اس نے ایک گہری سانس لی۔

”دراصل میں پروفیسر امتیاز کے ساتھ ہی چلا آیا اور میں نے یہ بھی سوچا کہ مدثر مل جائے گا یہاں یونیورسٹی میں اس سے بابا کا حال پوچھ کر جاؤں گا، مگر مدثر.....“

”مدثر کیوں نہیں آرہا؟“

”پتا نہیں۔“ وحید نے الجھے الجھے انداز میں اسے دیکھا۔

”ہم دوبار اس کے گھر گئے ہیں مگر وہ نہیں ملا۔ وہ۔“

”اوہ نہیں۔“

اس نے بے چینی سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

”تمہیں نہیں جانا چاہیے تھا کامل۔ تم۔ تمہیں پتا ہے تمہارے بابا۔“

”ہاں مجھے پتا ہے۔“

”پھر..... پھر بھی تم چلے گئے؟“

”جانا ضروری تھا۔“

”مگر۔“

”حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا ہونی کو کون روک سکتا ہے۔“

”تو پھر تم یہاں کیوں آگئے ہو۔ گھر کیوں نہیں گئے۔ ہاسٹل کیوں نہیں گئے اندر سے تم ڈرتے تھے کہ تمہیں کوئی بڑی خبر سننے کو نہ ملے۔ تم یہاں بھاگے چلے آئے کہ مدثر سے تصدیق کر لو۔ تم میں اتنی اہمیت نہیں تھی کہ حقیقت کا سامنا کرتے۔ تم ”اجنبی“ کے ہیرو نہیں ہو کامل تم.....“

”ہاں، مجھے سیدھا گھر ہی جانا چاہیے تھا۔ تم صحیح کہتے ہو۔“

”میرا چھوٹا بھائی ہے“ رشک نے اسے بتایا۔

”اوہ۔“ اس نے قریب سے جاتے ہوئے رشک کو روکے کے لیے ہاتھ ہلایا مگر وہ زلزلے سے نکل گیا۔

”آج تو ان کا مزاج ہی نہیں ملتا۔“

اس نے مایوسی سے جاتے ہوئے رشک کو دیکھا۔ کتنی دیر ہو گئی تھی اسے یہاں کھڑے ہوئے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ احمد صاحب کی کلاس ہی اینڈ کر لیتی۔

”آپ۔“

”جی! رشک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کچھ نہیں۔“ کامل نے آہستگی سے کہا۔

”نہیں، آپ کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے۔“

”ہاں شاید، مگر پھر سوچا کہیں آپ ہائینڈ نہ کر لیں۔“

”نہیں۔ نہیں پوچھیں۔“

”آپ شاید اپنے گھر میں سب سے بڑی ہیں جب بھی آپ سے ملاقات ہوئی آپ کسی کسی کی فکر میں تھیں۔“

”ہوں..... نہیں تو میری آپا ہیں مجھ سے بڑی، ان کی شادی ہو چکی ہے۔ دو بہنیں اور

ایک بھائی مجھ سے چھوٹا ہے۔“

”اور آپ کے والد؟“

”ان کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”اور گھر کے اخراجات؟“

”بس گزارا ہو جاتا ہے۔ کچھ روپیہ بزنس میں لگا رکھا ہے۔ وہاں سے ملتا ہے کچھ اور تھوڑا بہت میں ٹیوشن کر لیتی ہوں۔“

”خوب، مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو زندگی کی تلخ حقیقتوں کے سامنے ہتھ

نہیں ڈالتے اور ہمت سے مقابلہ کرتے ہیں۔ تم بہادر لڑکی ہو۔“

”اور کسی کو کیا پتا میں کتنی بہادر ہوں۔“

اس نے سوچا ”میں تو..... میں تو ذرا سی بات پر ہمت ہار دیتی ہوں پھر پتا نہیں کیسے۔ پتا نہیں کیسے۔ اور میری سب سے بڑی کمزوری تو ہمک آپا ہیں۔ اور اگر وہ میرا ساتھ دیتیں تو تم دیکھتے کامل رضایت، ہم دونوں مل کر کتنی بڑی طاقت بنتے۔ تب میں شاید بہت بہادر ہوتی۔ بہت باہمت۔ اب تو ہر وقت کوئی انجانا سا خوف اندر سے مجھے جکڑے رکھتا ہے کہ جانے کب کیا ہو۔“ اور ابھی کل..... یہی کی تو بات تھی جب وہ یونیورسٹی سے سیدھی مہک کی طرف چلی گئی تھی۔ اماں دو دن سے کہہ رہی تھیں کہ واپسی پر ذرا مہک کی خبر لیتی آنا کہیں بیمار نہ ہو۔ دو ہفتے ہو گئے نہیں آئی اور نہ ہفتے میں دو چکر تو ضرور لگاتی تھی مہک اپنے کمرے میں تھی۔

اور وہ سب لوگ صالحہ، کلثوم اور اماں جان کتنے خلوص سے ملی تھیں۔

”آپا کہاں ہیں۔“

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

”کمرے میں ہوگی۔“

اماں جان نے ٹھنڈی سانس لی۔

”ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

اس نے پریشانی سے پوچھا۔

”جی ہاں، بالکل ٹھیک ہیں البتہ دوسروں کی طبیعت پریشان کرنے میں انہیں مہارت حاصل ہے۔“

خالد نے جونہ جانے کب وہاں آکھڑا ہوا تھا..... تلخی سے کہا۔

”خالد!“

اماں جان نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔ تو اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

”سوری۔“

بھیکتی مسوں والا یہ لڑکا نگاہیں جھکائے سوری کہتا ہوا اسے بالکل اپنے حسام کی

طرح لگا۔

”چلو جاؤ تم، بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیتے اور بیٹا تم پریشان نہ ہو تمہیں پتا تو ہے

مہک کی طبیعت کا ضد کرتی ہے خواہ مخواہ اور پھر خود ہی ٹھیک بھی ہو جاتی ہے۔ جاؤ تم بسن سے

انہیں برداشت کریں گے کبھی تو..... کبھی تو پیانہ جھٹکے گا نا اور پھر۔ خدانہ کرے ایسا کوئی وقت آئے۔ اس سے پہلے..... اس سے پہلے مجھے اس دنیا سے اٹھالینا۔ نہیں مگر وہ مر گئی تو پھر سب کا کیا ہو گا۔ ندا اور ثنا کا حسام کا اور اماں کا۔ وہ سب تو بہت کمزور ہیں اور اماں کا تو بالکل حوصلہ ہی نہیں ہے اور حسام، اسے تو ابھی پڑھنا ہے۔ بابا کے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ کر لانا ہے۔

”بیٹا..... رشک بیٹا! اس کی باتوں کا برنہ منانا بچہ ہے نا۔“

اماں جان شرمندگی سے اس سے معذرت کر رہی تھیں۔

”نہیں..... نہیں اماں جان۔“

وہ ان کے ہاتھ تھام کر رو پڑی۔

”مجھے شرمندہ نہ کریں۔ کیا کا خالدا نے کچھ بھی تو نہیں۔ شاید صحیح ہی کہا ہو۔ مہک آپا شاید ایسی ہی ہیں۔ میں انہیں سمجھاؤں گی۔ وہ آپ لوگوں کی قدر کریں۔ آپ سے محبت کریں۔ آپ بھی پلیز ان کی غلطیوں کو معاف کر دیا کریں۔“

”آپ۔ آپ مہک بھابی سے کتنی مختلف ہیں۔ کس قدر۔“ صالحہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”عمار بھائی صحیح کہتے ہیں۔ آپ ان سے مختلف ہیں۔ کاش مہک بھابی کے بجائے.....“

”صالحہ!“

اماں جان نے اپنے ٹوک دیا۔

”جاؤ بہن کسے لیے شربت لے کر آؤ۔ گرمی میں آئی ہے اور بیٹا تمہارا اندر مہک کے پاس۔“

”جی!“ وہ سر جھکائے ہوئے قدم اٹھاتی مہک کے کمرے میں آگئی۔ مہک بستر پر اونٹھی لیٹی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔

”آپا! اس نے آہستگی سے پکارا۔“

”تم۔“ مہک سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”تو یہ اتنی دیر سے تم سے مذاکرات ہو رہے تھے۔ میں نے سمجھا جانے کون خاص

مہمان آیا ہوا ہے۔“

ملو۔“

رشک کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

یہ سب لوگ..... یہ سب لوگ کس قدر محبت کرنے والے، کتنے اچھے اور پیارے تھے اور آپا ان کو خفا کر دیتی تھیں ان سے ناراض رہتی تھیں اور پتا نہیں اب کیا ہوا تھا کیا ہو گیا تھا۔ اس نے پریشانی سے دائیں کندھے پر پڑے بیک کو اتار کر بائیں کندھے میں ڈال لیا اور اضطراب سے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کاٹنے لگی۔

”وہ دراصل آپا کا مزاج کچھ ایسا ہی ہے انہیں جلدی غصہ آجاتا ہے۔ لیکن وہ دل کی بری نہیں ہیں وہ آپ سب سے محبت کرتی ہیں۔“

وہ جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے مہک کسی سے محبت نہیں کرتی تھی وہ کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ سوائے اپنے آپ کے پھر بھی وہ ان کا دفاع کر رہی تھی۔

”محبت“ خالدا جاتے جاتے پلٹ پڑا۔ اس کی آنکھوں میں دن کو چیر لینے والی طنز یہ سی کیفیت تھی۔

”ہوں“ وہ ہولے سے ہنسا۔

”آپ کی بہن کسی سے محبت نہیں کر سکتیں آپ..... آپ اپنی بہن کو سمجھاتی کیوں نہیں ہیں وہ ہر وقت خنجر بکلف.....“

”خالدا!“ اماں جان کی آواز بہت اونچی تھی۔

”نہیں پلیز، اماں جان اسے کچھ مت کہیں۔ وہی صحیح کہہ رہا ہے۔ یہ زہر جو اس کے اندر بھرا ہوا ہے یہ زہر اسے نکال دینے دیں۔“

اس نے کہنا چاہا تھا لیکن اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی تھی۔ وہ اس چھوٹے سے بچے کے سامنے سر جھکائے نادم کھڑی تھی جو شاید نویں میں پڑھتا تھا یاد سوس میں، لیکن جس کی آنکھوں میں ہزاروں شکوے چل رہے تھے۔ ہزاروں شکائیں تڑپ رہی تھیں۔ پتا نہیں کہاں کہاں وہ ہرٹ ہوا تھا۔ کہاں کہاں مہک نے اسے ضرب لگائی تھی وہ خود بھی تو ہرٹ ہوئی تھی۔ آپا کی ضرب ہی اتنی شدید ہوتی تھی کہ آدمی تڑپ بھی نہ سکے اور وہ تو اس کی بہن تھی برداشت کر لیتی تھی۔ لیکن یہ..... یہ تو اس کا کوئی نہیں تھا۔ کوئی خونی رشتہ نہیں۔ کب تک وہ

تو آپا سے دیکھ چکی تھیں اور اب کتنی انجان بن رہی تھیں  
 ”کچنی جو۔ اماں کو تمہاری بہت فکر تھی۔ بہت دنوں سے تم نے چکر بھی تو نہیں لگایا۔“  
 ”کیا فائدہ چکر لگانے کا۔“

اس نے روٹھے روٹھے انداز میں کہا۔

”آپا وہاں سب تمہیں یاد کرتے ہیں۔ اماں کو تمہارا انتظار رہتا ہے۔“

”خاک انتظار رہتا ہے۔ جب جاؤ ایک ہی بات نصیحتوں کا پٹار اکھول کر بیٹھ جاتی ہیں۔“

”آپا تم ناخن ناراض رہتی ہو۔ اماں جو کچھ کہتی ہیں تمہارے بھلے کو ہی کہتی ہیں۔“

”میرے بھلے کو۔“ وہ تلخی سے منی۔

”میرے بھلے کا خیال ہوتا تو میری زندگی برباد نہ کرتیں اور مجھے اس جیسے کنگال شخص

کے حوالے نہ کرتیں۔“

”آپا پلیز آہستہ بولیں، کسی نے سن لیا تو کیا کہیں گے۔“

”میں کوئی ان سے ذرتی ہوں۔ سنتے ہیں تو سنیں۔ کیسے کیسے ارمان تھے سب خاک میں

مل گئے۔“

”پلیز آپا۔“ وہ گھبرا گئی۔

”آپ بو نمی گھبرا رہی ہیں۔“

صالحہ شربت کا جگڑے میں رکھے اندر داخل ہوئی۔

”ہم ایسی باتیں سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔“

وہ پانی پانی ہو گئی۔

”سچ بات کڑوی لگتی ہے۔“

منک نے عجب سے انداز میں کہا اور صالحہ کی طرف نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

”جانتی ہوں ابھی طرح سے، یہ غربت صرف میرے لیے ہے جہاں پیسہ خرچ کرنا

ہے وہاں تو ایک کی جگہ دس ہی خرچ کرتے ہیں۔“

”بھابی۔“ صالحہ نے شربت گلاس میں ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”اگر آپ چاہتی ہیں کہ عمار بھائی تایا ابا کا حال پوچھنا چھوڑ دیں تو یہ ناممکن ہے۔ تایا ابا

کے ہم پر بے شمار احسانات ہیں۔ اگرچہ کچھ تلخی ہو گئی تھی لیکن وہ ہمارے تایا ابا ہیں اور اب  
 جبکہ وہ اس شرم میں ہیں تو یہ ناممکن ہے کہ ہم ان کی خبر گیری نہ کریں عمار بھائی نے کیا بھی کیا  
 ہے اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ چھوٹے بھائی یہاں نہیں تھے تو اس روز وہ تایا ابا کے انچھھڑ اور  
 دوائیں خرید کر لے گئے تب سے آپ نے موڈ خراب کیا ہوا ہے۔“

وہ ساکت بیٹھی گلاس کو گھور رہی تھی۔

کاش آپا کادل تھوڑا بڑا ہوتا۔ کاش!

”ہاں، میں نے کہا تھا، آج باہر کھانا کھاتے ہیں چائینیز میں تو پیسے نہیں تھے۔ اور تایا ابا کی

دوا کے لیے چار سو روپے جب سے نکل آئے ہیں۔ سب سمجھتی ہوں یہ سب تم لوگوں کی ہی

سازش ہے۔“

”بھابی!“ صالحہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”عمار بھائی جو کچھ کرتے ہیں اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔“

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ”اچھا میں چلتی ہیں۔“

”ارے ارے آپ بیٹھیں نا پلیز! یہ شربت تو پیئیں۔“

”نہیں بس اب جاؤں گی۔“

”پلیز!“ صالحہ نے ندامت سے اسے دیکھا۔

”آپ مجھ سے خفا ہو کر جا رہی ہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔

”بہت دیر ہو گئی ہے اماں انتظار کرتی ہوں گی پھر مجھے ٹیوشن پڑھانے بھی جانا ہوتا ہے

نہ میں یونہی کھڑے کھڑے آپا کی خیریت پوچھنے آگئی تھی۔“

”کہہ دینا اماں سے۔“

منک نے آواز میں رقت پیدا کر لی۔

”ابھی زندہ ہوں، جس جہنم میں جھونکا ہے۔“

”آپا!“ رشک نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

”کیا ہے تمہیں، ٹھیک ٹھاک تو ہو۔ خوش رہا کرو۔ اتنے اچھے ہیں سب۔“



منک نے ناراضگی سے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔ لمحہ بھر وہ یونہی اسے دیکھتی رہی، پھر صالحوں کے پیچھے ہی باہر نکل آئی۔

”ارے!“ اس نے چونک کر کہا۔

ایک اور رکشہ اس کے پاس سے زن سے نکل گیا۔ کامل جو نہایت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہولے سے مسکرایا

”آپ کو پتا ہے ابھی دو بالکل خالی رکشے یہاں سے گزرے ہیں۔ مگر آپ پتا نہیں کہاں تھیں۔“

”ہاں۔“ وہ نادم ہو گئی۔

”بس میں۔ وہ ٹکیل ہی صحیح کہتا ہے میں ہمیشہ پیچھے رہ جاتی ہوں اور گاڑی آگے نکل جاتی ہے۔“

”یوں سڑک پر کھڑے کھڑے خواب دیکھنا تو اچھا نہیں ہوتا۔“

”خواب۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے کامل کو دیکھا۔

”نہیں خواب تو میں نہیں دیکھتی..... خواب تو آسودہ لوگ دیکھتے ہیں، میں تو کچھ اور سوچتی ہوں۔“

”نہیں خواب تو نا آسودہ لوگ بھی دیکھتے ہیں۔ اچھی زندگی کے خواب۔“

”ہاں شاید، مگر میرے پاس تو خواب دیکھنے کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔“

”ارے وہ ٹیکسی آرہی ہے۔“ کامل نے اشارے سے اسے روکا۔

”آپ آئیں پلیز۔“

”میں۔“

”ہاں آپ کو ڈراپ کر کے اسی ٹیکسی پر میں ہاسپٹل چلا جاؤں گا۔“

”ابھی کوئی رکشہ۔“

”پلیز مجھ پر اعتبار کریں۔ آج سواری مشکل سے ہی ملے گی اور راحیل اگر آپ کو لینے آیا

بھی تو دیر سے آئے گا۔“

”ہاں۔“

”کس طرف جائیں گی آپ۔“

”گلبرک۔ فردوس مارکیٹ کے پاس اتار دیجئے گا۔“

”پھر بھی آپ ٹکف کر رہی تھیں۔ جبکہ آپ کو پتا ہے بابا بھی سروس ہاسپٹل میں ہیں۔“

وہ خاموشی سے ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

فردوس مارکیٹ میں وہ کامل کا شکریہ ادا کر کے اتر گئی اور کامل نے ٹیکسی واپس موڑ لی۔

☆☆☆☆☆

آج چھٹی تھی رشک صبح سے ہی کچن میں مصروف تھی۔ چھٹی والے دن وہ اماں کو کچن میں نہ جانے دیتی تھی۔ اور حسام کی پسند کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور بناتی، حسام کو بیٹھا بہت پسند تھا اور بیٹھا بناتے ہوئے اسے ابا بہت یاد آتے تھے انہیں بھی بیٹھا بہت پسند تھا۔ اور وہ بہت شوق سے کھاتے تھے۔

”آہا! آج تو کچن سے بڑی خوشبو میں اٹھ رہی ہیں۔“ سنک میں برتن رکھتے ہوئے رشک نے مڑ کر دیکھ تو بے اختیار خوشی سے بولی۔

”ارے تم ٹکیل، کب آئے؟“

”جناب ابھی حاضر ہوئے ہیں۔“

”اور وہ تمہارا ہنزا۔“

”بندہ بھی حاضر ہے۔“ عقیل نے ٹکیل کے کندھے پر سے جھانکا۔

”یہ آج صبح ہی صبح کیسے دھاوا بول دیا۔“

”راحیل بھائی بھی آئے ہیں۔“

”سچ۔“ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”اماں بھی ہیں۔“ عقیل نے مزید بتایا۔

”سچ، اور ماموں جان۔“

”ابو نہیں آئے۔“

”کیوں؟“

”وہ کسی کام سے اسلام آباد گئے ہیں ہم نے سوچا آج اپنی پیاری پیاری بہن کے ہاتھوں

کے کپکپے ہوئے کھانے کھائیں گے۔ سوہم نے راحیل بھائی کی منت سماجت کی اور۔  
 ”آپ کو پتا ہے آج کل راحیل بھائی ایک عدد گاڑی کے مالک بن چکے ہیں۔“ عقیل نے  
 ٹکلیل کی بات کاٹ دی۔  
 ”نہیں تو۔“

اس نے پوچھا۔

”راحیل نے گاڑی خریدی ہے۔“

”نہیں کہنی کی طرف سے ملی ہے۔“

”اچھا!“

”راحیل بھائی نے آپ کو بتایا نہیں۔“

”نہیں، بہت دنوں سے ملے ہیں نہیں۔“

”وہ آپ سے خفا ہیں۔“ ٹکلیل نے بتایا۔

”کیوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا

”پتا نہیں۔ یہ تو ان سے پوچھئے گا۔“

”مگر میں نے تو کچھ نہیں کیا۔“

”خفا ہونے کے لیے کچھ کرنا ضروری ہوتا ہے۔“

”ہاں، بغیر وجہ کے تو کوئی خفا نہیں ہوتا۔“ رشک پریشان ہو گئی تھی۔

”آپا!“ ثنائے باہر سے پکارا۔

”ممائی جان اور راحیل بھائی آئے ہیں۔“

”آ رہی ہوں۔“ اس نے چو لے کی آغچ دھیمی کی اور ہاتھ صاف کرتی ہوئی باہر نکل

آئی۔

ٹکلیل اور عقیل بھی اس کے پیچھے ہی تھے۔

”بھائی آپ سے سخت خفا ہیں منالہجے گا۔“

ٹکلیل نے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی کی۔

”نہیں، وہ مجھ سے خفا نہیں ہو سکتے۔“

اس سے بڑے یقین سے کہا اور ڈرائیونگ روم میں داخل ہو گئی۔ ممائی جان نے کھڑے  
 ہو کر اسے گلے سے لگا لیا۔

”میری بیٹی کیسی ہے۔“ بھیڑ اتنے دنوں سے تم نے چکر ہی نہیں لگایا تھا تو ہم  
 نے سوچا خود ہی مل آئیں۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا۔ سچ میں آپ کو بہت یاد کر رہی تھی۔ پوچھ لیں ندا سے آج میرا  
 پروگرام تھا۔ شام کو آنے کا۔“

اس نے ایک طرف بیٹھتے ہوئے راحیل کی طرف دیکھا جو نہایت انتہاک سے کوئی پرانا  
 میگزین دیکھ رہا تھا اور اس نے ایک بار بھی سر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا تھا۔

”تو جناب واقعی ناراض ہیں۔“ وہ زہرب لب مسکرائی۔

”مگر کیوں؟“

”یہ راحیل کی کسی سے لڑائی ہوئی ہے کیا۔“

اس نے آہستگی سے پوچھا مگر ممائی جان نے سن لیا۔

”ارے نہیں بیٹا! اس نے بھلا کس سے لڑنا ہے دراصل اس کا پروگرام کیسے اور جانے کا

تھا۔ ٹکلیل اور عقیل زبردستی لے آئے۔“

”ہاں ظاہر ہے، ہم ٹھہرے غریب، مسکین لوگ اور یہ ہوئے گاڑیوں والے، ہمارا گھر

بھلا ان کے شایان شان کہاں ہے۔“

”نہیں بیٹا! اسے کسی دوست کے ہاں جانا تھا۔“

”چھوڑیے ممائی جان! اصل بات تو یہ ہے کہ جناب مغرور ہو گئے ہیں۔ اپنے آپ کو

بڑا آدمی سمجھنے لگے ہیں۔“

”فضول باتوں کے سوا تمہیں کچھ اور بھی آتا ہے؟“

راحیل نے چکر میگزین ایک طرف رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ پیلے رنگ کے

لان کے سوٹ میں نکھرے نکھرے چہرے اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ چپکے چپکے مسکراتی

ہوئی وہ بے تحاشا خوبصورت لگ رہی تھی۔

”یہ رشک روز بروز کتنی دلکش اور خوبصورت ہوتی جا رہی ہے۔“

اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔  
 ”اور میں اس سے ناراض رہ ہی نہیں سکتا۔“ وہ جو گھر سے اس سے ناراض رہنے کا پروگرام بنا کر آیا تھا۔ وہ سارا پروگرام دھرا کا دھرا رہ گیا۔  
 ”کیسی ہو؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“ نچلے ہونٹ کا کونا دبا کر وہ شرارت سے مسکرائی۔

اماں، ممانی جان کو لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آؤ بہن! دھر چل کر بیٹھتے ہیں۔ یہاں بچے اپنی باتیں کریں۔“

”ناراض ہیں؟“

ریشک اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی تھی۔

”ہاں بہت زیادہ۔“ راجیل نے روٹھے روٹھے انداز میں کہا۔

”کیوں؟“

”اس دن پورا ایک گھنٹہ تمہارا انتظار کیا۔“

”مگر مجھے کیا پتا تھا کہ تم لینے آؤ گے اور پھر حسام کی طبیعت خراب تھی اس لیے میں

جلدی چلی آئی تھی۔“

”تمہیں پتا ہونا چاہیے تھا۔ جب میں تمہیں چھوڑنے گیا تھا اور مجھے پتا تھا کہ اسٹرائیک

ہے تو ظاہر ہے میں تمہیں لینے بھی جاتا۔“

”سوری راجیل، تم بہت اچھے ہو اور میرا بہت خیال رکھتے ہو۔“

”تو تمہیں بھی میرا خیال رکھنا چاہیے نا۔“

”رکھتی تو ہوں۔“

”کیسے رکھتی ہو؟“ راجیل کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں۔

”بس اکثر تمہیں سوچتی رہتی ہوں۔“

”کیا سوچتی ہو؟“

”کیوں بتاؤں۔“

”اچھا نہ بتاؤ یہ بتاؤ اس روز پھر پیدل مارچ کی تھی کیا؟“

”نہیں تو ٹیکسی میں آئی تھی۔“

”تمہیں کتنی بار منع کیا ہے کوئی کہ تم ٹیکسی میں اکیلے مت آیا کرو۔“

”نہیں اکیلی تو نہیں تھی۔ کامل مجھے ڈراپ کر گیا تھا۔“

”اوہ اچھا۔ بہر حال احتیاط کیا کرو پھر۔ کامل اچھا لڑکا ہے لیکن کسی اجنبی کا کیا بھروسہ۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم آئندہ خیال رکھو گی اور تمہیں پھر کیسے پتا چلا تھا کہ میں جا چکی

ہوں۔“

”وحید نے بتایا تھا۔“

”اگر صلح ہو گئی ہو تو ہم بھی اس گفتگو میں شریک ہو جائیں۔“ کھلیل نے پوچھا۔

”ہم ناراض تھے ہی نہیں۔“ ریشک ہنسی۔

”کوئی تمہیں پتا ہے تم بیٹے ہوئے بہت پیاری لگتی ہو۔ ہمیشہ ہنستی رہا کرو۔“

راجیل نے مدھم آواز میں کہا۔

”بڑے بھائی یہ سرگوشیاں کیوں ہو رہی ہیں اگر حکم ہو تو ہم منظر سے آؤٹ ہو جائیں

کھلیل نے شوخی سے انہیں دیکھا۔

”جی نہیں۔“ وہ سرخ پڑ گئی۔

”تم بہت فضول باتیں کرنے لگے ہو کھلیل۔“

راجیل نے اسے منیبہ کی۔

”نہیں۔ کیوں عقیل کیا یہ فضول بات تھی؟“

”نہیں بالکل نہیں۔ عقیل نے سنجیدگی سے کہا۔

”بلکہ آپ کے بھلے کی بات تھی۔“

”تو پھر جاؤ یہاں سر پر کیوں کھڑے ہو۔“

راجیل مسکرایا۔

”کیا؟“ عقیل نے آنکھیں پھاڑیں۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“

”یعنی“، ٹکیل نے بھی وضاحت چاہی۔

”یعنی یہ۔“

ٹکیل اور عقیل دونوں کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے راجیل نے ان کا رخ دورازے کی

طرف کر دیا۔

”آپ خاموشی سے دیکھ رہی ہیں کہ ہمارے ساتھ کتنی زیادتی ہو رہی ہے۔“

”تم نے خود ہی تو آخر کی تھی۔“

راجیل کی شرارت سمجھتے ہوئے رشک بھی مسکرائی۔

”مگر وہ تو۔“

ٹکیل نے منہ بسور۔ تب ہی دروازہ کھلا اور لان کے گلابی رنگ کے سوٹ میں بے حد

فریش اور خوش خوش ممک اندر داخل ہوئی۔

”اے آپ ممک آیا۔“

رشک خوشی سے کھڑی ہو گئی۔ لیکن ممک نے سرسری سا اسے دیکھا اور پھر ٹکیل سے

پوچھا۔

”ماموں جان نے نئی گاڑی لی ہے کیا؟“

”نہیں تو۔“

”تو پھر یہ سفید نسان جو گیٹ کے پاس۔“

”وہ تو راجیل بھائی کی گاڑی ہے۔“

عقیل نے بتایا اور واپس آکر راجیل کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

”اور راجیل! یہ گاڑی تمہاری ہے۔ مبارک ہو بے حد۔“

”شکریہ۔“ راجیل نے آہستگی سے کہا۔ رشک حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی وہ راجیل

کے لئے اتنی مخلص تو کبھی نہیں رہی تھی کہ اس طرح خوشی کا اظہار کرتی۔

”سب ٹھیک تو ہے نا آپ؟“

اس نے قریب آتی ممک سے پوچھا۔

”ہاں ٹھیک ہے سب۔“ ممک کی پیشانی پر ہل پڑ گئے۔

”پتا نہیں تمہیں میرے گھر میں داخل ہوتے ہی سب غلط ہونے کا گمان کیوں ہونے

لگتا ہے۔“

”نہیں، نہیں تو۔“

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ایک دم ہی حلق میں کانٹے اگ آئے تھے۔

”عمار بھائی بھی آئے ہیں؟“

”نہیں انہیں اپنے پیار تایا کی تیمارداری سے فرصت ملے تو تب نا۔ گیٹ تک چھوڑ کر

چلے گئے ہیں۔“

”آپ نے انہیں اندر آنے کے لیے کہا ہوتا۔“

”مجھے اگر معلوم ہو تا کہ تم اس سے ملنے کو بے چین ہو تو کہہ بھی دیتی۔“

”آپا۔“ رشک ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

”میں تو۔“

”میں تو کیا۔ مجھے پتا ہے تمہیں بہت ہمدردی ہے عمار سے، میں تو سوچتی ہوں آخر.....

امی جان نے میرے بجائے تمہیں۔“

اور وہ اس کی پوری بات سننے بغیر تیزی سے باہر نکل گئی۔ آنکھیں برسنے کو بے تاب ہو

رہی تھیں۔

”یہ خدا جانے آپا کو کیا ہو گیا ہے۔“

اس نے کچن کا دروازہ بند کرتے ہوئے کواڑ سے ٹیک لگا کر آنسو بہاتے ہوئے سوچا۔

”کیا ہوا آپا؟“ ثنائے کھیر پیالوں میں ڈالتے ہوئے اسے دیکھا تو قریب چلی آئی۔

”کیا راجیل بھائی نے کچھ کہہ دیا۔“

”نہیں۔“ اس نے سر ہلایا اور جلدی سے آنکھیں صاف کر لیں۔ چوٹ کچھ اس طرح

لگی تھی کہ اسے کچن میں کام کرتی ثنائے نڈا کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔

”ابھی ابھی ممک آپا کی سواری آئی تھی۔ انہوں نے ہی کوئی تیر چلایا ہو گا۔“

نڈا بھی جو سلام دینا ہی تھی۔ اس کے قریب چلی آئی۔

”بجو! آپ کو پتا تو ہے ان کی عادات کا آپ انہیں کچھ مت کہا کریں۔ جو چاہے کرتی رہیں۔ بہت ہو گا تو روٹھ کر گھر آجائیں گی تو آجائیں، جہاں اتنے افراد کھا رہے ہیں وہ بھی کھالیں گی بس اور آپ مت سوچا کریں ان کے متعلق۔“

”اچھا۔“ اس نے مسکرا کر ندا کے رخسار تھپتھپائے۔

یہ کیا ہو گیا تھا اسے، ان چھوٹی بچیوں کے سامنے حوصلہ کھور ہی تھی۔ لیکن آپا کارویہ۔ اس نے سر جھٹک کر دونوں کی طرف دیکھا۔

”اور کیا کیا کام رہ گیا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ سالن آپ ہنا گئی تھیں، تقریباً کھیر تیار ہے، سلا ندانے تیار کر لیا ہے۔ اور روٹیاں بازار سے آجائیں گی۔“

”تو پھر میرے کرنے کے لیے کوئی کام نہیں۔“

”نہیں آپ راجیل بھائی کو جا کر کمپنی دیں۔ پتا ہے کتنے دنوں بعد آئے ہیں۔“

شاکی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”مہک آپا ہیں وہاں۔“

وہ کاؤنٹر پر بڑے برتن سینے لگی۔

”مگر مہک آپا میں اور آپ میں بہت فرق ہے۔“

”کیا؟“ اس نے بے دھیانی سے پوچھا۔

”مہک آپا، مہک آپا ہیں اور آپ، آپ ہیں۔“

”اچھا! وہ ہنس دی۔“

”چلو یہ کھیر رکھ آؤ فرج میں۔“

اور گرم صالے کاؤ باکینٹ میں رکھتے ہوئے اس کا ذہن پھر بھٹک گیا۔

یہ مہک آپا اس طرح کی باتیں کیوں کرتی ہیں۔ اتنی تکلیف دہ اور اذیت ناک اور تکلیف دہ باتیں تو وہ ہمیشہ سے ہی کرتی ہیں۔ مگر یہ عمار بھائی ادھ نہیں، کیا وہ سمجھتی ہیں کہ میں اور عمار بھائی۔

اس کا رنگ یکدم زرد پڑ گیا اور ٹانگیں کانپنے لگیں۔ وہ کاؤنٹر کا کنارہ پکڑتے ہوئے یکدم

بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا؟“ ندا نے گہرا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں بس یوں ہی پکڑ آ گیا تھا۔“

”آپ پتا نہیں ہر وقت کیا سوچتی رہتی ہیں۔“

ندانے جلدی سے گلو کوڑ گھولتے ہوئے کہا۔

”ایک تو اتنی محنت خود پڑھنا پھر پڑھانا تو پر سے یہ سوچوں کے پہاڑ آپ کو پیس ڈالیں گے۔ مت سوچا کریں کسی کے لیے بھی کچھ، ہم سب تو ایک گھر کی چھت تلے ہیں۔ ہماری ماں ہیں ماموں ہیں۔ ہم سب اتنے سارے ہیں۔ ایک دوسرے کو سہارا دینے والے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بننے اور رونے والے، وہ بھی تو ہوتے ہیں جو بالکل اکیلے ہوتے ہیں، جن کا کوئی نہیں ہوتا۔ لوگ یتیم خانوں میں بھی تو پل جاتے ہیں۔ ہم بھی پل جائیں گے اور آپ دیکھیں گا ہم سب۔“

”ندا!“

رشک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا نے کی کوشش کی۔

”تم مجھے کیا سمجھا رہی ہو گڑیا اور یہ باتیں۔“

”میں آپ کو یہ سمجھا رہی ہوں کہ آپ پریشان نہ ہوا کریں اور یہ لیں گلو کوڑ۔“

”اچھا نہیں ہوتی پریشان۔“

اس نے آہستگی سے اس کا رخسار تھپتھپایا اور گلاس لے لیا۔

☆☆☆☆☆

کیس سے تریاق ڈھونڈ لاؤ۔

مگر کہاں سے؟

نہ کوئی حاتمہ نہ خضر ہم میں۔

کہ ہر ہے راہ نجات؟

رشک بہت دیر سے یونہی چپ بیٹھی فائل پر آڑی تر چھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔

”کیا تم احسان صاحب کا پریڈائنڈ نہیں کرو گی۔“

”نہیں۔“

اس نے آہستگی سے کہا اور فائل بند کر کے گھاس کے نیچے نوچنے لگی۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

”ہوں۔“

اس نے سمیرا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”اچھا پھر میں تو چلتی ہوں۔“

”اور ہاں۔“ وہ جاتے جاتے پٹی۔

”تمہیں خبر ہے، کامل کے بابا فوت ہو گئے ہیں۔ کل ہم سب لوگ ادھر گئے تھے۔“

کامل کے بابا فوت ہو گئے! اچھا۔ انہیں مرنا ہی تھا۔ اس زہر کا کوئی تریاق نہیں ہے۔

نے سوچا۔

”تم جاؤ گی نا اس کے گھر۔“

”ہاں۔“

”تو ایسا کرنا تم اور حصہ چلی جانا اور بھی کل نہیں آئی تھی۔“

”اچھا۔“

وہ بدستور گھاس کے نیچے نوچ رہی تھی۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ کامل کے بابا کے

لیے دیکھی ہونا چاہ رہی تھی لیکن اس کا اپنا غم بہت گہرا اور شدید تھا اور اس وقت وہ کچھ بھی نہیں

سوچا چاہتی تھی کسی کے متعلق بھی نہیں۔ ہاں کامل کے بابا اچھے آدمی تھے۔ بالکل ابا کی طرح

شفیق اور مہربان سے اور کامل بھی اچھا ہے سنجیدہ اور کم گو سا۔ پتا نہیں اس نے اس دکھ کو کب

برداشت کیا ہو گا۔ شاید کر ہی لیا ہو، وہ تو پہلے سے ہی ذہنی طور پر تیار تھا اس حادثے کے

۔ ہاں خدیجہ۔ خدیجہ نے ضرور اس حادثے کو شدت سے محسوس کیا ہو گا۔ پرسوں شام ہی تو

اسے ملی تھی اور کامل نے اس کا تعارف کروایا تھا۔

”یہ خدیجہ ہے اور خدا! یہ راحیل کامل کی کزن ہے رشک ماہ۔“ وہ خدیجہ کو دلدار ماما

کے ہاں چھوڑنے آیا تھا عقیل اور عقیل کی بی۔ ایس۔ سی۔ میں کامیابی پر مسمانی نے ایک چو

سے تقریب کر ڈالی تھی اور کامل کو اپنے بابا کو چیک اپ کے لیے ہاسپٹل لے کر جانا تھا۔

مدا، حمام سب ہی چمک رہے تھے۔ خوش ہو رہے تھے لیکن وہ ایک طرف چپ بیٹھی تھی۔

ہمک گھر پر تھی اور ہمک کی وجہ سے اماں بھی نہیں آئی تھیں۔ ہمک کا موڈ بہت خراب تھا اور

وہ عمار سے لڑ جھگڑ کر اور اپنا بہت سارا سامان اٹھا کر گھر آچکی تھی اور اس نے عمار سے طلاق کا

مطالبہ کر دیا تھا اور یہ بات عمار نے اسے پرسوں بس اسٹاپ پر بتائی تھی۔ ”اور مجھے اس کا مطالبہ

منظور ہے۔“

”نہیں، پلیز عمار بھائی آپ ابھی کچھ مت کیجیے گا۔ وہ تو بس جذباتی ہیں۔ میں انہیں

سمجھاؤں گی۔ ان سے بات کروں گی، پلیز عمار بھائی ابھی کچھ نہیں۔“

اور ہمک نے تو اس کی بات تک سننے سے انکار کر دیا تھا اور وہ محض عقیل، شکیل کی خوشی

کے لیے چلی آئی تھی۔ ورنہ اس کا دل ذرا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ راحیل گھر پر نہیں تھا۔ آج صبح

اچانک ہی اسے کمپنی کے کام کے لیے کراچی جانا پڑ گیا تھا اور اس کے دل پر اتنا بوجھ تھا۔ وہ یونہی

چپ سی بیٹھی تھی..... خدیجہ بھی اس کے پاس آ بیٹھی۔ وہ اپنے بابا کے متعلق کتنی پر امید تھی

اور کتنی خوش۔

”بابا اب ٹھیک ہو جائیں گے۔“

اس نے کوئی تین بار کہا تھا۔

”اور پتا ہے۔ اب تو اس کے سر پر بال بھی اگ آئے ہیں اور چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔“

ڈاکٹر زکریا کہتے تھے۔ تیسری ٹریٹمنٹ بہت کم لوگ برداشت کر پاتے ہیں اور بابا نے برداشت

کر لیا ہے۔ وہ صحت مند ہو رہے ہیں اور اب کامی انہیں۔ سنگاپور لے جائے گا۔ وہ انتظام کر رہا

ہے۔“

”سنگاپور۔“

اس نے یونہی خالی الذہن سے پوچھا تھا۔

”ہاں امریکہ میں زیادہ خرچ ہے۔ وہ کچھ کم خرچ ہے، ہم نے اپنا کراچی والا گھر

فروخت کر دیا ہے چند دن میں رقم مل جائے گی اور پھر کامی کی ہڈیوں کا گودا بابا۔“

اور پھر یہ کیا ہو گیا تھا۔ کامل رضابٹ کے بابا مر گئے تھے، جب وہ انہیں باہر لے جانے کی

تلاش کر رہا تھا۔ اسے تو کچھ خبر نہیں تھی کہ اچانک کیا ہو گیا تھا۔ وہ تو خود تین دن بعد

یونیورسٹی آئی تھی۔ اسے تو خود اپنا ہوش نہ تھا۔ وہ تو بس ہر صورت میں عمار کو طلاق دینے سے

روکنا چاہتی تھی۔

ان تین دنوں میں اس نے عمار کے آفس کے کتنے پکڑ لگائے تھے۔ کتنی بار اس کے گھر  
مئی تھی۔

☆☆☆☆☆

”سب بے سود ہے کوشی۔ میں تمہاری عزت کرتا ہوں تمہارے مسائل سمجھتا ہوں،  
لیکن تمہاری بہن، وہ میرے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی۔ وہ نہ جانے کس مٹی کی بنی ہے تم اس  
سے کتنی مختلف ہو۔ میں نے سمجھوتے کی ہر ممکن کوشش کی ہے مگر ہار گیا ہوں۔ اب بھی۔  
اب بھی مطالبہ مکہ نے کیا ہے۔“  
عمار کی آنکھوں میں نمی تھی۔

”پلیز عمار بھائی میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ  
دیے۔

”کوشی۔“ عمار نے بے اختیار اس کے ہاتھ تھام لیے۔  
”مجھے شرمندہ نہ کرو میری بہن۔“

اور دفتر میں داخل ہو تاراجیل وہیں سے پلٹ گیا۔ وہ رات ہی تو کراچی سے واپس آیا تھا  
اور پھر ماں سے مکہ کے جھگڑے کا سن کر اور مکہ سے بات کر کے عمار سے ملنے آیا تھا۔ مگر  
یہاں عمار کے آفس میں رشک کو بیٹھے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹھک گیا۔ مکہ سے سنی  
ہوئی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھیں۔

”تو کیا مکہ سچ کہتی ہے کہ عمار، رشک کو پسند کرتا ہے۔“

”آپ عمار بھائی وعدہ کریں پلیز آپ آپا کو طلاق نہیں دیں گے۔“

”کوشی قانون اور شریعت کے مطابق میں نے آج صبح پہلی طلاق کا نوٹس بھجو دیا ہے۔  
لیکن انجی واپسی کی گنجائش ہے۔ اگر مکہ سمجھدار ہے تو اس کے لیے اتنی ٹھوکر کافی ہوگی۔ وہ  
پلٹ آئے گی تو میں بیٹے دنوں کو بھول جاؤں گا۔ تم سے وعدہ کرتا ہوں کبھی اس کو اس کی کوئی  
کو تابی یاد نہیں دلاؤں گا۔ تم بھی اس دور ان اسے سمجھانا۔“  
اور رشک آنکھوں میں آنسو لیے اس کے دفتر سے چلی آئی۔

تو بالآخر اس شادی کا یہ انجام ہونا تھا مگر نہیں ابھی تو ڈور اس کے ہاتھ میں ہی ہے۔ ابھی  
کچھ زیادہ نہیں بگڑا۔ یہ دھچکا یقیناً مکہ کے لیے بہت بڑا سبق ہوگا۔ آج، آج کسی وقت ڈاک  
سے یہ نوٹس پہنچ جائے گا۔ اور اماں، اماں کا کیا حال ہوگا۔

شاوہرند ابھی پریشان ہو جائیں گی، وہ اماں کا سامنا کیسے کرے گی۔

کیسے ان کا چہرہ دیکھے گی۔

وہ آنیو نیورسٹی سے گھر جانے کے بجائے دلدار ماموں کے ہاں چلی جائے۔

اس نے سوچا

مگر نہیں خواہ مخواہ اس شکل لے کر وہاں نہیں جاؤں گی اور پھر راجیل بھی تو نہیں ہے  
جس کے سامنے وہ اپنا بوجھ ہکا کر تی۔

کامل کی طرف چلی جاؤں۔

مگر نہیں اس سے کیا کہوں گی۔ تعزیت کرنا اسے ہمیشہ ہی بہت مشکل لگتا تھا اور ان  
پریشانی کے لمحوں میں بھلا وہ کہہ بھی کیا سکے گی۔

”رشک سنو۔“

کاشف اپنے ڈپارٹمنٹ کی طرف جاتے جاتے اس کے پاس رک گیا۔ ”تمہیں پتا ہے  
کامل کے بابا۔“

”ہاں۔“ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے سمیرا نے بتایا تھا۔ اچانک کیا ہو گیا تھا انہیں۔“

”پرسوں شام کامل ان کا معمول کے مطابق چیک اپ کرانے ہاسپٹل لے گیا تھا اور وہاں  
پتا چلا کہ سیز خطرناک حد تک کم ہو گئے ہیں۔ انہیں فوراً ایڈمٹ کر لیا گیا اور پھر ہم سب نے  
نئی خون دیا۔ سب کلاس فیلوز نے پروفیسر امتیاز اور پروفیسر عارف نے بھی، لیکن کل صبح اچانک  
نئی ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ میں وہاں ہی تھا۔ مدثر بھی تھا۔ انہیں فوراً میر جنسی میں لے  
چلایا گیا مگر۔“

کاشف نے اسے پوری تفصیل بتائی اور چلا گیا۔

اسے کامل کے گھر جانا چاہیے۔ اس نے سوچا۔ کتنی اپنائیت سے ملتا ہے۔ کتنے خلوص و

محبت سے بات کرتا ہے وہ اٹھی لیکن پھر بیٹھ گئی۔  
نہیں۔ آج نہیں، پھر کبھی کل یا پرسوں۔

بست ساری دیر وہ یونہی بیٹھی رہی۔ لڑکے اور لڑکیاں اس کے پاس سے گزرتے رہے۔  
لیکن وہ یونہی بیٹھی تھی۔

اور ابا کی روح آج کتنی پریشان ہو گئی اور شاید ہم سے غلطی ہوئی۔

ہمیں آپا کی شادی عمار بھائی سے نہیں کرنا تھی بلکہ کسی بست بست دولت مند گھرانے  
میں جہاں آپا کی ساری خواہشیں پوری ہو سکتیں۔ مگر دولت مند گھرانے کا کوئی لڑکا بھلا آپا کو  
بیانے اس چھوٹے سے گھر میں آتا؟

اور ہمارے پاس تو آپا کو دینے کے لیے مناسب جیز بھی نہیں تھا اور ہمارا گھر اس قابل  
ہی کہاں تھا کہ وہاں کوئی دولت مند لڑکا آتا۔

اور عمار بھائی کتنے اچھے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں، دولت مندوں سے زیادہ اچھے۔ اور یہ  
تو آپا کی اور ہماری خوش نصیبی تھی۔ مگر آپا نے ان کی قدر نہیں کی۔ کاش۔ اے کاش۔

اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔ تو وہ آنکھیں پونچھ کر کھڑی ہو گئی اور بیگ کندھے پر لٹکائے  
سر جھکائے یونیورسٹی سے باہر نکل آئی۔ اور اسٹاپ پر کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے کے  
 بجائے، وہ سر جھکائے چلتی رہی اگلے اسٹاپ سے ذرا دھر ”حیات میڈیکل سٹور“ سے اس نے  
اماں کی بلڈ پریشر کی دوائی لی اور اسٹاپ پر آکھڑی ہو گئی۔

”کوشی آپا۔“

بالکل قریب سے کسی نے اسے پکارا تو اس نے چونک کر ساتھ کھڑی سالہ کو دیکھا۔ پتا  
نہیں وہ کب اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

”تم سالہ کیسی ہو؟“

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”آپ کیسی ہیں۔ کوشی آپا پتا ہے۔ بست سارے دنوں سے میں سوچ رہی تھی کہ کسی  
دن آپ مل جائیں اور آپ سے باتیں کروں مجھے آپ سے بست ساری باتیں کرنا ہیں۔ آج  
میں گھر سے یہی سوچ کر نکلی تھی کہ یونیورسٹی جاؤں گی۔“

”تو پھر یونیورسٹی آجائیں۔“

”آج کلٹوم بھی کالج نہیں آئی تھی اور مجھے آپ کی طرف آنا ہی تھا لیکن پھر میری  
طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور میں چھٹی لے کر اپنی دوست کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی۔  
میری دوست کے ڈیڈی ڈاکٹر ہیں اور ہاسپٹل میں وہی میرا علاج کر رہے تھے۔“

ریشک نے نگاہیں اٹھا کر پہلی بار اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جو زرد ہو رہا تھا۔ وہ  
پہلے کی نسبت بہت کمزور لگ رہی تھی۔ چند ماہ پہلے جب اس نے اسے دیکھا تھا تو وہ اتنی کمزور  
نہیں تھی۔

”اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے پریشانی سے پوچھا۔

”بس یونہی چکر اگیا تھا۔“

”اور پھر تم دھوپ میں اسٹاپ پر کھڑی ہو، رکشہ کر لیتیں۔“

”خدا نے مجھے آپ سے ملوانا تھا تو میں یہاں آگئی،

ورنہ میری دوست نے بہت روکا کہ کچھ دیر رک جاؤں تو ان کا ڈرائیور مجھے گھر چھوڑ  
آئے گا۔ پتہ ہے مجھے آپ سے عمار بھائی اور ممک بھابی کے بارے میں بات کرنی تھی، آپ کو  
پتا ہے عمار بھائی نے۔“

اس نے ریشک کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور ریشک نے غور کیا۔  
اس کے بازوؤں سے اس کے ہاتھوں سے اور اس کی کپٹیوں سے پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔  
ریشک نے قریب سے گزرتے ہوئے رکشے کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

”چلو آؤ، میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں اور باتیں بھی کر لیں گے۔“

سالہ نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ ممک بھابی سے کتنی مختلف ہیں۔ کاش وہ بھی ایسی ہی ہوتیں آپ کی طرح۔“

”ہر آدمی دوسرے سے مختلف ہوتا ہے سالہ۔“ اس کی فطرت اور مزاج الگ الگ ہوتا  
ہے۔ ممک آپا تھوڑی تیز مزاج ہیں لیکن وہ دل کی بری نہیں ہیں سالہ۔“

وہ ہر مقام پر اس کی دفاع کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ سالہ نے کوئی جواب نہیں دیا  
اور لمحہ بھر کچھ سوچتی رہی۔ اس نے ابھی تک ریشک کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔



”آپ کو پتا ہے، مک بھابی کے حالیہ جھگڑے کی نوعیت کیا ہے۔“  
”نہیں۔“ مک نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔

”وہ الگ گھر میں رہنا چاہتی ہیں اور فی الحال عمار بھائی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے انہوں نے اور پھر اماں نے سب نے ہی مک بھابی کو سمجھایا کہ عمار فی الحال دو گھروں کا خرچ الگ الگ برداشت نہیں کر سکتے، خالد کی تعلیم ختم ہو جائے تو پھر وہ بخوشی الگ گھر میں چلی جائیں۔ لیکن انہوں نے کوئی بات ہی نہیں..... سنی اور یہ کہہ کر چلی گئیں کہ اگر الگ گھر میں نہیں رکھ سکتے تو پھر طلاق..... دے دو۔“  
اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔

”انہوں نے اتنی بڑی بات کہہ دی کوئی آپ۔ اتنی بڑی بات۔“  
”سب ٹھیک ہو جائے گا گڑیا۔“

ریشک نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔

حالانکہ خود اسے پتا..... نہیں تھا کہ سب ٹھیک ہو گیا نہیں۔  
”کیسے ٹھیک ہو گا سب۔“ وہ روسی دی۔

”انہوں نے۔ عمار بھائی نے مک بھابی کو طلاق کا نوٹس بھیجوادیا ہے۔ اماں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے ہیں اور۔“

وہ لمحہ بھر کو چپ بیٹھی پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کرتی رہی۔ ”میں آپ سے اس لیے ملنا چاہتی تھی۔ کوئی آپا کہ آپ مک بھابی سے کہیں، وہ دوسری طلاق سے پہلے گھر لوٹ آئیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں عمار بھائی کو منالوں گی کہ وہ الگ گھر لے لیں۔ خالد اور کلثوم اور میں، ہم تینوں ٹیوشن کر..... لیں گے۔ اور خالد تو ویسے بھی پارٹ ٹائم جاب ڈھونڈ رہا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا کوئی آپا، ہم کوئی اور گھر لے لیں گے۔ کوئی چھوٹا سا مناسب سے کرائے پر گھر۔ مک بھابی کو کہیں کہ وہ لوٹ آئیں۔ وہ اگر اس طرح خوش رہ سکتی ہیں تو یونہی سہی۔ مجھ سے عمار بھائی کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ وہ ساری ساری رات جاگ کر گزارتے ہیں۔ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھاتے۔“

”تم پریشان نہیں ہو صالحہ گڑیا! تم سب اکٹھے رہو گے ایک ہی گھر میں اور مک آپا بھی آجائیں گی۔ وہ تم سب سے معافی مانگیں گی۔ دیکھ لینا تم۔“

وہ مسکرائی۔

”اور تم عمار بھائی کو تسلی دیا کرو، انہیں سمجھایا کرو کہ وہ پریشان نہ ہوں۔“  
عمار کے لیے اس کا دل دکھ رہا تھا۔ رکشہ گھر کے سامنے رکا تو صالحہ نے التجائی۔  
”پلیز کوئی آپا! گھر چلیں نا تھوڑی دیر کے لیے۔“  
”اچھا۔“ وہ اس کے ساتھ ہی اتر آئی۔

گھر میں صرف کلثوم تھی۔

”اماں تایا کے گھر گئی ہیں۔ آپ کو پتا ہے تایا کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”وہ نہیں۔“ اسے افسوس ہوا۔

”اس لیے تو کلثوم بھی کالج نہیں گئی۔ میں تھوڑی دیر کے لیے ضروری کام کا ہمانہ کر کے نکلی تھی مجھے آپ سے ملنا تھا۔ آپ مک بھابی کو سمجھائیں گی نا۔“  
”ہاں!“ اس نے سر ہلایا۔

کلثوم حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کوئی آپا مجھے اسٹاپ پر مل گئی تھیں۔“

صالحہ نے کلثوم کو بتایا۔

”اور پھر میری طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی۔ اس لیے یہ مجھے چھوڑنے آگئیں۔“

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“

کلثوم پریشان ہو گئی۔

”اوہ! تمہیں کتنا پسینہ آ رہا ہے صالحہ پلیز تم لیٹ جاؤ اور وہ تمہاری دوائیں کماں ہیں۔ تم باقاعدگی سے کھا رہی ہونا۔“

وہ ریشک کو نظر انداز کر کے بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

”آپ بیٹھیں نا کوئی آپا!“ صالحہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں!“ وہ بیٹھ گئی۔

”تم بھی لیٹ جاؤ۔“

صالحہ نڈھال سی بستر پر گر پڑی۔ کلثوم فوراً ہی کچھ کچھول اور گولیاں لے کر آگئی تھی۔

اسے دو اکھلا کر اس نے رشک کی طرف دیکھا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

”نہیں شکریے کی کیا بات ہے۔“

”یہ بہت ضدی ہے۔ سب نے ہی منع کیا تھا اسے، مگر کہنے لگی کہ اسے مس ننگ سے ضروری بات کرنا ہے۔ حالانکہ آج ہم سب کو تایا کی طرف جانا تھا۔ اماں تو کل سے ادھر ہی ہیں۔ عمار اور خالد بھائی بھی صرف تھوڑی دیر کے لیے گھر آئے تھے۔“

”تمہارے تایا کا بہت افسوس ہوا۔“

”ہاں ڈاکٹروں نے تو چھ ماہ پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ زندہ رہیں گے۔“

”مہک بھابی کیسی ہیں۔ وہ تایا کا سن کر بھی نہیں آئیں۔“

”نہیں شاید آپ کو پتا ہی نہیں ہے۔“

”خالد نے خود فون کیا تھا۔“

کلثوم نے بتایا۔

”اے نہیں تایا کا سن کر آنا چاہیے تھا۔“

کلثوم نے آہستگی سے کہا۔

شاید اسے ابھی طلاق والی بات کا علم نہ تھا۔ صالحہ نے ملتی نظروں سے رشک کو دیکھا۔

جیسے اس سے التجا کر رہی ہو کہ ابھی کلثوم کو کچھ نہ بتائے۔

رشک نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی اور کلثوم سے باتیں کرنے لگی اور پھر

باتوں میں وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ دونوں لڑکیاں کتنی محبت کرنے والی اور سادہ دل تھیں۔ اور

مہک کو ان کا وجود گوارا نہ تھا۔ رشک، مہک کے دیے ہوئے زخموں پر لاشعوری طور پر مرہم

رکھتی رہی اور شام ہو گئی۔

”اے مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔“

وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ٹیوشن سینٹر بھی نہیں جاسکتی تھی۔ دوسری ٹیوشن چھوٹ

گئی تھی البتہ مغرب کے بعد پڑوس سے راجہ اسلم کی بیٹیاں انگلش اور حساب پڑھنے آتی

تھیں۔

”دومنٹ رک جائیں کوشی آپا!“ صالحہ نے کہا۔

”ابھی خالد یا عمار بھائی آجائیں گے تو آپ کو چھوڑ آئیں گے۔“

”نہیں اماں پریشان ہوں گی، میں سینٹر سے فارغ ہو کر ساڑھے پانچ پونے چھ تک گھر

پہنچ جاتی ہوں اور اب تو سات بجنے والے ہیں۔“

اس نے دونوں بہنوں کو خدا حافظ کہا۔ تب ہی عمار اندر داخل ہوا۔ اسے یوں اس وقت

اپنے گھر دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔

”تم، کوشی خیریت؟“

صالحہ نے جلدی جلدی اسے ساری بات بتائی۔

”چلو، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“

”نہیں عمار بھائی! آپ کو تکلیف ہوگی۔ میں چلی جاؤں گی۔ آپ مجھے دیکھیں پر بٹھا

دیں۔“

”یو قوفوں جیسی باتیں نہ کرو چلو، اتنی شام میں تمہیں اکیلا کیسے جانے دوں۔“

عمار وہاں سے ہی اس کے ساتھ چل پڑا۔

☆☆☆☆☆

جب سے راجیل نے رشک کو عمار کے دفتر میں دیکھا تھا۔ تب سے اس کے دل کو عجیب

سے اضطراب نے آگھیرا تھا کبھی دل کتا کہ وہ مہک کی باتوں پر یقین کر لے کبھی کتنا نہیں۔

رشک ایسی نہیں ہو سکتی۔ اس کے دل میں تو مہک کے لیے ثناء، نداء کے لیے سب کے لیے بے

حد بے حساب محبت ہے۔ وہ یقیناً عمار کے پاس مہک کی وکالت کرنے لگی ہوگی۔ اسے سمجھانے

مگنی ہوگی کہ وہ مہک کا مطالبہ نہ مانے۔ لیکن کوشی کے ہاتھ عمار کے ہاتھوں میں تھے۔

وہ پریشان سا ہو جاتا۔

رشک کے ساتھ حد سے بڑھی ہوئی محبت اسے بدگمان نہیں ہونے دے رہی تھی۔

اس لیے وہ اپنی بے چینی کا علاج کرنے چلا آیا تھا۔

”میں خود پوچھوں گا اس سے کہ وہ کیوں مگنی تھی عمار کے دفتر میں۔“ لیکن وہ گھر پر نہ

تھی۔

”اتنی دیر ہو گئی ہے۔“ اس نے سوچا۔

شاید آج سینٹر میں دیر ہو گئی ہو۔ لمحہ بھر کے لیے اس نے سوچا، وہ خود ٹیوشن سینٹر جا کر لے آئے اور اسی خیال سے وہ صحن کی طرف آیا تھا اور پھر کھلے گیٹ سے اس نے رکشہ میں سے اسے اترتے دیکھا اور عمار کو بھی۔ جو نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ اس کے دل پر ایک بوجھ سا آگرا اور وہ واپس ڈرائیونگ روم کی طرف پلٹ گیا۔ جہاں حسام بیٹھائی وی دیکھ رہا تھا۔

یہ چھوٹا سا کمرہ ڈرائیونگ روم بھی تھا سٹنگ روم بھی اور ٹی روم بھی۔ بوقتِ ضرورت یہاں ہی دسترخوان بچھا کر کھانا بھی کھالیا جاتا تھا۔ وہ تھکی تھکی سی سر جھکائے گھر میں داخل ہوئی تو ٹٹا نے کچن کی کھڑکی میں سے ہی اسے دیکھ کر اطلاع دے دی۔

”کوشی آیا آگئی ہیں۔“

”اوہ، شکر ہے۔“

اماں کچن سے باہر نکلیں۔

”بست دیر کر دی۔“

”بس دیر ہو گئی۔“

وہ برآمدے میں بچھے تخت پوش پر بیٹھ گئی۔ اور ”اس نے سر اٹھا کر غور سے اماں کا چہرہ دیکھا۔ جو ستا ہوا تھا آنکھیں سرخ تھیں۔“

”سب ٹھیک ہے نا۔“

وہ جھک کر جوتوں کا اسٹریپ کھولنے لگی۔

”ہاں سب ٹھیک ہے۔“

اماں نے آہستگی سے کہا۔

”آپا کہاں ہیں۔“

”ابھی یہاں ہی تو تھی۔“

وہ واپس مڑیں۔

”تمہارے لیے چائے بنواؤں۔“

”نہیں۔ لڑکیاں پڑھنے نہیں آئیں؟“

”آئی ہوئی ہیں شاید ندا کے ساتھ تمہارے کمرے میں ہیں۔“

”کتنی پلیز، ذرا انہیں باہر بھیج دو۔ وہاں بڑا جھس ہے۔ یہاں ہی بیٹھ کر پڑھا دیتی ہوں۔“

اس نے کچن سے باہر آتی ٹٹا سے کہا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو انہیں چھٹی دے دوں۔“

”نہیں طبیعت تو ٹھیک ہے، بس ذرا تھک گئی ہوں۔“

”راحیل بھائی آئے ہوئے ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”کراچی سے کب آئے؟“

”چتا نہیں کب آئے اندر حسام کے پاس بیٹھتی۔ وی دیکھ رہے ہیں۔“

”اچھا تم لڑکیوں کو باہر بھیجو، میں راحیل سے مل کر آتی ہیں۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور یوں ہی منگے پاؤں..... ڈرائیونگ روم کی طرف چل پڑی۔ ایڑیاں یوں دکھ رہی تھیں جیسے سارا دن چلتی رہی ہو۔

”راحیل!“

اس نے حسام کے قریب بیٹھے کچھ سوچتے ہوئے راحیل کو پکارا۔

”تم کراچی سے آگئے۔“

”ہاں!“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”اچھا حسام چلتا ہوں۔“

”راحیل!“ اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

”یہ اتنے اجنبی کیوں بن رہے ہو۔“

راحیل نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ کتنی تھکی تھکی اور مضطرب لگ رہی تھی۔

”راحیل! اماں نے تمہیں بتایا ہے کچھ وہ۔“

مگر راجیل اس کی بات سنے بغیر باہر نکل گیا تھا۔

”یہ راجیل کو کیا ہو گیا ہے۔“

وہ لمحہ بھر یو نہی کھڑی سوچتی رہی۔

”ضرور مجھ سے خفا ہے۔“

”راجیل! مجھ سے خفا ہو۔“

وہ اس کے پیچھے لپکی، لیکن وہ اسے ..... قطعی نظر انداز کیے برآمدے میں کھڑی مہک سے باتیں کر رہا تھا۔ مہک کتنی خوش اور شگفتہ لگ رہی تھی۔

کوئی بچھتاوا۔

کوئی ندامت۔

کوئی شرمندگی اس کے چہرے پر نہیں تھی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھ گئی اور راجیل شاید مہک کو خدا حافظ کہہ کر تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆☆☆

کتنے بہت سارے دنوں سے وہ خود میں الجھی ہوئی تھی۔ مہک کی وجہ سے پریشان تھی۔ ماموں کے گھر بھی نہ جاسکی تھی اور پھر کراچی جانے سے پہلے بھی وہ راجیل سے نہ مل سکی تھی۔ حالانکہ عقیل اسے لینے آیا تھا تو اس نے بتایا بھی تھا کہ راجیل کراچی جا رہا ہے۔ لیکن وہ عقیل کے ساتھ جانے کے بجائے بہت دیر سے گئی تھی اور راجیل جا چکا تھا۔ یقیناً وہ اسی بات پر خفا ہوگا۔ چلوکل یونیورسٹی سے سیدھی ادھر ہی چلی جاؤں گی۔ کامل کے گھر بھی تو جانا ہے۔ راجیل کو بھی منالوں گی۔ اور راجیل زیادہ دیر تو مجھ سے خفا رہی نہیں سکتا۔ وہ تخت پر آکر بیٹھ گئی اور تینوں لڑکیوں کو کتابیں کھولنے کے لیے کہا۔

”کوشی آبا، آپ کو پتا ہے، وہ عمار بھائی نے۔“

لڑکیوں کے جانے کے بعد ششی نے آکر بتایا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اماں بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھیں اور ان کی آنکھیں نم

ہو رہی تھیں۔

”حوصلہ رکھیں اماں!“

اس نے ہولے سے ان کا ہاتھ دبا کر تسلی دی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں عمار بھائی سے ملی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اگر مہک اپنی جوتوں پر شرمندگی کا اظہار کر لے اور مقررہ مدت سے پہلے واپس پلٹ آئے تو۔“

”وہ واپس پلٹنے کے لیے نہیں آئی کوشی۔“

انہوں نے سسکی لی۔

”پتا نہیں اس کے دل میں کیا ہے۔“

”نہیں اماں! دو چار روز میں خود ہی انہیں احساس ہو جائے گا کہ وہ غلط کر رہی ہیں یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے اماں کوئی لڑکی خوشی سے طلاق نہیں لیتی۔ آپا نے یو نہی دھمکی دی ہوگی، عمار بھائی کو اور عمار بھائی نے۔ لیکن اماں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ عمار بھائی بہت اچھے ہیں۔ وہ اب بھی سمجھوتے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن آپا کو بھی جھٹکنا پڑے گا۔ آپ انہیں سمجھائیں۔ عمار بھائی اپنے گھر والوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ صالحہ بیمار ہے اور خالد ابھی پڑھ رہا ہے۔ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہے گا۔“

”ارے پروہ سمجھے تو۔“

وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آپ سمجھائیں گی تو وہ ضرور سمجھ جائیں گی۔ اب وہ اتنی بھی بے وقوف نہیں ہیں کہ اپنا برا بھلا نہ سوچ سکیں۔“

اور یہ تو مہک کے دل کو ہی خبر تھی کہ اس نے اپنا برا بھلا سوچا تھا اور بہت اچھی طرح سوچا تھا۔ عمار کے ساتھ زندگی گزارنے میں اسے کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ صالحہ دل کی مریض ہے۔ اس کی کمائی کا بیشتر حصہ تو صالحہ کی دوائیوں پر ہی خرچ ہو جاتا تھا۔ وہ ابھی بہت عرصہ تک اسے اس کی من پسند زندگی نہیں دے سکتا تھا اور پھر کیوں نہ اس سے دامن چھڑا کر کسی اور کا دامن تھام لے، کسی ایسے شخص کا جو اسے زندگی کی وہ ساری سہولتیں مہیا کر سکے جس کی تمنا اس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ اور وہ شخص راجیل بھی ہو سکتا تھا۔

خوشحال، خوش شکل، ذاتی گاڑی، اچھا گھر، وہ اس قابل تھا کہ اس کے لیے الگ گھر

لے سکے۔ اسے سیر و تفریح کے لیے باہر لے جاسکے۔ اس کے ساتھ کوئی مجبوری نہ تھی۔  
دلدار ماموں کا اپنا بزنس ٹھیک ٹھاک تھا اور ابھی پچھلے دنوں ہی انہوں نے علامہ اقبال  
ٹاؤن میں دو کتال کے دو پلاٹ خریدے تھے۔ راجیل اور ٹکیل کے لیے۔ راجیل اس کے  
خوابوں کی تعبیر اسے دے سکتا تھا۔ حالانکہ بچپن میں وہ اسے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔  
اور اس نے تو طلاق کا نوٹس ملنے کے بعد چپکے سے پی۔ سی۔ او سے عمار کو فون کر کے  
اس کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔

”اگر تم تینوں طلاقیں اکٹھی بھیج دیتے تو میں زیادہ خوش ہوتی۔“

اور عمار نے جواب دیئے بغیر فون رکھ دیا تھا۔

وہ بہت خوش تھی اور اس بات کی اسے کوئی پروا نہیں تھی کہ طلاق سے کتنی بدنامی ہو  
گی۔ بہنوں کے مستقبل پر کتنا برا اثر پڑے گا۔ اماں کو کتنا دکھ ہو گا۔ اسے صرف اپنی ذات سے  
محبت تھی اور وہ صرف اپنے لیے سوچتی تھی اور اپنے فائدے کے لیے۔ اگر اسے پورے گھر  
سے کتنا پڑتا تو وہ سب کو چھوڑ سکتی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی بے حس اور خود غرض۔ سو کسی کے  
سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”مجھے عمار کے ساتھ نہیں رہنا۔“ یہ اس کا حتمی فیصلہ تھا۔

”چاہے کچھ ہو جائے۔“

”وہ نہیں مانتیں عمار بھائی۔“

اس سے مایوس ہو کر وہ پھر عمار کے دفتر چلی آئی۔

”تو۔“

”آپ ہی مان جائیں پلیز۔ آپ دوسری طلاق مت بھجوائیں۔“ ایک ماہ کی مدت ختم  
ہونے والی تھی اور رشک بہت پریشان تھی۔ ڈور ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی اور وہ کچھ بھی  
نہیں کر سکتی تھی۔

”اس سے کیا فائدہ ہو گا کوشی۔“ عمار بے حد اس تھا۔

”فائدہ!“ اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

”پتا نہیں عمار بھائی!“ اس نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا، میں کیا کروں۔ اور اس ہونی کو کیسے روک دوں بس آپ  
طلاق مت بھجوائیں ایک سال، دو سال، تین سال وہ بیٹھی رہیں گھر، مت بلائیں آپ انہیں۔  
کبھی تو انہیں سمجھ آئے گی کبھی تو وہ جان پائیں گی کہ وہ غلط ہیں۔“

”اور میں خلاؤں میں لٹکا ہوں تم چاہتی ہو، میں اس بیماری کو مستقل پالے رکھوں۔“

”پلیز عمار بھائی! میرے لیے، میری خاطر آپ نے مجھے بہن کہا تھا۔ آپ کو یاد ہے نا۔“

کیا آپ ایک بہن کی بات نہیں مانتیں گے۔“

”اچھا!“ عمار نے ہتھیار پھینک دیئے۔

”لیکن میں جانتا ہوں، اس سب کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ سب بے سود ہے کوشی

تمہاری یہ ساری کوشش۔“

”تھینک یو عمار بھائی!“ وہ آنسوؤں میں مسکرائی۔

”مجھے یقین ہے، آپ سنبھل جائیں گی۔“

”خدا تمہارے یقین کو قائم رکھے۔“

عمار نے پورے خلوص سے دعا کی اور جب وہ آفس سے باہر نکلی تو اس کے دل پر پڑا

بوجھ کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔

یہ پچھلا ایک ماہ اس نے کتنی اذیت میں کاٹا تھا۔ ہر لمحہ یہ احساس سولی کی طرح اس کے

سر پر ایسا بوجھ تھا کہ بس ابھی ایک ماہ ختم ہو جائے گا اور پھر دوسری طلاق اور پھر تیسری اور پھر

والپس کی وہی راہ نہیں رہے گی۔ اور وہ سوتے سوتے جاگ اٹھتی۔

یا اللہ آپا کو سمجھا دے، انہیں احساس ہو جائے کہ گھر اس طرح نہیں توڑے جاتے۔

اور ابا! ابانے کہا تھا کہ ممک کی مرضی کے خلاف کبھی کچھ نہ کرنا۔ اس کی ہر بات ماننا۔

”سوری ابا!“

اس نے دل ہی دل میں ابا کی روح سے معذرت چاہی۔ ”میں آپا کی یہ بات نہیں مان

سکتی۔ اس لیے کہ آپا نہیں جانتیں کہ وہ غلط ضد کر رہی ہیں۔“

اس نے ریگیتی ہوئی بس کاڈنڈا پکڑا اور چڑھ گئی۔

”ارے یہ بس۔“

اور یہ جو اتنا بوجھ دھرا تھا اس کے دل پر شاید اس لیے تھا کہ راحیل نے اسے نظر انداز کر رکھا تھا اور اسے کیسے پتا چلے کہ راحیل کو کیا ہوا ہے کیا کراچی میں اس کے ساتھ کچھ حادثہ ہو گیا ہے۔ اس کو بھی تو کئی پریشانی ہو سکتی ہے۔ کوئی آفس کا پرابلم۔ اور میں نے بھی تو نہیں پوچھا کبھی کہ اسے کیا مسئلہ ہے۔ وہ جو میرے پرائمز کو شیئر کرتا ہے تو میرا فرض بھی تو بنتا ہے کہ میں اس سے اس کی الجھن کا سبب پوچھوں۔ یقیناً اسے کوئی الجھن ہے، ورنہ وہ ایسا تو نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے میں آج اس کے آفس سے آنے کا انتظار کروں گی، اس سے پوچھوں گی۔“  
اس نے مطمئن ہو کر سوچا۔  
”سمن آباد، سمن آباد۔“  
کنڈیکٹر نے آواز لگائی تو وہ بیک سنبھالتی ہوئی نیچے اتر گئی۔  
”اور کامل۔“

کامل سے ابھی تک اس نے تعزیت نہیں کی تھی۔ سڑک کر اس کرتے ہوئے اس نے سوچا۔  
اور یہ ذرا سافا صلے پر ہی تو اس کا گھر تھا اور وہ ان دنوں یونیورسٹی بھی نہیں آ رہا تھا اور اگر آیا بھی تھا تو اس نے دیکھا نہیں تھا۔  
کامل گھر پر ہی تھا اور اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔  
”آپ!“

”سوری کامل رضا!“ میں ابھی تک تعزیت نہیں کر سکی تھی آپ سے۔ دراصل میں۔  
میں خود کچھ پریشان تھی۔ نہیں بلکہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے موقعوں پر آدمی کیا کہے۔ درحقیقت مجھے آپ کے بابا کا بہت دکھ ہوا تھا۔ میں نے ایک بار ہی انہیں دیکھا تھا اور وہ مجھے بہت اچھے لگے تھے، بہت مہربان اور شفیق بالکل اپنے ابا کی طرح۔“  
”آپ آئیں، پلیز اندر آجائیں۔“

کامل نے اسے راستہ دیا۔  
اس کی سیاہ آنکھیں ابھی تک حیرانی سے اسے تک رہی تھیں۔

وہ بے خیالی میں غلط بس پر بیٹھ گئی تھی۔  
چلو، اگلے اسٹاپ پر اتر جاؤں گی۔  
اس نے سوچا اور بیٹھ گئی۔ شکر ہے آج رش نہیں تھا۔  
”توبہ صبح صبح ہی گرمی پڑ گئی ہے۔“ ساتھ بیٹھی خاتون نے موسم پر تبصرہ کیا۔  
”جی!“ اس نے مختصر آکھا اور بیک سے پیسے نکال کر کنڈکٹر کو دینے لگی۔  
”کہاں!“

اگلے اسٹاپ پر۔ اچھا چلو سمن آباد تک۔“  
اس نے سوچا سمن آباد اور کھیل، عقلیت کی خبر ہی لے لے۔ بہت دنوں سے ادھر نہیں گئی تھی۔ راحیل تو آفس میں ہو گا۔  
اور پتا نہیں راحیل کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے ہتھکڑیاں لپیٹ لیتے ہوئے سوچا۔ کتنا اجنبی اور بدلابد لاسا لگتا ہے۔

اس ایک ماہ کے دوران تین چار بار ہی تو اس کی راحیل سے ملاقات ہوئی تھی اور راحیل نے اس پر ذرا توجہ نہیں دی تھی۔ بس رسمی سی گفتگو۔ کتنا دل چاہا تھا اس کا کہ وہ راحیل سے دل کی باتیں کرے، مہک کے مسئلے پر اس سے گفتگو کرے، وہ اسے تسلی دے، دلا سادے۔  
اور وہ اس کے ہاتھوں میں منہ چھپا کر اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو دے۔ وہ اس کا دوست تھا اس کا غمگسار تھا۔ لیکن جانے اسے کیا ہو گیا۔ جب سے کراچی سے آیا تھا، اکھڑا اکھڑا لگ رہا تھا۔ ایک بار بھی تو اس نے اس سے نہیں پوچھا تھا۔  
”کوئی، تم کیسی ہو، اور تم پر کیا بیت رہی ہے؟“

ایک بار بھی تو تسلی نہیں دی تھی۔ ایک بار بھی تو نہیں کہا تھا کہ گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔  
اسکے پاس بیٹھ کر اس سے دل کی باتیں کر کے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا، جیسے اس کی رگوں میں کسی نے توانائی بھر دی ہو۔

اس کی رفاقت اس کے لیے گلو کوڑ کی طرح تھی۔ وہ ایک بار پھر سے تازہ دم ہو جاتی تھی۔

”خدا، خدیجہ ادا ہر آؤ۔“

اس نے آواز دی اور ڈرائیگ روم کی طرف اس کی راہنمائی کرنے لگا۔

”شکریہ ریشک!“ اس نے بیٹھتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”بس بابا کی زندگی ہی اتنی تھی اور تقدیر کے ساتھ بھلا کون لڑ سکتا ہے۔“

”خدیجہ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ انہیں سنگاپور لے جا رہے تھے۔“

”ہاں، میں نے سارا انتظام کر لیا تھا۔ لیکن بابا۔ نہیں جانا چاہتے تھے۔ وہ مجھے منع کرتے

تھے۔ اور کہتے تھے پیسہ ضائع نہ کروں۔ اور خدیجہ کے لیے اور اپنے لیے سنبھال کر رکھ لوں۔

میرے بابا کو ہم سب کا بہت خیال تھا۔ انہیں جانا تو تھا ہی۔ بس وہ جلدی چلے گئے تاکہ

تاکہ۔“

اور وہ بات ادھوری چھوڑ کر قالین کو دیکھنے لگا۔ اور ریشک کو یوں لگا جیسے اس کے پار

کھینے کے لیے کچھ نہیں ہے اور کیا بھی کیا جاسکتا ہے کسی بھی شدید غم میں تشفی بیکار ہے۔

محض لفظ اور کچھ نہیں۔ کامل کو جو دکھ پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے۔ یہ دکھ دکھائی نہیں دیتا

نظر نہیں آتا۔ لیکن محسوس ہوتا ہے۔ وہ ظاہر نہیں کرتا، مگر دکھ نے اندر ہی اندر اس کے

دل میں گہرا زخم لگایا ہے، جیسی تو اس کی رنگت اتنی سنو لاگنی ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے

ہیں۔

”آپ، آپ کو کیا پریشانی تھی ریشک؟“

کامل نے اس کے زرد چہرے اور تھکی تھکی آنکھوں کو دیکھا۔

”ہوں۔“ وہ چونکی

”کچھ نہیں۔ بس یونہی۔ یونہی۔ میں تو یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتی

ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔“

وہ مسکرائی اور خدیجہ کو دیکھنے لگی۔

سانولی سی رنگت کی عام سی لڑکی۔ مگر اپنے بھائی کی طرح ساد اول اور ہمدرد لگی تھی۔

اے، بہت دیر تک وہ وہاں بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی۔ خدیجہ اور کامل اپنے بابا کی باتیں

سناتے رہے۔ ان کی والدہ بھی اگنی تھیں۔

وہاں بیٹھ کر ان سے باتیں کرنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ سب اسے بہت اپنے اپنے

لگے۔ جیسے وہ برسوں سے انہیں جانتی ہو۔ اور دنیا اچھے لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔

یہ ہمیشہ اس کی سوچ تھی۔

اور یہ لوگ یہ تینوں کتنے مخلص ہمدرد اور اچھے لگے ہیں اے، منافقت اور ریاکاری سے

دور۔

”کبھی کبھی آیا کریں نا۔ آپ سے باتیں کرنا اچھا لگا ہے مجھے۔ اور آپ بھی بہت اچھی لگی

ہیں۔“

خدیجہ نے بڑے خلوص سے کہا۔

”یہاں میری کوئی دوست نہیں ہے۔ سارا دن گھر میں بور ہوتی ہوں۔“

”آپ پڑھتی نہیں ہیں؟“

”میں نے بی۔ اے کے بعد چھوڑ دیا تھا۔“

”آپ ایم۔ اے کیوں نہیں کر لیتیں۔“ اس نے مشورہ دیا۔

”بس دل نہیں چاہتا۔“

”آپ اپنے ماموں کے گھر آتی رہتی ہیں تو آیا کریں نا ادھر۔“

”اچھا آؤں گی۔“ اس نے وعدہ کیا۔

”اور آپ بھی آئیں کسی چھٹی والے دن ہمارے گھر۔ نا اور ند امیری دونوں چھوٹی

بہنیں بہت پیاری ہیں۔ آپ کو وہ اچھی لگیں گی۔ کامل آپ لائیں ان کو کسی دن۔“

وہ کھڑی ہو گئی۔

”ارے بیٹی بیٹھو کھانا کھا کر جانا۔“

”نہیں، بہت دیر ہو گئی ہے۔ ابھی ماموں کی طرف جاؤں گی۔“

”آپ یونیورسٹی نہیں گئیں؟“

کامل کھڑا ہو گیا۔

”نہیں، بس دل نہیں چاہتا تھا اور آپ۔“

”میں۔ میں بھی بس کبھی کبھی جاتا ہوں، اب تو فائنل ہو جائے گا اور۔“

وہ سب گیٹ تک اسے خدا حافظ کہنے آئے۔

راجیل ابھی ابھی گھر آیا تھا۔ شاید کھانا کھانے۔ کبھی کبھی اسے وقت ملتا تو وہ آجایا کرتا تھا۔ ممانی کو سلام کر کے اس کے پیچھے ہی اس کے کمرے میں گئی۔  
”راجیل! تمہیں کیا ہو گیا ہے مجھے دیکھ کر بھی تم کے نہیں۔“  
”میں تھکا ہوا تھا۔“

وہ بیڈ پر بیٹھ کر جو توتوں کے تے کھولنے لگا۔

”نہیں راجیل! کوئی اور بات ہے، تم مجھ سے خفا ہو کیا۔؟“

”نہیں۔“ اس کا چہرہ ابے تاثر تھا۔

”تو کیا تمہیں کوئی پریشانی ہے۔ کوئی آفس کا پرالیم ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے جھک کر میز پر سے اخبار اٹھا لیا۔ اور اسے دیکھنے لگا۔ وہ یونی دروازے میں کھڑی تھی۔

”راجیل تم۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم تو میرے بہت مہربان دوست تھے۔“

اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ مگر اس نے آنسوؤں کو پلکوں تک نہ آنے دیا اور چپ چاپ کھڑی ہونٹ کاٹتی رہی۔ کئی لمحے بے آواز گزر گئے۔ راجیل نے ایک بار بھی سر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا تھا۔

”راجیل! بلا خراب کردہ اندر چلی گئی۔“

”راجیل! میں نہیں مانتی کوئی بات ہے ضرور تمہارا یہ اجنبی رویہ۔“

”بڑی جلدی میرے رویے کا خیال آگیا تمہیں۔“

راجیل نے اخبار سے نظریں نہیں اٹھائیں۔

”نہیں تو میں تو بہت دنوں سے سوچ رہی تھی۔ کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ سوچ سوچ کر

تھک گئی تھی میں۔ راجیل ہم تو دوست تھے نا پھر تم۔“

”دوست تھے نا، ہیں تو نہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے تپ کر راجیل کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”پلیز راجیل! تم میری کسی بات پر خفا ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں سوری بولوں گی تم سے اور اگر

تمہیں کوئی اپنی پریشانی ہے تو بھی مجھے بتاؤ پلیز ہم دوست تھے، دوست ہیں ہمیشہ دوست رہیں گے۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ ہماری دوستی ہمیشہ س طرح رہے گی۔“

”کچھ نہیں ہو مجھے؟“

راجیل نے اس کا ہاتھ کندھے سے ہٹا دیا۔

”تم ابھی واپس جاؤ گے راجیل کھانے آؤں۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ممانی

نے پوچھا۔

”نہیں امی! میں چھٹی لے کر آیا ہوں اور کھانا دیر سے کھاؤں گا۔“

”اور تم کو شئی۔“

”نہیں مامی! میں اب بس گھر جاؤں گی۔ یونی آپ کی خیریت معلوم کرنے آئی تھی۔“

”اتنی گرمی میں واپس جاؤ گی شام کو چلی جانا۔“

”نہیں مامی! مجھے کچھ کام ہے اور پھر تین بجے تو مجھے ٹیوشن سینٹر جانا ہے۔“

”بہت کمزور ہو رہی ہو بیٹا! زیادہ نہ سوچا کرو۔ اللہ بہتری کرے گا۔“

”جی!“ وہ راجیل کے قریب سے ہٹ آئی تو راجیل نے ذرا سا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں کی سطح گیلی گیلی سی تھی۔

”اور پتا نہیں حقیقت کیا ہے۔“

راجیل نے نگاہیں جھکا لیں۔

”اچھا مامی، خدا حافظ۔“

”خدا حافظ بیٹا! ایک دو روز میں پھر لگاؤں گی۔ عمار نے دوسری طلاق تو نہیں

بھجوائی۔“

”نہیں۔“ اس نے ہونٹ کانٹے۔

”تمہارے ماموں کہہ رہے تھے کہ آج وہ عمار کی طرف جائیں گے، شاید سمجھوتے کی

کوئی صورت۔“

مامی اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اسے بتانے

☆☆☆☆☆



وہ یونیورسٹی سے نکلی تو اس کے سر میں سخت درد تھا اور اس پر بس کا انتظار۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے درد کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ خدا خدا کر کے بس آئی تو اس نے شکر کیا۔ گھر جا کر تھوڑی دیر آرام کروں گی، پھر نماز فریش ہو کر ٹیوشن سینٹر جاؤں گی۔ ابھی صرف ایک بجتا تھا اور اس کے پاس پورے دو گھنٹے تھے۔ مگر آرام اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔ اماں اتنی گرمی میں باہر تخت پوش پر بیٹھی تھیں اور ان کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

ندا ان کے پاس ہی چپ بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی سرخ تھیں۔ شاید وہ بھی روتی رہی تھی۔ ٹاؤر حمام تو اسکول میں ہوں گے۔ ندا آج شاید اسکول نہیں گئی تھی اور مہک، مہک ہاں ہے۔

”کیا ہوا اماں؟“

وہ کچھ نہ بولیں۔ البتہ ان کی آنکھوں سے آنسو برس پڑے۔

”اماں پلزیز کیا ہوا۔ مہک آپا تو ٹھیک ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، ندا تم ہی کچھ

بتاؤ۔

”عمار بھائی نے دوسری طلاق بھجوا دی ہے۔“

”نہیں۔“ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔

”عمار بھائی ایسا نہیں کر سکتے انہوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے،

میں ابھی پوچھتی ہوں ان سے، انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

وہ وہیں سے ہلٹ پڑی۔

”سنو۔ کوئی کہاں جا رہی ہو، کیا فائدہ کچھ پوچھنے کا۔“

”نہیں اماں! میں ایک بار تو ضرور پوچھوں گی۔“

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

”ارے دم تو لینے دیا ہوتا ہے، تھکی ہوئی آئی تھی۔“

انہوں نے ندا سے کہا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

عمار بے حد شرمندہ تھا۔

”سوری کو شی! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا اور میں اپنے وعدے پر قائم بھی تھا لیکن وہ جھڑی بہن، وہ پچھلے تین دن سے مسلسل مجھے فون کر کے ایسی باتیں کرتی تھی کہ میری غیرت اسے گوارا نہ کر سکی اس کا کہنا تھا کہ ابھی تک میں نے اسے دوسری طلاق کیوں نہیں بھجوائی۔“

”تو، تو آپا نے۔“

اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہاں، اس کی باتوں نے مجھے مشتعل کر دیا تھا، میں تم سے بہت شرمندہ ہوں کو شی!“

”کوئی بات نہیں عمار بھائی! آپ بھی آخر کیا کرتے۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”میں بہت پریشان تھا۔ ایک تو صالحہ کی طبیعت ان دنوں بہت خراب رہنے لگی ہے اور

اس پر مہک نے باتیں ہی ایسی کیں کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔“

”اب کوئی صورت ہو سکتی ہے۔“

اس نے پر امید نظروں سے عمار کی طرف دیکھا۔

”ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے۔ اگر وہ ایک ماہ کے اندر اندر واپس آجائے تو۔“

”تو میں کوشش کروں گی۔ عمار بھائی کسی طرح کسی طرح انہیں منالوں۔“

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے آفس سے باہر نکل آئی۔

اور مہک آپا تو کبھی بھی نہیں مانیں گی اگر انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا ہے کہ انہیں عمار

سے طلاق لینے ہے تو وہ لے کر رہیں گی اور میری سازی کو شیشیں بیکار ہیں۔

”سمن آباد۔ سمن آباد۔“

وگین کا کنڈیکٹر اونچی آواز میں بول رہا تھا اور وگین آہستہ آہستہ ریگ رہی تھی۔

ہاں راجیل! راجیل سے کہتی ہوں شاید مہک اس کی بات مان لے آج کل وہ راجیل کے

کافی قریب ہے اور ٹا بھائی تو بتا رہی تھی کہ کبھی کبھی راجیل بھائی اس کے عدم موجودگی میں

آتے ہیں اور مہک آپا ان سے بہت خوش ہو کر ملتی ہیں۔

وہ وین میں سوار ہو گئی۔

راجیل یقیناً اس وقت آفس سے آچکا ہو گا۔ مگر مگر پتا نہیں وہ مجھ سے بات بھی کرے گا یا

نہیں۔ وہ تو مجھ سے خفا ہے کہ اس روز کے بعد پھر کبھی دکھائی ہی نہیں دیا اور وہ خود بھی تو اس روز کے بعد نہیں گئی تھی۔ وہ اتنا بدل گیا تھا کہ دل کو یقین ہی نہیں آتا۔ لاشعوری طور پر وہ اس کی منتظر رہتی تھی کہ کسی دن وہ آجائے گا اور کہے گا۔

”اوہو، سوری بھی، میں تم سے خفا نہیں رہ سکتا۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کوشی۔ بس اب ناراضگی ختم اور آئندہ خبردار تم مجھے ناراض نہ کرنا۔“ اور وہ اس سے ڈھیر سارے شکوے کرے گی اور اپنی ساری پریشانیاں اس کے ساتھ شیئر کرے گی اور اس کے ساتھ بہت سارا لڑے گی، مگر اتنے سارے دن گزر گئے تھے، وہ نہیں آیا تھا۔ کیا اس کے دل میں سے نرمی اور محبت رخصت ہو گئی تھی۔

وہ یونہی سوچتی رہی، اس کا اسٹاپ ابھی گیا۔

”اترو بی بی!“

اور وہ اتر آئی۔ ہمیشہ کی طرح عقیل، فکیل اور مامی سب ہی اسے دیکھ کر خوش ہوئے۔

”یہ کون سا وقت ہے گھر سے نکلنے کا عین دوپہر کے دو بجے۔“

عقیل نے اس سے پوچھا۔

”بس دل چاہا آگئے۔“

اس نے پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھے۔

”تم لوگ کیا کر رہے ہو۔“

”آرام کر رہے تھے۔“

”آپ بھی آئیں، اندر ہیں آجائیں۔“

اے۔ سی کی ٹھنڈک نے لمحہ بھر کے لیے اس کے اندر سکون اتار دیا اور اسے احساس ہوا کہ باہر واقعی بہت شدید گرمی ہے۔ عقیل اس کے لیے کولڈ ڈرنک لے آیا۔

”تم نے کیوں تکلیف کی عقیل۔“

”اب کیا کریں جب تک بیویاں نہیں آجائیں یہ تکلیف ہمیں ہی کرنا ہے۔“

”امی! عقیل کی شادی کر دیں آپ بے چارہ ہر وقت روتا رہتا ہے۔“

فکیل نے شرارت سے اسے دیکھا۔

”پہلے تو اپنے راجیل کی دلہن لاؤں گی۔“

انہوں نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”تو پھر جلدی لائیں راجیل بھائی تو کمب کے برسر روزگار ہو گئے۔“

”ہاں تو اور کیا سال دو سال تو دلہن تلاش کرنے میں لگ جائیں گے۔“

عقیل بھی شرارت کے موڈ میں تھا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے تلاش کرنے کی۔ میں نے اپنے راجیل کی دلہن تلاش کر رکھی

ہے۔ تم اپنے لیے ڈھونڈ لو۔“

وہ مسکرائیں لیکن اس کا ذہن الجھا ہوا تادمہ ان کی باتوں سے محظوظ نہیں ہو رہی تھی۔

مامی کا اشارہ اس نے سمجھ لیا تھا لیکن دل میں خوشی کی کوئی رمت نہیں اٹھی تھی۔

پتا نہیں۔ پتا نہیں مامی جیسا سوچ رہی ہیں ویسا ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے

کہ کوئی اور لڑکی۔ ہاں کوئی اور لڑکی اس کی زندگی میں داخل ہو چکی ہو۔ جیسی تو۔ ورنہ وہ اتنے

دن تک مجھ سے خفا نہیں رہ سکتا تھا اور اگر ایسا تھا بھی تو اسے مجھ سے کہہ دینا چاہئے تھا۔ اس

طرح یوں بغیر بتائے دامن چھڑا لینا تو صحیح نہیں تھا۔ کیا وہ نہیں جانتا کیا اسے خبر نہیں ہے کہ

میں، میں تو اس کی کسی کی بھی چھوٹی سی خوشی کے لیے اپنی بڑی سے بڑی خوشی قربان کر سکتی

ہوں۔ وہ مجھ سے کتنا توانہادوست تو سمجھتا۔

”یہ تو گئیں۔“

فکیل نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

”چلو ہٹو۔ میری بیٹی کو تنگ نہیں کرو۔ تھکی ہوئی آئی ہوگی۔ لیٹ جاؤ بیٹا! تھوڑی دیر

آرام کر لو۔“

انہوں نے تکیہ اس کی طرف بڑھایا۔

”مگر ابھی آدھ گھنٹے تک مجھے واپس جانا ہے۔ آپ کو پتا تو ہے تین بجے مجھے۔“

”آدھ گھنٹہ تو آرام کر لو۔“

”اچھا!“ اس نے نرم ملائم تکیے پر سر رکھا تو خود بخود آنکھیں بند ہونے لگیں وہ اندر سے

کتی تھکی ہوئی تھی، ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے اور اگر اس سارے عرصہ میں راجیل

اس کے ساتھ ہوتا اپنی باتوں سے اسے حوصلہ دینے رکھتا تو شاید وہ اتنا نہ تھکتی۔

”راہیل آفس سے آیا ہے۔“

اس نے بند ہوتی آنکھوں کو کھولا۔

”وہ تو آج آفس گئے ہی نہیں تھے۔ انہیں فلو ہو رہا ہے۔“

”اچھا!“ وہ اٹھ بیٹھی۔

”مامی! آپ کو بتاؤں، عمار بھائی نے دوسری طلاق بھجوا دی ہے اور۔ اور میں آج اسی لیے آئی تھی کہ راہیل سے کہوں، وہ ممک آپا کو سمجھائیں شاید وہ ان کی بات مان لیں شاید وہ سمجھوتے پر تیار ہو جائیں۔“

”افسوس۔“ مامی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”مامی! میں جاؤں راہیل کے پاس، وہ سو تو نہیں رہا ہوگا۔“

”نہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو جاگ رہے تھے۔“

عقیل نے بتایا تو وہ دوپٹہ درست کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

راہیل اپنے بیڈ پر بیٹھا کچھ فائلیں چیک کر رہا تھا۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے راہیل؟“

”ٹھیک ہوں تم کب آئی ہو؟“

”خلاف توقع راہیل کے لیے میں نرمی تھی۔“

”ابھی کچھ دیر پہلے۔“

وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی اس کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ راہیل نے سر

اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ بے حد تھکی تھکی مضطرب اور نڈھال لگ رہی تھی۔

”راہیل!“ اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

”تم مجھ سے خفا ہونا۔ میں جانتی ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ مجھ سے ایسی کون سی ناقابل

معافی غلطی ہو گئی ہے کہ تم، تم مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ لیکن میں پھر بھی

تمہارے پاس چلی آئی ہوں اس یقین کے ساتھ کہ تم میری مدد ضرور کرو گے۔“

”کو، کیا پرالم ہے۔“

راہیل نے فائل بند کر دی اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”وہ۔“ اس نے لمحہ بھر کے لیے نظریں اٹھا کر راہیل کو دیکھا دونوں کی نظریں ملیں

ریشک نے فوراً اپنی نگاہیں جھکا لیں اور راہیل کا دل دکھی سا ہو گیا۔

یہ لڑکی اسے اس نے چاہا تھا۔ اپنے دل کی تمام تر گمراہیوں کے ساتھ اور اب بھی، اب

بھی شاید وہ اس طرح اسے چاہتا تھا۔ یہ تو محض بدگمانی کے بادل تھے، جو اس کے دل پر چھا

گئے تھے اور بٹنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ اسے یوں نڈھال دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھا۔

”عمار بھائی نے دوسری طلاق بھیج دی ہے۔“

”تو یہ تو ہونا ہی تھا جب پہلی بھیجی تھی تو دوسری بھی۔“

”نہیں، یہ نہیں ہونا تھا، عمار بھائی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔“

چاہے کتنا عرصہ بیت جائے۔ کبھی تو، کبھی تو ممک آپا کو سمجھ آئے گی۔ مگر ممک آپا نے انہیں

مجبور کر دیا۔ بار بار تقاضا کر کے۔“

وہ ایک ہی سانس میں یونہی بولتی چلی گئی۔

”تم راہیل پلیز، تم آپا کو سمجھاؤ وہ واپس پلٹ جائیں صالحہ نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ عمار

کو منالے گی کہ وہ آپا کو الگ گھر میں رکھے، لیکن راہیل تم خود سوچو، یہ ظلم ہے عمار بھائی پر،

اور ان کے بہن بھائیوں پر، پھر بھی اس عذاب سے بچنے کے لیے یہ ظلم۔“

اس کی آواز رندہ گئی۔

اور یہ نازک سی معصوم لڑکی۔

راہیل کا دل چاہا، وہ اٹھ کر اس کے ان نظریں آنے والے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے

پونچھ دے۔ اسے تسلی دے۔ وہ عجیب تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ ممک کہتی تھی کہ عمار کو شکی کو

پسند کرتا ہے اور کو شکی بھی عمار کی تعریفیں کرتی ہے اور عمار اس لیے اس کے ساتھ سمجھوتا

نہیں کرتا۔ اس کی بات نہیں مانتا کہ وہ کو شکی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور خود اس نے کو شکی کو

عمار کے دفتر میں دیکھا تھا۔ وہ اس سے ملتی رہتی تھی باوجود اس کے کہ اس نے اس کی بہن کو

طلاق بھجوا دی تھی۔ اور اب کو شکی کہہ رہی تھی کہ وہ ممک کو سمجھائے کہ وہ صلح کر لے پلٹ

جائے۔

پتا نہیں سچ کیا ہے اور حقیقت کیا ہے۔  
 کبھی کبھی آنکھیں وہ کچھ دیکھتی ہیں جو سچ نہیں ہوتا۔ اور کبھی کبھی دکھائی نہیں پڑتا۔  
 ”راجیل پلیز، تم سمجھاؤ گے نامک آپا کو، وہ اپنا گھر مت برباد کریں، یہ سب اچھا نہیں ہے راجیل۔“

”سمجھاؤں گا۔“ راجیل نے وعدہ کیا۔

”تھنک یو۔ تھنک یو راجیل۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ راجیل کا دل چاہا وہ اسے روک لے، متالے اور اتنے دنوں کا غبار نکال لے اس سے سب سچ کہہ دے، وہ سب جو نمک نے بتایا تھا اور وہ سب جو اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا اور اس سے کہہ کر۔

”کوشی میرے دل پر چھائے بدگمانی کے ان بادلوں کو ہٹا دو، میرا دم گھٹنے لگا ہے کوشی، حقیقت کیا ہے سچ کیا ہے، مجھ سے کہہ دو اور میرے دل پر دھرا بوجھ کم کر دو۔“

”سنو!“ وہ بے اختیار اسے پکار بیٹھا۔

ریشک نے مڑ کر دیکھا۔

”میں رات کو آؤں گا اور نمک سے بات کر دوں گا۔“

”شکریہ!“ اس نے پھر زیر لب کہا اور مامی کے کمرے میں جھانکا۔

”اچھا مامی! میں جا رہی ہوں۔“

”ٹھہرو، عقیل تمہیں چھوڑ آتا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

عقیل کھڑا ہو گیا۔

”کہاں جائیں گی ٹیوشن سینٹر؟“

”نہیں، پہلے گھر جاؤں گی۔ اماں کو فکر ہو گی اور تم اس گرمی میں تکلیف نہ کرو۔ میں چلی

جاؤں گی۔ اس وقت تو زرش بھی نہیں ہو گا۔“

”آہ۔ بڑا تکلف بڑا جا رہا ہے۔“

اس نے ٹیبل سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں۔

”اپنی ہونے والی بھابی کا اتنا خیال بھی ہم نہ کریں تو پھر۔۔۔۔۔“

اس نے تقریباً اس کے کان میں سرگوشی سی کی، مگر وہ مسکرائی نہیں۔ بس یونہی سر جھکائے اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔  
 ”خدا کرے نمک راجیل کی بات مان لے۔“

سارے رستے میں وہ زیر لب دعا مانگتی رہی۔ عقیل پتا نہیں اپنی دھن میں کیا کیا کرتا جا رہا تھا اس نے دھیان سے کچھ بھی نہ سنا۔ بس یونہی ہوں ہاں کرتی رہی اور نمک کے لیے دعا مانگتی رہی۔

مگر۔

اس کی دعائیں در قبولیت تک نہ پہنچ سکیں۔

راجیل کا سمجھنا بے اثر رہا۔

اماں کے آنسو اسے مجبور نہ کر سکے۔

”آپ نے بہت تنگ کیا مجھے تو میں گھر چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں گی۔“

اس نے دھمکی دی اور اماں ڈر گئیں اس سے کچھ بعید بھی نہ تھا۔

جوان اور خوبصورت، گھر سے نکل کر جانے کن ہاتھوں میں پڑتی۔ اب گھر میں تو تھی۔

شاید اس کا نصیب یہی ہے۔

اماں نے دل پر پتھر رکھ کر نقد پر کا فیصلہ مان لیا۔

ایک ماہ کی مقررہ مدت گزر گئی۔

ریشک بے چین سی پورے گھر میں پھرتی رہی۔ ادھر سے ادھر، ایک کمرے سے

دوسرے کمرے میں۔ اب بھی، اب بھی اگر، ابھی ڈور کا ایک سراہا تھا میں ہے۔

”نمک آپا!“ اس نے جھنجکتے جھنجکتے پوچھا۔

”آپ نے عمار بھائی کے ساتھ اتنا عرصہ گزارا آپ کو دکھ نہیں ہو گا۔“

”کیوں کیا میں انسان نہیں ہوں۔“

نمک نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈائجسٹ نیچے رکھ دیا اور ریشک کو دیکھنے لگی۔

”تو پھر، تو پھر عمار بھائی سے صلح کر لیں۔“

”صلح کروں۔ بھولی لڑکی تمہارے عمار بھائی مجھے دو طلاقیں بھیج چکے ہیں اور تیسری

آج کل میں آنے والی ہوگی۔“

”لیکن، لیکن ایک صورت ہے آپ۔ میں نے کچھ دن ہوئے پڑھا تھا کہ اگر مقررہ مدت کے درمیان عورت رجوع نہ کرے اور ابھی مرد نے تیسری طلاق نہ ڈالی ہو اور عورت دلچسپ جانا چاہے تو دوبارہ نکاح ہوگا اور یہ دونوں طلاقیں باقی رہیں گی اور پھر جب کبھی مرد نے ایک طلاق کہی تو تین طلاقیں۔“

”یہ تو کدو کوئی۔ اتنا مزے کا افسانہ پڑھ رہی تھی اور اب تم میرے اور عمار کے متعلق سوچنا شروع کر دو۔ میں بچی نہیں ہوں۔ اپنے لیے بہتر سوچ سکتی ہوں اور اگر تمہیں عمار کی فکر ہے تو بوجہا کر اسے تسلی دو مجھے نہ واپس جانا ہے اور نہ۔“

وہ ہر سنت کا تھی ہوئی اس کے پاس سے اٹھ آئی اور اماں کی گود میں سر رکھ کر بے تحاشا روئی۔

چند دن بعد تیسری طلاق آگئی۔

”چلو زندگی کا ایک باب ختم ہوا۔“

وہ ایک بے انتہا اچھا شخص جو ہمک کے حوالے سے اس گھر میں داخل ہوا تھا اس سے ہمیشہ کے لیے ہر تعلق ٹوٹ گیا تھا۔ سارے گھر پر بے انتہا افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ کسی کا کچھ کھانے پکانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ حسام بھی بے حد خاموشی سے ایک طرف بیٹھا اپنا ہوم ورک کر رہا تھا۔ ند اور ثنا کی آنکھوں میں بار بار آنسو آجاتے تھے۔ اماں ایک طرف چپ لیٹی تھیں اور وہ اماں کے پٹنگ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔

اس گھر کا ہر فرد بے چین اور مضطرب تھا۔

سوائے ہمک کے جو بے حد مطمئن اور پرسکون سی ایک طرف بیٹھی فیشن میگزین سے جو وہ پڑوس سے مانگ کر لائی تھی، ڈیزائن دیکھ رہی تھی۔

اس سکوت کو ممانی اور راجیل کی آمد نے توڑا۔

”جو ہوا، برا ہوا۔“

انہوں نے اماں کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”لیکن شاید تقدیر میں یہی لکھا تھا۔“

اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”ہاں اس کی تقدیر ہی خراب تھی۔“

انہوں نے ٹھنڈا سانس لیا۔

”راجیل کے ابو تو عمار کے خاندان کی بہت تعریف کرتے تھے۔“

ممانی نے کسی قدر شرمندگی سے کہا۔

”انہوں نے تو اپنی طرف سے اچھا کیا تھا۔ لیکن وہ تم سے بہت شرمندہ ہیں۔“

”نہیں، نہیں بھلا اس میں دلدار بھائی کا کیا قصور ہے۔ ہماری تقدیر ہی بری تھی جو نباہ نہ ہو سکا۔“

”وہ سب لوگ تو۔“

رشک نے ہمک کی طرف دیکھا جس نے اب میگزین بند کر دیا تھا اور راجیل کی طرف

دیکھ رہی تھی۔ جو حسام کی ہوم ورک کی کاپی دیکھ رہا تھا۔

”وہ سب لوگ تو بہت اچھے تھے ماما۔ صالحہ، کلثوم خالد، بہت پیار کرے والے لوگ

تھے۔ اور عمار بھائی بھی بہت اچھے تھے۔ بس آپا کا نصیب۔“ رشک نے تاسف سے ہاتھ ملے۔

”ہاں ہاں، وہ سب بہت اچھے تھے، میں ہی بری تھی، بری ہوں۔“

ہمک نے غصہ سے میگزین فرش پر پینچ دیا۔

”تم ان کی تعریف نہیں کرو گی تو اور کون کرے گا۔ عمار بھی تو ہر وقت تمہارے ہی

گن گاتا رہتا تھا۔ کوشی ایسی ہے، کوشی ویسی ہے۔ ہاں میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ کوئی

بھی عورت برداشت نہیں کر سکتی۔ اور کس کا دل چاہتا ہے اپنا گھر اجاڑنے کو، اور تم جو بھاگ

بھاگ کر جاتی تھیں، کبھی صالحہ کی مزاج پر سی کو، کبھی میری خبر لینے کے بہانے اور کبھی۔“

”نہیں۔“ رشک نے ہاتھ اوپر اٹھایا اور کہنا چاہا۔

”خدا کے لیے اتنے بڑے بڑے جھوٹ مت بولو۔“

لیکن آواز اس کے حلق میں ہی پھنس گئی۔ راجیل کبھی اس کی طرف دیکھتا تھا کبھی ہمک

کی طرف، جو مسلسل بولے چلی جا رہی تھی۔

”وہ سب صرف تمہارے لیے اچھے تھے میرے لیے نہیں۔ اس لیے عمار صرف

پالن کے گھر کے کسی فرد کا ذکر نہیں ہوا تھا۔ عمار نے حق مہر کی رقم اور مہک کا جہیز خود ہی گھر  
جھپوایا تھا اور اس روز کے بعد سے اس کی عمار سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

وہ تعلق وہر شہ ہی ٹوٹ گیا تھا جس ناتے وہ عمار سے ملتی تھی۔

ہاں کبھی کبھی اسے عمار کا خیال ضرور آتا صالحہ اور کلثوم کے لیے بھی وہ سوچتی۔ کتنی  
پیاری اور محبت کرنے والی لڑکیاں تھیں۔ مہک کے ناروا سلوک کے باوجود چاہتی تھیں کہ ان  
کے بھائی کا گھر بسا رہے اور راجیل، راجیل کو تو وہ ہر لمحہ سوچتی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے راجیل  
سے باتیں کیے صدیاں بیت گئی ہوں، کیسی اجنبیت در آئی تھی ان کے درمیان کبھی آتنا سامنا  
ہو بھی جاتا تو رسمی سی بات ہوتی، خدا یا کیا کروں، کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ راجیل سے کہے کہ  
مہک نے جو کچھ کہا تھا سب جھوٹ تھا۔ اس میں کہیں کوئی کچھ سچ نہ تھا اور یہ کہ وہ اس کی  
بے اعتنائی برداشت نہیں کر سکتی، کسی روز اس کا دماغ پھٹ جائے گا مگر وہ صرف سوچ کر رہ  
جاتی تھی۔

راجیل اگر چلا جاتا۔ اسے خبر بھی نہ ہوتی دلدار ماموں کے ہاں جاتی، تب بھی سوچتی رہ  
جاتی اور واپس آنے کا وقت ہو جاتا اور شاید وہ راجیل سے کبھی بات نہ کر سکے گی اور شاید یہ  
فاصلے کبھی ختم نہ ہونگے جو خود بخود پیدا ہو گئے ہیں۔ پتا نہیں کیوں۔

وہ تو ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھتے تھے، انہیں تو ایک دوسرے سے کچھ کہنے کی  
ضرورت ہی نہ تھی، پھر۔

”آج سردی کافی ہے۔“ سیرانے کتاب بند کرتے ہوئے کہا تو وہ چوکی۔

”ہاں، شاید بارش بھی ہوگی۔“

اس نے کھلے دروازے سے باہر جھانکا۔

اس وقت وہ دونوں لائبریری میں بیٹھی تھیں کچھ اور طلبا بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ امتحان  
نزدیک ہونے کی وجہ سے لائبریری میں معمول کے مقابلے میں زیادہ لوگ تھے۔ وہ کچھ  
غیر درسی نوٹس بنانے آئی تھی۔ لیکن ایک لفظ بھی نہ لکھ پائی تھی۔

”میرے خیال میں اب چلنا چاہیے۔ بارش ہو گئی تو پھر مشکل ہو جائے گی۔“

سیرا کھڑی ہو گئی۔

تمہاری تعریف کرتا تھا۔“

اور پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

اور کچھ لوگ کس طرح جھوٹے آنسو بہا لیتے ہیں۔ اور اس کی آنکھیں تو شدت غم سے  
خشک ہو گئی تھیں۔ ہونٹ لرز رہے تھے مگر آواز گھٹ گئی تھی۔

اماں بھی ساکت بیٹھی تھیں۔ انہوں نے بے بسی سے رشک کی طرف اور پھر سب کی  
طرف دیکھا اور مدھم آواز میں بولیں۔

”نہیں بیٹا! اس طرح مت کہو۔ کوشی تمہاری دشمن نہیں ہے نہ تھی، وہ تو تمہارا ابا  
گھر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ تو تم سے زیادہ دکھی ہے۔ تمہارے اجڑے پر..... رات سے اس نے  
کچھ نہیں کھایا۔“ لیکن وہ یونہی اونچی اونچی آواز میں روتی رہی۔

اور ابانے کہا تھا۔

”اس کا دل بہت چھوٹا ہے بیٹا! تم اپنا دل بڑا کرنا۔ کتنا بڑا ابا۔ کتنا بڑا دل کر لوں میرا دل  
تو پھٹ جائے گا۔“

اس نے سسکی لی اور بغیر اپنی صفائی میں ایک لفظ کے لرزتے قدموں سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆☆☆

فاسٹ ایگزام بالکل قریب تھے اور رشک کو لگتا جیسے اسے کچھ بھی نہ آتا ہو جیسے وہ یہ  
ایگزام کبھی نہ دے پائے گی۔ یہ چند ماہ بڑے اضطراب اور بے چینی کے عالم میں گزرے تھے۔  
بظاہر سب کچھ معمول پر آگیا تھا۔ ایک حادثہ ہو کر گزر گیا تھا۔ اماں بھی زیادہ تر خاموش ہی  
رہتی تھیں۔

مہک اپنے کمرے میں تھکی دن بھر رسالے پڑھتی اور کبھی کبھار شام کو دلدار ماموں  
کے ہاں باپڑوس میں اپنی کسی سہیلی کے ہاں چلی جاتی۔

اس کا وہی معمول تھا۔

یونیورسٹی گھر اور پھر شام تین بجے سے پانچ بجے تک ٹیوشن سنٹر اور ٹیوشن سنٹر  
واپس پر پچیاں اس کے پاس پڑھنے آ جاتیں۔ اس کے پاس وقت تھا ہی نہیں کہ وہ کچھ سوچتی  
اپنے لیے، اپنے متعلق مگر پھر بھی اس کا ذہن الجھا رہتا تھا۔ گھر میں اس روز کے بعد کبھی عمار؟

”ہاں، لیکن ابھی تھوڑا سا کام کرنا ہے۔ آج ٹیوشن سنٹر سے چھٹی لے لی تھی۔ یہ نوٹس مکمل کر کے ہی جاؤں گی۔“

”اچھا پھر خدا حافظ۔“

سمیرا چلی گئی تو اس نے خیالات کو ذہن سے جھٹک کر نوٹس بنانے کی کوشش کی۔ اسے شیکمیر کے ڈراموں پر تنقیدی نوٹ تیار کرنا تھا۔ وہ بہت دیر تک لکھتی رہی کاشی رہی۔

”رٹک، رٹک ماہ۔“

کسی نے بہت نرمی سے بالکل قریب سے آہنگی سے پکارا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ کامل رضا اب اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں مخصوص چمک تھی اور چہرے پر وہی جامد چپ۔

”کیسی ہیں آپ۔“

”فائن۔“ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”مگر فائن لگتی تو نہیں۔“

وہ اس کے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”کیا آپ کچھ بیمار ہی ہیں۔“

”نہیں، نہیں تو۔ آپ کیسے ہیں۔ کہاں رہے اتنا عرصہ نظر ہی نہیں آئے اور خدیجہ

کیسی ہیں۔ ماں جی تو اچھی ہیں۔“

”آپ نے ایک ہی سانس میں اتنے ذہیر سارے سوال کر ڈالے۔“

وہ مسکرایا تو اس کی آنکھوں میں اپنائیت کے جگنو سے چمکے۔

”میں ٹھیک ہوں۔“

”اور کہاں رہا تو کبھی کبھی کشمیر چلا جاتا تھا۔ یونیورسٹی بھی آتا رہا ہوں۔ اب امتحان سے فارغ ہو کر ہی جاؤں گا۔ خدیجہ اور ماں جی اچھی ہیں۔ خدیجہ آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ آپ پھر کبھی آئیں ہی نہیں۔“

”میں نے آپ سے کہا تھا کبھی خدیجہ کو لائیں۔ آپ لائے ہی نہیں۔ میرا نام ٹیبل

اصل کچھ ایسا ہے کہ وقت ہی نہیں بچتا۔ ورنہ ضرور جاتی۔“

”اور میں بھی زیادہ تر کشمیر میں رہا۔“

”آپ کشمیر کیوں جاتے ہیں۔“

”بس یونہی، مجھے کشمیر اچھا لگتا ہے۔“

”میرا بھی دل چاہتا ہے کبھی دیکھوں، میرے ابا کا تعلق بھی کشمیر سے ہی تھا۔“ رٹک نے بتایا۔

”آپ کی پڑھائی کیسی جارہی ہے؟“

”بس ٹھیک ہی ہے۔“

”ایم۔ اے کے بعد کیا ارادہ ہے۔“

”ظاہر ہے جاب کروں گی میرا ارادہ لیکچرر شپ کے لیے اپلائی کرنے کا ہے لیکن رڈلٹ سے پہلے کوئی بھی چھوٹی موٹی جاب مل گئی تو کر لوں گی۔ میں نے شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ کا کورس کیا ہوا ہے۔ اور میری رفتار بھی اچھی ہے۔“

اس نے تفصیل سے بتایا۔

اُسے کامل سے بات کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس شخص کا چہرہ کوئی تاثر نہیں دیتا تھا لیکن اس کی آنکھیں اپنائیت سے نکلتی تھیں یوں کہ دل چاہتا آدمی اپنے دل کا سارا بوجھ اس کے سامنے ہلا کر دے۔

”سوری میں تھل ہوا۔ آپ شاید کچھ نوٹس بنا رہی تھیں۔“

”نہیں بس اب گھر جانے ہی والی تھی۔ موسم بہت خراب ہو رہا ہے۔“

”چلیں اکٹھے چلتے ہیں۔ مجھے بھی ہاسپٹل جانا ہے۔“

”خیریت!“ فائل بند کر کے وہ کھڑی ہو گئی۔

”میری کزن ایڈمٹ ہے وہاں۔ بچپن سے ہی اس کے دل میں سوراخ تھے دو بار آپریٹن ہو سوراخ فل بھی کیے گئے۔ لیکن پچھلے کئی ماہ سے اسے ہارٹ کی تکلیف ہے۔ پندرہ لاکھ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔“

”اوہ!“ رٹک کو افسوس ہوا اور پتا نہیں کیوں اسے صالحہ کا خیال آگیا۔ اس کے دل میں

بھی سوراخ تھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی یہ لوگ اسے بھولتے کیوں نہیں تھے۔ حالانکہ اب کیا تعلق رہ گیا تھا۔ جو وہ انہیں یاد رکھتی۔“

”ریشک! ایک بات پوچھوں۔“

اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کامل رضائے آہستگی سے کہا۔

”پچھلے کئی ماہ سے جب بھی میں نے آپ کو دیکھا آپ بہت پریشان نظر آئیں کئی دفعہ تو یہاں باہر لان میں، میں نے آپ کو ارد گرد سے بالکل بے خبر بیٹھے دیکھا۔ ایک بار تو میں آپ کے پاس کھڑا ہاں لیکن آپ کو میری موجودگی کا علم ہی نہیں ہوا۔ کوئی بات ہے جس نے آپ کو اندر ہی اندر پریشان کر رکھا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ اپنا مسئلہ شیئر کر لیں۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی بھی کسی کا دکھ نہیں بانٹ سکتا۔ یہ محض باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن شاید آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔“

اس کی آنکھیں جھلکانے لگیں مگر وہ سر جھکائے اس کے ساتھ چلتی ہوئی اسٹاپ تک آئی۔ اسے خاموش دیکھ کر کامل نے پھر کہا۔

”میں آپ کی پریشانی جانے بغیر ایک بات آپ سے کہہ سکتا ہوں کہ جو پریشانی مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔ اسے آپ ٹال نہیں سکتیں، ہم لوگ زیادہ پریشان اس لیے ہوتے ہیں کہ ہم حقیقتوں کو قبول نہیں کرتے، اگر ہم حقیقتوں کو قبول کر لیں تو شاید کوئی دکھ ہمیں زیادہ بڑا نہ لگے ہمیں کسی حادثے پر اتنی زیادہ تکلیف نہ ہو، اذیت نہ ہو۔“

”حقیقت کو قبول کرنے کے باوجود بھی کسی حادثے کی اذیت اور تکلیف کم تو نہیں ہو سکتی۔“

اس نے ذرا کی ذرا انگا ہیں اٹھا کر کامل کی طرف دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”آپ بتائیں آپ اس حقیقت کو قبول کر چکے تھے کہ آپ کے بابا زیادہ دیر زندہ نہیں رہیں گے، تو پھر کیا، آپ کو ان کی موت کا دکھ نہیں ہوا۔“

کامل نے اعتراف کیا

”میں نے بھی حقیقت کو قبول کر لیا ہے لیکن اس حقیقت کا دکھ کم نہیں ہوتا۔“

”آپ کے ساتھ کیا ہوا ریشک پلیز مجھے اپنا دوست سمجھیں اور میرے خلوص پر یقین

رہیں۔“

”میرے ساتھ، میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔“

اس نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر..... بے بسی سے کامل کی طرف دیکھا۔

”پتا نہیں، میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔“

”مجھے اتنا پتا ہے کہ آپ کے والد کی ڈیڑھ ہو چکی ہے اور آپ گھر کی ذمہ داریاں ہیں۔

لیکن کچھ عرصہ پہلے تو آپ بہت بہادر نظر آ رہی تھیں۔ اب بھی اسی بہادری سے یہ ذمہ

داریاں سنبھالیں نا۔ کیا تھک گئی ہیں۔“

”نہیں، میں ذمہ داریوں سے تو نہیں تھکی۔“

”پھر؟“

”پھر، میری بہن کو طلاق ہو گئی ہے۔ اور اس حادثے کا دکھ میرے دل سے جاتا

نہیں۔“

”اوہ! بہت افسوس ہوا کیا آپ کو یہ خوف ہے کہ اس حادثے کا اثر آپ کی بہنوں کے

مستقبل پر بھی ہو گا۔“

”شاید میرے لاشعور میں یہ بھی ہو۔“

اس نے زیر لب کہا اور جاتے ہوئے رکشہ کو روکتے ہوئے سوچا۔

”اس سے ایک بڑا دکھ اور بھی ہے جو کاٹنا بن کر چبھتا رہتا ہے اور میں تمہیں کیا بتاؤں

کامل رضابت یہ دکھ سارے دکھوں سے بڑا ہے۔ راجیل کی بے اعتنائی کا دکھ۔“

اس کے بدل جانے کا دکھ

”واقعی بدل گیا تھا۔“

ابھی چند دن پہلے ہی تو اس نے اسے وہ رقم لوٹائی تھی، جو نیلم کے سیٹ کے لیے لی

تھی۔

”یہ کیا ہے؟“

اس نے لفافہ ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

”وہ ادھار جو ایک بار ایک دوست نے ایک دوست سے لیا تھا۔“



اس نے جھکی جھکی نظروں سے کہا تھا اور راجیل نے بنا کچھ کہے لفظ نہ لے کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔

”آپ تو۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کہاں جانا ہے صاحب؟“

رکشہ والے نے پوچھا۔

”پہلے گلبرگ کی طرف چلو، فردوس مارکیٹ کے پاس اتار دیتا۔ اور پھر سروسز ہسپتال

تک جانا ہے۔“

”آپ تو غالباً راجیل کی فانیسی ہیں اور آپ کے لیے تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں بنے گا۔“

”چتا نہیں کچھ مسئلہ ہے یا نہیں۔“

”سوری! میں آپ کے پرسنل معاملات میں دخل دے رہا ہوں۔“

اس نے معذرت کی اور سوچا۔

”کوئی بات ہے ضرور، جو اس بے حد دلکش اور پیاری لڑکی کو ڈسٹرب کیے ہوئے ہے۔“

طلاق والے حادثے سے بھی کوئی بڑی بات۔ یقیناً راجیل وہ نہیں اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

کسی کے جرم کی سزا کسی کو نہیں ملنا چاہیے۔“

”راجیل آج کل یہاں ہی ہے؟“

”ہاں شاید!“

”بہت مصروف ہو گیا ہے۔ خواجہ صاحب کے ہاں بھی نہیں آتا۔ پہلے تو بہت دلچسپی

لیتا تھا۔ ان کی تنظیم میں باقاعدہ ممبر نہیں تھا لیکن خواجہ صاحب اس کے مشوروں کو اہمیت

دیتے تھے۔“

وہ خاموش ہی رہی۔

اور پھر تمام راستے..... کوئی بات نہ ہوئی اور وہ فردوس مارکیٹ کے پاس اس کا شکریہ ادا

کر کے اتر گئی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اسے مہک کی ہنسی کی آواز آئی۔

”مہک ہر وقت کتنا خوش رہتی ہے اور کتنی مطمئن جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔“

اس نے سوچا۔

ڈرائیگ روم سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کوئی اور بھی تھا شاید، مگر کون۔

”کوشی آیا آگئیں۔“

ہمیشہ کی طرح ثناء نے کچن کی کھڑکی میں سے جھانک کر اسے دیکھا اور نہ جانے کسے

اطلاع دی شاید ندا کو۔ وہ کچن کی طرف ہی چلی آئی۔ دونوں مصروف تھیں۔ ثنا چائے بنا رہی

تھی اور ندا جلدی جلدی ٹرائی میں چائے کا سامان رکھ رہی تھی۔

”ندا! کون آیا ہے؟“

”آپ نے باہر راجیل بھائی کی گاڑی نہیں دیکھی۔“

”نہیں، شاید پیچھے کی طرف پارک کی ہو۔ راجیل آیا ہے؟“

”ہاں اور ماما بھی ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ وہیں چوکی پر بیٹھ گئی۔

”فنی! مجھے ایک کپ چائے دے دیتا۔“

”پتا ہے آیا!“ ثناء نے اس کی طرف چائے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ماما، راجیل بھائی کی شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔“

”اچھا!“ وہ بے دھیانی میں چائے کی پیالی کو دیکھ رہی تھی۔

”اور اماں نے کہا ہے کہ وہ آپ سے پوچھ کر بتائیں گی۔“

”مجھ سے پوچھ کر کیوں؟“ اس نے یونہی بے دھیانی سے کہا۔

”راجیل بھائی کی شادی آپ ہی سے تو ہونا ہے۔“

”مجھ سے۔“ اس نے پیالی زمین پر رکھ دی۔

”نہیں تو راجیل بھلا مجھ سے شادی کیوں کرے گا۔ وہ تو خفا ہے مجھ سے۔“ اس نے

سوچا۔

”اور شاید اس نے کسی اور لڑکی سے۔“

”آپ سے نہیں تو اور کس سے۔“

ثناء نے شوخی سے کہا۔ ندا بھی مسکراتی ہوئی ٹرائی لے کر چلی گئی۔

”نہیں شو! مجھے ابھی شادی نہیں کرنا۔ مجھے تو۔“  
 ”آپ کے امتحان کے بعد ہی شادی ہوگی، دراصل والدہ ارا ماموں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔“

”کیا ہوا! نہیں؟“

”انہیں ڈاکٹر نے انجانا بتایا ہے۔“

”اچھا۔“ اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔

”وہ چاہتے ہیں، راحیل بھائی کی خوشی وہ دیکھ لیں۔“

”خدا ماموں جان کو لمبی زندگی دے۔“

اس نے زیر لب دعا کی۔

”اور اگر میں نے شادی کر لی تو ان کا کیا ہو گا ان سب کا اور میں نے اب اسے وعدہ کیا تھا کہ۔“

وہ یونہی سوچتی رہی اور چائے ٹھنڈی ہو گئی۔

”کوئی آپا!“ ندانے کچن میں داخل ہوئے اسے آواز دی تو اس نے چونک کر سر

اٹھایا۔

”مامی آپ کا پوچھ رہی تھیں۔“

”اچھا۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

ممائی نے محبت سے اسے گلے لگایا۔

”بہت دنوں سے تم نے چکر نہیں لگایا بیٹی کیسی ہو اب؟“

”ٹھیک ہوں۔“ وہ ہولے سے بولی اور نگاہ اٹھا کر راحیل کی طرف دیکھا جو نہ جانے

مہک سے کیا کہہ رہا تھا اور مہک ہنسے جا رہی تھی۔ راحیل کی نگاہیں بھی اس سے ملیں۔ اس نے

سر کے اشارے سے سلام کیا۔ اور اماں کے پاس بیٹھ گئی۔

”بھئی، تم میری بیٹی کا خیال نہیں رکھتی ہو۔“

ممائی نے پیار بھری شکایت کی۔

”دیکھو تو رنگت کیسی ہو رہی ہے۔“

اماں نے بھی غور سے اسے دیکھا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے کوشی؟“

”جی اماں!“

”دودھ پیا کرو اتنی محنت کرتی ہو۔“

ممائی نے پھر نصیحت کی تو وہ مسکرا دی۔

بادل زور سے گر جا اور پھر یکدم بارش شروع ہو گئی۔

”ارے صحن میں کپڑے۔“

اماں نے کہا تو وہ کھڑی ہو گئی۔

”آپ بیٹھیں میں اتارتی ہوں۔“

وہ باہر آکر تار سے کپڑے اتارنے لگی اور کپڑے برآمدے میں بچھے تخت پوش پر ڈھیر کر کے وہ خود بھی وہیں بیٹھ گئی اور بارش کے قطروں کو ایک ترتیب سے گرتے ہوئے دیکھنے لگی۔

”ریشک!“ کتنے سارے دنوں کے بعد راحیل نے اسے اس طرح پکارا تھا۔ اس لمحے میں اس نے آنکھیں موند لیں۔

”شاید یہ خواب ہے۔“

”ریشک!“ راحیل نے پھر پکارا تو اس نے آنکھیں کھول کر پیچھے دیکھا۔ راحیل نہ جانے کب باہر آ گیا تھا۔

”تم یہاں اتنی سردی میں باہر کیوں بیٹھی ہو؟“

”یونہی۔“ وہ پھر سامنے دیکھنے لگی۔

”پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔“

”اچھی۔“ راحیل لمحہ بھر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ جس پر ملاں کے بادل چھائے تھے۔ اور اس کی خوبصورت آنکھیں جو ابھی ابھی لگد ہی تھیں۔

وہ اتنی سنجیدہ تو کبھی بھی نہ تھی۔ پھر اتنی چپ چپ کیوں رہنے لگی ہے۔ عقیل بھی تو کہہ رہا تھا اور عقیل بھی بلکہ عقیل تو کہہ رہا تھا کہ ضرور میں نے ہی اسے کچھ کہا ہے اور شاید

انجانے میں، میں اس پر زیادتی کر رہا ہوں۔

”ریشک!“ وہ اس کے اور قریب چلا آیا۔

”سنو ریشک! مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں بہت ضروری باتیں۔ میرے اندر بہت غبار بھرا ہے میں کسی بھی اہم فیصلے سے پہلے سب کچھ کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔

سب کچھ جاننا چاہتا ہوں

”کیا سب کچھ جاننا چاہتے ہو؟“

اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں نہیں۔“ راجیل نے آہستگی سے کہا۔

”لیکن مجھے تم سے باتیں کرنا ہیں ریشک تم کل یونیورسٹی سے ہمارے گھر آنا میں انتظار

کروں گا اور اگر تم نہ آئیں تو میں سمجھوں گا کہ تم۔“

پھر وہ بات ادھوری چھوڑ کر واپس چلا گیا اور وہ وہاں ہی بیٹھی بارش کے برستے قطروں کو دیکھتی رہی۔

”راجیل آخر کیا جاننا چاہتا ہے۔“

اس نے ہاتھ آگے پھیلا کر بارش کے چند قطروں کو اپنی ہتھیلی پر سنبھال لیا۔

”کیا اسے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔“

”یقیناً کوئی غلط فہمی ہی تھی، جس نے اتنے عرصہ سے اسے مجھ سے دور کر رکھا ہے۔

اجنبی بنا دیا ہے۔ ورنہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مجھ سے استاذ اور چلا جاتا۔

اتنا اجنبی ہو جاتا۔ وہ تو میرا ایسا دوست تھا جس کے کندھے پر سر رکھ کر میں رو سکتی تھی

جس سے اپنے دل کی ساری باتیں کر سکتی تھی۔

اور اب ایسا لگتا ہے جیسے دل سے دل کی باتیں کیے صدیاں بیت گئی ہوں۔ جیسے دل پر

بوجھ بہت ہو جیسے میں کچھ گم کر بیٹھی ہوں۔ اور جیسے دل کی دھڑکن ڈوب رہی ہو، جیسے دل پر

بوجھ بہت ہو۔

اور آپ یہ بوجھ سارے کا سارا اتار پھینگوں گی۔ خوب لڑوں گی اس سے، سب کچھ میں

نے تنہا سا ہے۔ اکیلے۔

عمار بھائی اور منک آپا کی علیحدگی کا دکھ۔

عمار بھائی کا غم۔

صالحہ کی بیماری۔

کامل کے بابا کی موت۔

کتنی بہت ساری باتوں کا ڈھیر جمع ہو گیا تھا اس کے اندر، اور اب وہ یہ ساری باتیں اس

سے کرے گی۔ اسے بتائے گی کہ کیا کیا کچھ اس نے ٹھما جھیلایا ہے۔

اور اس نے آپا کا گھر بچانے کے لیے کتنی کوششیں کی تھیں مگر سب رائیگاں اور بیکار۔

راجیل کے متعلق سوچتے سوچتے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور ابھی ابھی آنکھوں میں

جھنوسے چمک اٹھے۔

”آپا!“ ندانے کچن سے آواز دی۔

”نمونہ ہو جا ریگا۔“

اس نے چونک کر دیکھا اس کے ہاتھ نیلے ہو رہے تھے اور بارش کے چھینٹے اسے

بھگور رہے تھے۔

وہ کھڑی ہو گئی اور اس نے پوچھا

”ندو! کچن میں کوئی کام ہے۔“

”نہیں، میں اور نٹنی مل کے سب کر لیں گے آپ آرام کریں تھوڑی دیر، راجیل

بھائی اور ماما کھانا کھا کر جائیں گے، راجیل بھائی نے وال چاول پکانے کے لیے کہا ہے۔“

”اچھا۔ شکریہ ندو۔“

اس نے دل ہی دل میں کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل

ہو رہی تھیں۔ کمرے میں آتے ہی وہ آنکھیں بند کر کے یوں سوئی جیسے ہفتوں بعد سوئی ہو ندا

دوبار اسے جگانے آئی تھی پھر ماما نے ہی منع کر دیا۔

”رہنے دو، نہ جانے کب کی تھکی ہوئی ہے۔“

”ہاں آپا آج کل بہت کم سوتی ہیں۔ رات کو بھی دیر تک جاگتی ہیں۔“

شانے بتایا۔

”مہک آپا کی نیند کے خیال سے وہ ڈرائیگ روم میں آجاتی ہیں اور دیر تک لائٹ جلتی رہتی ہے۔“

”خدا اسے کامیاب کرے۔“

ممائی نے خلوص دل سے دعا کی۔

اور پھر رشک کو پتا ہی نہ چلا کہ کب وہ لوگ گئے اس کی آنکھ صبح ہی کھلی تھی۔ سر پہ بھاری ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ اماں چائے بنا رہی تھیں۔

”اماں! رات مامی اور راجیل کب گئے تھے۔“

”کافی دیر سے ٹکلیل اور عقیل بھی آگئے تھے اور تمہارے ماموں بھی۔“

”آپ نے مجھے جگایا ہوتا۔“

”تم اتنی گہری نیند سو رہی تھیں۔“

”مائی کیا کہتی ہوں گی۔“

اماں سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

”ارے تمہاری مامی نے تو خود منع کر دیا تھا۔ بہت محبت کرتی ہیں تم سے ان کا بس چلے تو تمہیں آج ہی گھر لے جائیں۔ مگر تمہارے ماموں نے صرف نکاح کے لیے کہا ہے۔ تمہارے امتحان کے بعد نکاح ہو جائے گا اور پھر سسی دو سال بعد۔“

”مگر اماں ابھی تو۔“

”راجیل اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتا ہے اور تمہارے ماموں چاہتے ہیں کہ جانے سے پہلے انہیں مہک کے اجڑنے کا بہت دکھ ہے۔ وہ تمہارا مستقبل محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔“

”مہک کے اجڑنے کا دکھ۔“

”کیا وہ مہک کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔“

اس نے چائے پیتے ہوئے اماں کی طرف دیکھا۔

”اماں آپ نے ماموں سے مہک آپا کے لیے نہیں کہا۔“

”ارے میرے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں خود ہی بہت فکر ہے تمہاری آپا کے لیے کئی لوگوں سے کہہ رکھا ہے۔ انہوں نے ایک لڑکے کا بتایا تو ہے کسی نے عمر تھوڑی

زیادہ ہے مگر پیسہ بے حساب ہے۔ کار بنگلہ وہ سب کچھ جس کی خواہش مہک کو ہے۔ ابھی دلدار بھائی لڑکے سے نہیں ملے۔ لڑکا مقصد میں ہے۔ دو چار روز میں آئے گا اسے دیکھ کر ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔“

”اچھا! اس کے ذہن پر سے ایک بوجھ اتر گیا۔“

”لیکن آپا سے پوچھے بنا کچھ مت کیجئے گا۔“

”ارے پوچھا تو پہلے بھی تھا۔“

”ممکن ہو سکے تو آپا کو دکھا دیجئے گا۔“

”اور چائے لوگی کو شئی۔“

”نہیں اماں!“ اس نے غور کیا۔ اماں آج بہت مطمئن لگ رہی تھیں۔

”خدا کرے اماں یو خسی مطمئن رہیں اور خوش رہیں۔“ اس نے دعا کی اور تیار ہونے کے لیے چل دی۔

”آپا! ناشتا کرتے ہوئے ٹٹانے کہا۔“

”واپسی پر زار الدو بازار سے میرے لیے یہ دو کتابیں تو لیتے آئیے گا۔ یہاں سے حسام نے پتا کیں، نہیں ملیں۔“

”اچھا!“ اس نے چٹ لے کر پرس میں رکھ لی۔

”اور تو سنا چھوٹو تجھے تو کچھ نہیں چاہیے۔“

اس نے پیار سے حسام کو دیکھا آج بڑے دنوں بعد وہ موڈ میں تھی۔

”نہیں۔“

حسام نے ابلا ہوا لٹل ایک ہی بار منہ میں ڈالنے کی کوشش کی۔

”آج یونیورسٹی سے فارغ ہو کر ٹیوشن سنٹر جاؤں گی اور پھر وہاں سے دلدار ماموں کے

ہاں جاؤں گی دیر ہو گئی تو فکر نہ کیجئے گا، راجیل چھوڑ دے گا۔“

پھر وہ حسام کا رخسار تھپتھپاتی ہوئی بیک کندھے پر لٹکائے سب کو خدا حافظ کہتی ہوئی چلی گئی۔

آج بھی بے طرح مصروفیت رہی۔

میر اور نادیہ کے ساتھ مل کر نوٹس مکمل کرتی رہی۔

”مجھے تو لگتا ہے۔ ایک دو پیپر زمیں اڑ جائیں گے۔“

میر نے تھک کر قلم ایک طرف رکھ دیا۔

”نہیں سمو، اس طرح نہ کو، میں کسی ایک پیپر میں بھی فیل ہونا فوراً نہیں کر سکتی۔“

رشک بھی فائل بند کر کے کھڑی ہو گئی۔

اڑھائی بج چکے تھے اور ابھی اسے اردو بازار جانا تھا۔

”اچھا بھئی، ہم تو چلے۔“

”تمہیں پتا ہے رشک، وہ کامل کی بہن بہت سخت بیمار ہے۔“

نادیہ نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تو۔ بہن نہیں کزن۔“

”کزن ہی ہو گی کاشف بتا رہا تھا بہن۔“

”مجھے بھی اتار کلی تک جانا ہے۔ چلو اکٹھے ہی چلتے ہیں۔“

اور اردو بازار سے مطلوبہ کتابیں خرید کر وہ ٹیوٹن سنٹر چلی گئی اور جب وہ تیز تیز چلتی ہوئی اسٹاپ پر پہنچی تو بس جاچکی تھی اوہ اب اگلی بس یاد تین نہ جانے کتنی دیر تک آئے گی اور اندھیرا بھی سے پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ایک تو سردیوں کی شام اس پر بادل بھی چھائے ہوئے تھے۔

اور ایک یہ مس راجہ نے خواہ خواہ روک لیا۔ چند منٹ پہلے پہنچ جاتی تو۔

وہ پیچھے ہٹ کر شینڈ کے نیچے کھڑی ہو گئی اور دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے اس کی نظر عمار پر پڑی تھی۔ بے حد تھکا تھکا متھل سا وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ اگرچہ عمار کا اسٹاپ بھی یہی تھا لیکن جب سے مک کو طلاق ہوئی تھی وہ اسے نظر نہیں آیا تھا وہ یونہی ٹیک لگائے اسے دیکھتی رہی، مک کا سر لپاس کی نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا۔

خوش باش، ہنستا مسکراتا۔

چند ماہ کے لیے اس شخص کی زندگی میں شامل ہو کر مک نے کیسے اس کے چہرے سے زندگی کی ساری رمت چھین لی تھی اور تب ہی عمار نے بھی اسے دیکھ لیا۔ دونوں کی نظریں

ملیں، عمار کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی اور وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

”کوشی!“

”السلام علیکم عمار بھائی۔“ اس سے اجنبیت نہ برت سکی۔

”میں تم سے بہت شرمندہ ہوں کوشی!“

”کوئی بات نہیں عمار بھائی۔“ وہ سیدھی ہو گئی۔

”شاید مقدر میں یہی لکھا تھا اور آدمی مقدر سے نہیں لڑ سکتا۔“

”ہاں آدمی مقدر سے نہیں لڑ سکتا۔“

عمار نے افسردگی سے کہا اور پھر جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”مک کیسی ہے؟“

”فائن۔“

چند لمبے خاموشی رہی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہے تھے۔

”آپ کے گھر میں سب کیسے ہیں۔“

کچھ دیر بعد رشک نے پوچھا۔

”سب تو ٹھیک ہیں لیکن صالحہ۔“

”کیا ہوا صالحہ کو؟“

اس نے بے چینی سے پوچھا۔

”وہ، وہ بہت بیمار ہے، بہت زیادہ کوشی میری معصوم بہن، اتنی کم عمری میں۔“

عمار کی آواز بھر ا گئی۔

”ڈاکٹر کہتے ہیں شاید۔“

”نہیں پلیز عمار بھائی، اس طرح نہ کہیں، وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

رشک کو بے حد دکھ ہوا۔

وہ پیاری سی معصوم سی لڑکی، جو نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بھائی کا بسا گھر اجڑ جائے،

جس نے رشک سے درخواست کی تھی کہ وہ مک کو روک لے۔

”وہ مجھ سے خفا ہے کوشی۔ وہ سمجھتی ہے میں بے حوصلہ ہوں، میں نے مک کو طلاق

”حوصلہ رکھو کلثوم اور خدا سے دعا کو، انشاء اللہ صالحہ ٹھیک ہو جائے گی۔“  
 اس نے آنکھیں موندے لیٹی صالحہ کی طرف دیکھا۔ گلو کو ز قطرہ قطرہ اس کی رگوں  
 میں اتر رہا تھا اور، اس کی رنگت خطرناک حد تک پیلی ہو رہی تھی۔  
 ”صالحہ!“ کلثوم نے اس کے بیڈ کے پاس کھڑے ہو کر آہستگی سے پکارا۔  
 ”صالحہ! دیکھو تو کون آیا ہے۔“

”کون۔“ اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا اور پھر آنکھیں کھول کر اپنے بیڈ کے قریب  
 گھڑی رشک کو دیکھا۔ اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔  
 ”آپ کو شئی آیا۔“

اس نے اپنا بالیاں ہاتھ اوپر اٹھایا جسے رشک نے محبت سے تھام لیا۔  
 ”یہ تم نے اپنے آپ کو کیا کر لیا ہے پیاری لڑکی۔“  
 ”کچھ نہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”اور مجھے یقین تھا کہ آپ آئیں گی، آپ کو پتا چلا کہ میں، میں جانے والی ہوں تو آپ  
 ضرور آئیں گی میں نے آپ کو بہت سوچا ہے، بہت، آپ اتنی پیاری اتنی محبت کرنے والی ہیں  
 کہ مجھے لگتا ہے جیسے آپ کہیں کسی اور دنیا سے آئی ہیں کسی اور سیارے سے۔“  
 وہ تھک کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

”صالحہ تم زیادہ بولو نہیں۔“

رشک اس کے بیڈ کے پاس ہی بونٹی اس کا ہاتھ تھامے سٹول پر بیٹھ گئی۔  
 ”در اصل تم خود بہت اچھی اور محبت کرنے والی لڑکی ہو، اس لیے توجہ عمار بھائی نے  
 بتایا کہ تم بیمار ہو تو میں بے اختیار چلی آئی۔ یہ تو تمہاری اچھائی ہوئی نا جو مجھے کھینچ لائی ہے۔“  
 ”کو شئی آیا۔“ آپ بہت اچھی ہیں، بہت اچھی۔ کوئی یقین کرے گا کہ آپ۔ آپ اس  
 شخص کی بہن کی مزاج پر سی کرنے آئی ہیں، جس نے آپ کی بہن کو طلاق دے دی، جس  
 سنے، اور عمار بھائی نے میری بات بھی نہیں مانی۔“

”صالحہ! اچھی لڑکی! تم اور میں ہم دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ عمار بھائی کا اس میں  
 اتنا زیادہ قصور نہیں ہے اور ہمک آپ وہ خود ہی نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ تم بونٹی عمار بھائی سے خفا

دینے میں جلدی کی ہے۔ اسے کیا خبر کہ ہمک خود ایسا ہی چاہتی تھی میں نے تو صرف اس کی  
 خوشی پوری کی تھی۔“

”میں کبھی اسے سمجھاؤں گی، بتا دوں گی اسے۔“

”وہ تو، وہ تو جا رہی ہے کو شئی سب چھوڑ کر اسے اب تم کیا سمجھاؤ گی۔ اور اس نے تمہیں  
 کئی بار یاد کیا۔ پچھلے پندرہ دنوں سے وہ ہسپتال میں ایڈمٹ ہے پہلے سرورسز ہسپتال میں تھی۔  
 پھر ہم نے ڈاکٹر و سیم کے پرائیوٹ کلینک میں اسے ایڈمٹ کر دیا۔ ڈاکٹر و سیم بہت اچھے  
 ہارٹ سپیشلسٹ ہیں، یہ قریب ہی اگلے اسٹاپ پر ان کا کلینک ہے۔“

وہ خاموشی سے عمار کی باتیں سن رہی تھی اور صالحہ کے ساتھ آخری ملاقات کا منظر  
 اس کے آنکھوں میں سامنے آرہا تھا۔ جب وہ اس کے ہاتھ تھامے ملتی نظروں سے اسے دیکھ  
 رہی تھی۔ نہیں، اس اتنی پیاری مخلص اور محبت کرنے والی لڑکی کو نہیں مرنے چاہیے۔

”کو شئی مجھے کوئی حق تو نہیں پہنچتا کہ میں تو تم سے ایسی کوئی درخواست کروں۔ لیکن  
 کو شئی اگر کبھی وقت ملے تو ایک دو روز تک صالحہ سے مل لینا۔ وہ تم سے مل کر خوش ہو گی۔  
 لیکن دیکھو، بہت دیر نہ کر دینا کہیں وہ۔“

”نہیں پلیز عمار بھائی، آپ اس طرح مت کہیں مت سوچیں اس طرح، آپ اس  
 وقت ہسپتال ہی جا رہے ہیں کیا؟“

”ہاں آج دو دن بعد آفس گیا تھا نکلنے نکلنے پانچ ہو گئے۔“

”اچھا تو میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ صالحہ کو دیکھ کر پھر چلی جاؤں گی۔“

”جھینک یو کو شئی۔“

اس نے مناسب نامناسب کچھ بھی تو نہ سوچا اس کا ہمدرد دل صالحہ کے لیے اس ہورہا  
 تھا۔ وہ بنا سوچے ہی عمار کے ساتھ چل دی تھی۔ صالحہ کے پاس اس وقت کلثوم تھی اور ماں  
 جی شاید گھر گئی ہوئی تھیں اسے دیکھ کر کلثوم کو حیرت ہوئی، لمحہ بھر وہ حیرت سے اسے دیکھتی  
 رہی اور پھر ایک دم ہی اس کے گلے لگ گئی۔

”کو شئی آیا! ہماری صالحہ!“

رشک نے ہولے سے تھک کر اسے الگ کیا۔

ہو۔ انہوں نے بہت مجبور ہو کر ایسا کیا۔“

”میں جانتی ہوں۔“ صالحہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”لیکن عمار بھائی ایسا نہ کرتے تو کیا ہو جاتا، کیا وہ تھوڑا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ تھوڑا سا انتظار، خالد کو باب مل جاتی، ٹوی کی تعلیم مکمل ہو جاتی، پھر وہ ایک الگ گھر لے کر مکہ آپا کو منالیتے۔“

”دیکھو گڑیا! ستم زیادہ مت سوچو، یہ اسی طرح ہونا تھا۔ ایسے ہی ہم اور تم کتنی بھی کوششیں کرتے سب بیکار اور اب تم اپنے عمار بھائی سے خفا تو نہیں ہونا۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ عمار نے ہنسنے کی نظروں سے اسے دیکھا۔

”دیکھو صالحہ! شاید عمار بھائی اور مکہ آپا کے ستارے ہی نہیں ملتے تھے۔ انہیں صرف اتنی ہی دیر کے لیے اکٹھے رہنا تھا اور پھر جدا ہو جانا تھا۔ اگر وہ اکٹھے رہتے تو شاید ایک دوسرے سے ٹکر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے اور اللہ میاں اپنی مصلحتیں خود سمجھتا ہے اور تم۔“

اس نے صالحہ کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے رخسار تھپتھپائے۔

”تم اپنے عمار بھائی کے لیے دعا کیا کرو کہ خدا انہیں ایک بہت اچھی محبت کرنے والی ساتھی دے۔“

”اچھا!“ وہ شاید تھک گئی تھی کہ لمحہ بھر تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ اتنی شدید سردی میں پسینہ، رشک نے کلثوم کی طرف دیکھا تو کلثوم نے اپنے دوپٹے سے اس کا پسینہ صاف کیا۔

”ارے صالحہ کے ہونٹ تو نیلے ہو رہے ہیں اور چہرہ بھی۔“ وہ کرب سے چلائی تو عمار دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی کمر اڈا کٹروں سے بھر گیا۔ اس کی سانس کی آواز ہی تھی۔

پھر فوری طور پر اسے ایمر جنسی میں لے جایا گیا۔ جہاں ڈاکٹر اس کی زندگی بچانے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ کلثوم کے پاس بیٹھی اس کے آنسو پونچھتی رہی اسے تسلی دیتی رہی اور وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔ عمار بار بار ایمر جنسی روم کے دروازے تک جاتا پھر لوٹ آتا۔ شاید ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ یا اس سے بھی زیادہ ایمر جنسی روم کا دروازہ کھلا ڈاکٹروں نے

زندگی کی نوید دی۔

”وہ خطرے سے باہر آگئی ہیں۔“

اس نے اطمینان بھر سانس لیا۔ اور کھڑی ہو گئی۔

”اچھا کلثوم، اب میں چلتی ہوں، پھر کبھی آؤں گی۔ صالحہ ہوش میں آجائے تو میرا پیار لکنا اس سے۔“

باہر رات پڑ گئی تھی۔

خوفزدہ سی ہو کر وہ پلٹ پڑی۔ عمار نے اسے پلٹتے ہوئے دیکھا۔

”کیا ہوا؟“

”بہت دیر ہو گئی ہے۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”اگر مناسب سمجھو تو میں۔“

”جی پلیز عمار بھائی۔ میں اکیلی نہیں جاسکتی۔“ اس کی آنکھوں میں غمی تیر گئی۔

”ایک منٹ۔ خالد آنے والا ہو گا وہ آجائے تو میں۔“

اور وہ وہیں برآمدے میں کھڑی دل ہی دل میں دعائیں مانگتی رہی۔ خالد اور ماں جی

انہیں تو وہ عمار کے ساتھ آگئی۔ عمار نے روڈ پر ہی رکشہ رکوا لیا۔

”تھینک یو۔“ وہ پیچھے دیکھے بنا سڑک کر اس کرنے لگی۔

اور راحیل جو اس کے نہ آنے پر پریشان ہو کر اس کی خیریت معلوم کرنے چلا آیا تھا۔

لکھنے وہاں سے ہی گاڑی ریورس کر لی۔

گھر میں کسی کو اس کے متعلق تشویش نہیں تھی۔ کیونکہ وہ بتا کر گئی تھی۔

”آپ کو راحیل بھائی چھوڑنے آئے ہیں۔“ ثناء نے پوچھا۔

”اندر کیوں نہیں آئے؟“

وہ خاموش ہی رہی۔

”مینا وغیرہ کو میں نے چھٹی دے دی تھی۔“

”اچھا!“

”آپ کھانا کھا کر آئی ہیں؟“

”نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔“

سب لوگ شاید ڈرائیگ روم میں تھے ٹی۔وی دیکھ رہے تھے۔

”تم لوگوں نے کھانا کھالیا۔“

”ڈرامہ دیکھ کر کھائیں گے۔“

”آجائیں نا بہت اچھا ڈرامہ ہے۔“

”نہیں ندو، میرے سر میں درد ہے۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”میں سو جاؤں گی جلدی ہی۔“

اس کے سارے جسم میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا اور جسم کچھ گرم لگ رہا تھا۔ وہ تھکی تھکی سی

اپنے بستر پر گر گئی۔

اور زندگی کتنی بے اعتبار ہے کیسے لمحوں میں آدمی ختم ہو جاتا ہے اور وہ ڈاکٹر مر کہہ رہے

تھے کہ صالہ کے دل کی حرکت بالکل رک گئی تھی اور جب ہم نے شاک دیے تو دل پہلے

آہستہ آہستہ اور پھر نارمل انداز میں دھڑکنے لگا۔

”خدا یا! اس پیاری لڑکی کو زندگی دینا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے زیادہ سے زیادہ اٹھار

سال۔“

اس نے بے آواز دعا کی اور پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”ارے آج تو اسے راحیل کو

طرف جانا تھا اور راحیل نے کہا تھا وہ اس کا انتظار کرے گا۔“

”اوہ خدا یا!“

اس نے کلاک کی طرف دیکھا۔

آٹھ بج رہے تھے سردیوں کے آٹھ۔

اب اس وقت تو وہ راحیل کی طرف نہیں جاسکتی۔ حسام کو ساتھ لے کر بھی نہیں

راحیل نے کیا سوچا ہو گا۔

کاش ان کے گھر فون ہی ہوتا۔ تو وہ فون کر کے راحیل کو بتا دیتی۔ اس کا دل ایک دم؟

بھر آیا تھا۔ صبح! ہاں صبح میں یونیورسٹی جانے کے بجائے راحیل کے پاس ہی جاؤں گی۔

منالوں کی۔ ساری حقیقت بتا دوں گی۔ وہ کتنا بھی مجھ سے خفا رہا ہے لیکن وہ ہمیشہ مجھ سے

میں رہ سکتا، یہ میں جانتی ہوں مجھے پتا ہے۔

وہ اپنے آپ کو یقین دلاتی رہی لیکن آنسو پھر بھی اس کی آنکھوں سے نکل نکل کر نیچے کو

بگڑتے رہے۔

صبح نہانے اسے جگایا تو اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں اور جسم کا جوڑوڑ دکھ رہا

تھا۔

”ارے آپا! آپ کو بہت تیز بخار ہے۔“ نہانے گھبرا کر ٹائو لہاں کو آواز دی۔ اس نے

بیشکل آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے چائے کے ساتھ ڈسپرین دے دو۔“ شاید یہ اس روز

بھگنے کا اثر تھا۔

نہا جب چائے لے کر آئی تو وہ بے سدھ پڑی تھی۔

اور پھر کتنے سارے دن گزر گئے۔ بخار اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ بے سدھ

پڑی رہتی نہ اور ٹھانڈے پر پٹیاں رکھ رکھ کر تھک جاتیں۔ لیکن بخار ذرا سا بھی کم نہ ہوتا۔

پورے ڈیڑھ ہفتے بعد بخار اترتا تھا۔ لیکن وہ اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ پورا ایک ہفتہ مزید بستر پر ہی

رہی۔

اور اس دوران راحیل ایک بار بھی اس کی مزاج پر سی کو نہیں آیا تھا۔ ممانی، تھکیل،

عقیل، ماموں سب ہی تو آئے تھے۔ بلکہ تھکیل عقیل نے تو کئی چکر لگائے تھے۔ اور راحیل! وہ

یقیناً اس سے بہت ناراض ہے، ہولے ہولے اپنے بال سلجھائے ہوئے اس نے سوچا، میں

ایک دو روز میں جا کر اسے منالوں کی اور ابھی وہ دلدار ماموں کے ہاں جانے کا سوچ ہی رہی تھی

کہ ٹٹانے دھماکہ کیا۔

”راحیل نے اس کے ساتھ نکاح کرنے سے انکار کر دیا ہے اور یہ کہ اس کی سیٹ کنفرم

ہو گئی ہے۔ اور وہ دو سال کے لیے امریکہ جا رہا ہے نیو جرسی میں اسے ایڈمیشن مل گیا ہے۔“

دلدار ماموں نے اسے بہت ڈانٹا لیکن وہ کہتے ہیں، دو سال بہت ہوتے ہیں۔ شاید دو

سال سے بھی زیادہ دن لگ جائیں اور اس طرح کسی کو پابند کر کے جانا اچھا نہیں ہے۔ اور

منالوں نے ماموں جان کو قائل کر لیا ہے۔“ ٹٹانے اسے پوری تفصیل بتائی۔



”اچھا!“ اس کے دل پر جیسے برف گرنے لگی۔

تو کیا وہ چلا جائے گا، یونہی خانا خانا اور ناراض دل میں غلط فہمیوں کا غبار لیے اور جب وہ واپس آئے گا تو وقت بہت گزر چکا ہو گا اور پھر شاید۔

”راجیل کی فلائیٹ کب ہے؟“ اس نے پوچھا

”شاید پرسوں شام کو۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ پرسوں صبح واپس آئے گی اور۔“

”راجیل بھائی ملنے تو آئیں گے۔ شاید آج شام ہی آئیں، ماما بتا رہی تھیں، پھر

فلائیٹ کے صبح وقت کا پتا چلے گا۔“

ندائے بتایا تو بالوں کا جوڑا بنا کر لیٹ گئی ذرا سی مشقت نے اسے تھکا دیا تھا۔ جانے یہ

کمزوری کب ختم ہوگی۔

اس کے کتنے اہم لیکچر مس ہو گئے تھے۔

یوٹیشن سنٹر بھی وہ نہ جاسکتی تھی۔

غنی صاحب تو ضرور اس کی پے ”تنخواہ“ کاٹ لیں گے۔ اف اوہو۔ یہ بیماری بھی کتنے

غلط وقت پر ہوئی تھی۔ اگر اس میں ہمت ہوتی تو وہ ابھی ابھی چلی جاتی دلدار ماموں کے ہاں۔

وہ انہی، کمرے سے باہر تک آئی۔ لیکن ٹانگیں لرز رہی تھیں، پھر واپس پلٹ آئی۔

”نہیں آج نہیں کل یا پرسوں ہی جاؤں گی۔“

ندائے بتایا تھا۔

”چھ بجے ان کی فلائیٹ ہے اور ہم سب آج ہی ان سے ملنے جائیں گے آپ بھی چلیں

گی؟“

”نہیں میں صبح ہی جاؤں گی۔“

اب سب کے سامنے تو وہ راجیل سے بات نہ کر سکے گی۔ اسے تو راجیل کو منانا تھا۔ اس

کی ساری غلط فہمیاں دور کرنی تھیں۔ بس وہ سویرے ہی چلی جائے گی۔ ناشتہ کر کے۔ اور پھر

شام تک وہ وہاں رہے گی۔ ممانی بھی تو اس کے جانے سے ادا اس ہوں گی۔ بس وہ وہاں ہی

رہے گی۔ دل ہی دل میں فیصلہ کر کے وہ لیٹ گئی۔

صبح وہ اپنی طرف سے بہت جلدی اٹھ گئی تھی۔ پھر بھی سمن آباد پہنچتے پہنچتے آٹھ بج گئے

تھے۔ پورے گھر پر خاموشی طاری تھی۔

ارے سب لوگ کہاں ہیں؟

اس نے حیرت سے سوچا اور ممانی کے کمرے کی طرف بڑھی وہ بہت خاموش اور چپ

چپ سی بیٹھی تھیں۔

”کوئی تم۔“ وہ اسے دیکھ کر ذرا سی حیران ہوئیں۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے اب؟ آہ بتا رہی تھیں کہ ابھی بہت کمزوری ہے۔“

”نہیں آج کچھ بہتر محسوس کر رہی ہوں۔“

وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”باقی سب لوگ کہاں ہیں کیا ابھی تک سوئے ہوئے ہیں۔“

”نہیں سب راجیل کو سی، آف کرنے گئے ہیں۔“

”راجیل کو، مگر اس کی تو چھ بجے فلائیٹ تھی۔“ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

”ہاں مجھے بجے ہی فلائیٹ تھی۔ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا:

ہاں چھ بجے ہی فلائیٹ تھی

سب لوگ گھر سے پانچ بجے نکل گئے تھے اب آنے والے ہی ہوں گے۔“

”تو صبح کے چھ بجے فلائیٹ تھی۔“

اس نے اپنے ہاتھ گود میں دھر لیے اور اسے لگا جیسے سب کچھ ایک دم سے چھن گیا

ہو اور وہ بالکل تھی داماں رہ گئی ہو۔ اس نے پوچھا بھی کب تھا کہ صبح فلائیٹ ہے یا شام کی۔ وہ

یونہی ہاتھ گود میں دھرے چپ بیٹھی رہی اور ممانی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ تو بالآخر

یوں ہوتا تھا اور وہ ہمیشہ دیر کر دیتی ہے۔

شکیل صبح کہتا ہے کہ وہ کبھی صبح وقت پر نہیں پہنچی۔ اس روز بھی اس نے دیر کر دی

تھی اور آج بھی پتا نہیں اس سے دیر کیوں ہو جاتی ہے وہ پیچھے کیوں رہ جاتی ہے اور راجیل چلا

گیا ہے دل میں اس کی طرف سے سارا غبار اور ناراضی لیے۔

”اچھا ماما!“ کھدیر بعد وہ کھڑی ہو گئی۔

”اب چلتی ہوں۔“

”ارے بیٹھو تائی!“

”نہیں ماما! آج یونیورسٹی جاؤں گی۔“

وہ خدا حافظ کہہ کر باہر آئی تو ٹکیل گیٹ کھول کر اندر آ رہا تھا وہ ہیں رک گئی جیسے ٹکیل ابھی اس سے آکر کہہ دے گا کہ راجیل نہیں گیا۔ واپس پلٹ آیا ہے۔ ٹکیل نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”آپ کیسی ہیں۔“

”فائن۔“

اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن پلکیں بھیگ گئیں۔

”راجیل چلا گیا؟“

”ہاں۔“

”ماموں اور عقیل کہاں ہیں؟“

”عقیل مجھے یہاں اتار کر ابو کو آفس چھوڑنے گیا ہے آپ بیٹھیں تاکھری کیوں ہیں۔“

”نہیں میں جا رہی ہوں، راجیل سے ملنے آئی تھی لیکن۔“

”اچھا ہوا آپ ان سے نہیں ملیں۔“ ٹکیل نے سوچا۔

”ورنہ دکھ ہی ہوتا۔“

راجیل نے جانے سے پہلے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کوشی کو اس کا پابند نہ سمجھا جائے

اور جہاں جی چاہے پھپھو اس کی شادی کر دیں۔

اور کوشی کتنی اچھی ہے، محبت کرنے والی اور مخلص اور امی کو بھی اس بات کا کتنا دکھ

ہے۔ لیکن راجیل بھائی، خدا جانے انہیں کیا ہو گیا ہے۔ شاید، شاید کوئی اور لڑکی۔

”اچھا ٹکیل۔“ رشک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اب چلوں۔“

”تھوڑی دیر رک جائیں عقیل آجائے گا تو آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔“

”نہیں میں چلی جاؤں گی۔“

بس میں لنک کر۔“

ٹکیل نے اسے ہنسانا چاہا۔ مگر وہ ہنس نہ سکی۔

”ہاں شاید بس میں لنک کر اور سنو راجیل کے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع آئے تو

پتا۔“

ٹکیل کا دل چاہا کہ وہ اسے بتا دے وہ سب کچھ جو راجیل نے کہا تھا۔ مگر وہ اتنی زرد اور

اچھی کمزور لگ رہی تھی کہ اس کی ہمت نہ پڑی لیکن کوئی بات کب تک چھپی رہ سکتی ہے۔ شاہور

بتا دے اس بات کا پتا چل گیا۔

نہایت اداس تھی۔

”پتا نہیں راجیل بھائی نے ایسا کیوں کیا۔ کوشی آیا وہ تو آپ کو۔“

”انسان کی رائے بدلتے دیر تو نہیں لگتی۔ ندو۔“

”آپ کو دکھ ہو رہا ہے؟“ ثناء نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

”پتا نہیں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”میں اپنے لیے نہیں سوچتی میں تو صرف تمہارے اور حسام کے لیے سوچتی ہوں۔“

میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے، کیا ہو گا، مجھے اس کی پروا نہیں ہوتی۔“

”مگر پھر بھی کوشی آپا دکھ تو ہوتا ہے نا۔“

”ہاں دکھ تو ہوتا ہے۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی۔

دوست کے بدل جانے کا، چھڑ جانے کا چلے جانے کا اور پھر وہ دوست جس نے ہمیشہ ہر

مشکل میں ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہوا، دکھ تو تھا کہیں اندر گہرائی میں گہرا اور شدید۔ دل کو

چیرتا ہوا۔

اسے لگا جیسے اس نظر نہ آنے والے زخم سے قطرہ قطرہ خون رس رہا ہو۔

”اور اگر ماما نے پہلے بتا دیا ہوتا تو میں راجیل بھائی سے پوچھتی ضرور، کیا حق پہنچتا تھا

انہیں۔“ ثناء غصے میں تھی۔

”ہیو، غصہ نہیں کرتے گڑیا۔ وہ ایک شخص ہے کامل رضا بیٹ وہ کہتا ہے، حقیقتوں کو

قبول کر لینے سے ان کی تلخی کم ہو جاتی ہے تم بھی حقیقت کو قبول کر لو اور مجھے یوں بھی ابھی

لباسنر طے کرنا ہے۔ ”وہ کھڑی ہو گئی۔

”اور میں نے اس سے پہلے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لے۔“ اس نے سوچا۔

یہ تو انتظار کرنے کا اس نے خود ہی کہا تھا اور نہ میں نے۔ میرا سفر تو یوں بھی طویل ہے حسام ابھی اسکول میں ہے اور مجھے اب کی خواہشوں کو پورا کرنا ہے۔

”آپا! آپ ناشتا تو کر لیں۔“

ندائے اسے جاتے ہوئے روکا۔

”نہیں چند! پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔“

اس نے کاؤنٹر پر پڑا ہوا اپنا بیگ اٹھایا اور خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

کسی بھی حقیقت کو اس کی پوری سفاکی کے ساتھ قبول کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ کوئی رشک سے پوچھتا جو اس حقیقت کو قبول کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ ٹوٹ ٹوٹ کر نکھر رہی ہے۔ مگر وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ راجیل کو گئے چھ ماہ ہو گئے تھے اور اس نے راجیل کو خط بھی لکھا تھا۔ لیکن راجیل نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کامل نے اس دوران اسے بہت سہارا دیا تھا۔ پتا نہیں کب۔ پتا نہیں کیسے، دونوں کے درمیان ایک پر خلوص دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنے دکھ کسنے لگے تھے یہ محض اتفاق تھا کہ امتحان سے فارغ ہو کر جس پرائیویٹ کمپنی میں رشک نے ٹائپسٹ کی جاب کی تھی، وہاں ہی کامل بھی تھا اور کامل کو وہاں دیکھ کر اسے تحفظ کا سا احساس ہوا تھا۔ وہ دونوں اچھے دوستوں کی طرح ملتے۔ رشک اس سے اپنے دل کی باتیں کرنے لگی تھی اور اس نے اسے راجیل کے متعلق بھی بتا دیا تھا کہ اس نے اسے رد کر دیا ہے۔

”معلوم نہیں راجیل نے ایسا کیوں کیا؟“ کامل کو بے حد دکھ ہوا تھا رشک ایسی لڑکی تھی جس کی رفاقت کس بھی مرد کے لیے باعثِ فخر ہو سکتی تھی اور کاش کاش وہ خود اس کا اہل ہوتا۔ رشک سے مل کر وہ ہمیشہ سوچا کرتا تھا۔ مگر اس کے پاؤں میں تو زنجیریں تھیں۔ اور ابھی وہ اپنے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا جب تک۔ جب تک خدیجہ کا مستقبل محفوظ نہ ہو جاتا۔ اس نے بابا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ خدیجہ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا اور یہ کہ کوئی بہت ہی

اچھا لڑکا دیکھ کر وہ خدیجہ کو جلد بیاہ دے گا۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو وہ خود..... وہ خود خدیجہ کا ہاتھ چھام لے گا۔

اور اس نے بابا سے وعدہ کر لیا تھا۔

حالانکہ بابا سے وعدہ کرتے ہوئے وہ دلکش آنکھوں والی پیاری لڑکی بار بار اس کے تصور میں آتی رہی تھی۔ جسے پہلی بار دیکھ کر ہی اس نے اپنے دل میں اس کے لیے بڑی اپنائیت سی محسوس کی تھی۔

اپنے آپ میں گم اور ارد گرد سے بے خبر وہ لڑکی زندگی سے جنگ کرتی ہوئی۔ کیسے چپکے سے اور کس طرح اس کے دل میں چھپ کر آ بیٹھی تھی لیکن اس کی دسترس سے دور۔ اور پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔

وہ لوگ جو ہمیں اچھے لگتے ہیں۔

جن کے ساتھ دل اور روح کا رشتہ بہت گہرا اور بہت مضبوط محسوس ہوتا ہے وہ ہم سے دور ہوتے ہیں۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا۔

خدیجہ اچھی لڑکی تھی۔ خوبصورت نہ سہی، لیکن اچھی لگتی تھی۔

خدیجہ اس سے دو سال بڑی تھی اور بچپن سے ہی اس نے اس کے لیے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا لیکن بابا کی محبتوں کا قرض تو اسے ادا کرنا ہی تھا وہ خدیجہ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

بابا نے اسے نیگے بیٹے سے بڑھ کر محبت دی تھی۔ بے حد بے حساب چاہا تھا۔

اور وہ..... وہ تو کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔

بابا نے اسے کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا اور چل پڑے تھے۔

رشک کو وہ ہمیشہ الجھا الجھا سا دکھائی دیتا تھا۔

حالانکہ اس سے پہلے یونیورسٹی میں اس کا چہرہ کوئی تاثر نہیں دیتا تھا، نہ غم کا، نہ خوشی کا، مگر اب اس کی آنکھیں ہر وقت کچھ سوچتی رہتی تھیں، جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ یا پھر جب اس کی آنکھیں خواب نہیں دیکھتی تھیں تو چہرے پر الجھنوں کا جال بنا ہوتا تھا۔

مگر اس روز اس کی آنکھیں خواب نہیں دیکھ رہی تھیں۔ بلکہ ان میں جگنو سے چمک رہے تھے۔

”آج بہت خوش ہیں؟“ رشک نے پوچھا۔

”آج بہت خوش ہوں، آج ایک بہت بڑا بوجھ ذہن سے اتر گیا ہے۔“

چنانچہ تم میں وہ دونوں عموماً سامنے والے ریسٹورنٹ میں چائے پینے آجاتے تھے اور کبھی کبھار برگرو وغیرہ بھی منگوا لیتے۔

”اچھا۔“

رشک اس کے لیے چائے بنانے لگی۔

”رشک۔“

اُس نے بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”رشک ماہ! بہت پہلے جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تو سوچا تھا کہ اگر زندگی میں تم جیسا رفیق بمسفر مل جائے تو زندگی سنور جائے گی، لیکن پھر مجھے خدیجہ نے بتایا کہ تم راحیل کے ساتھ منسوب ہو تو میں نے سوچا کہ میں بد نصیب ہوں اور میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا اور یہ کہ راحیل بہت اچھا لڑکا ہے اور تم راحیل کے قابل ہی ہو اور پھر جب میں دوبارہ تم سے ملا تو تمہارے اور راحیل کے راستے الگ ہو چکے تھے، لیکن میں ایک وعدے کی زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ چاہت کے باوجود بھی تم سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ تمہارے سنگ سنگ چلتے ہوئے پار ہا میرا دل چاہا کہ تم سے درخواست کروں کہ رشک ہمیشہ میرے سنگ سنگ چلتی رہو لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ تمہارے دامن میں جھوٹی امیدیں نہیں ڈال سکتا تھا، مگر آج..... ہاں آج میں تم سے یہ کہہ سکتا ہوں، بغیر کسی ڈر، خوف اور جھجک کے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور زندگی کے اس لمبے سفر میں تمہارے ساتھ کا تمنائی ہوں، کیونکہ آج میں اس وعدے کی زنجیر سے آزاد ہو گا۔ میرے خدا نے مجھے بابا کی روح کے سامنے سرخ رو کر دیا ہے میرے بابا اور اصل میرے نگے والد نہیں ہیں بلکہ میرے تایا ہیں انہوں نے بچپن میں ہی مجھے گود لے لیا تھا۔“

اس نے تفصیل بتائی۔

”کل شام خدیجہ کا نکاح ایک بہت ہی اچھے انسان سے ہو گیا ہے اور اس اچھے انسان کو تم بھی جانتی ہو۔ وہ ہیں ہمارے پروفیسر سرائیاز خواجہ، بہت جلد خدیجہ کی رخصتی ہو جائے گی

اور پھر میں تمہاری والدہ سے ملوں گا..... اور تمہیں.....“

”نہیں کامل، پلیز! نہیں..... میری منزل بہت دور ہے اور میرا راستہ بہت مختلف ہے،

مجھے اپنی بہنوں کا اور اپنے بھائی کا مستقبل سنوارنا ہے، میں نے اپنی زندگی کے لیے جو لائحہ عمل بنایا ہے، اس میں میرے اپنے لیے تو کہیں کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

”میں انتظار کروں گا، جب تم اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاؤ گی، مجھے اپنا منتظر پاؤ گی، لیکن میں تمہیں اپنا پابند کرنا چاہتا ہوں، تاکہ مجھے یہ خوف نہ رہے کہ تم میری عدم موجودگی میں کسی اور.....“

”اور راحیل نے بھی انتظار کرنے کو کہا تھا لیکن.....“

”دیکھو رشک! میں جانتا ہوں کہ فی الحال تم اس پوزیشن میں نہیں ہو کہ میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں کہ تمہارے دل میں اپنے بہن بھائیوں کا خیال ہے۔ اس جنگ میں تم مجھے اپنا ہم قدم پاؤ گی۔ میں صرف ایک باریہ اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ تم میری ہو اور.....“

”پلیز کامل!“

رشک نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں نے آپ کے لیے ایسا کبھی نہیں سوچا اور پھر آپ جانتے ہیں کہ میں.....“

”میں جانتا ہوں، رشک۔“

کامل نے مہربان لہجے میں کہا۔

”لیکن ہر زخم بالآخر مندمل ہو جاتا ہے۔ وقت ضرور لگتا ہے مگر سارے زخم بھر جاتے ہیں اور سارے غم ہلکے ہو جاتے ہیں۔“

”شاید میں آپ کے ساتھ انصاف نہ کر سکوں، شاید میں آپ سے وہ محبت نہ کر سکوں

جو آپ کا حق ہے۔ اس طرح.....“

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں رشک، میں تم سے کبھی ایسا کوئی مطالبہ نہیں کروں گا، اگر تم مجھ

سے محبت نہ کر سکو گی تو یہ میرا نصیب ہو گا۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح رہیں گے اور میرے لیے صرف یہ اطمینان کافی ہو گا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، بس.....“

”مگر کامل!“

”اگر مگر کچھ نہیں رشک! یہ اتنی لمبی زندگی تم تنہا نہیں گزار سکتیں میں ایک دور و زمیں میں جی کے ساتھ آؤں گا اور تمہیں اپنا پابند بنالوں گا پھر چاہے صدیوں مجھے تمہارا انتظار کرنا پڑے۔“

اور وہ بونہی سر جھکائے بیٹھی رہی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کامل کی بات مان لے یا انکار کر دے۔ کون سا قدم اٹھائے۔

کامل اچھا تھا۔

مہربان اور شفیق۔

لیکن اس کا دل۔

وہ اپنے اس دل کا کیا کرتی، جو راحیل کے رویے سے ٹوٹ گیا تھا۔

راحیل جو بچپن سے اس کا دوست تھا جس نے ہمیشہ ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ جو دکھ سکھ کا ساتھ تھا۔ لیکن جس نے بغیر کسی وجہ کے اے رو کر دیا تھا، ٹھکرادیا تھا۔

اور یہ شخص کامل رضاءت!

جسے وہ صرف چند ماہ سے جانتی تھی۔

جو اس کے لیے اجنبی ہی تھا۔

لیکن جو مہربان اور شفیق لگتا تھا

جو اس سے محبت کا دعویٰ کر رہا تھا۔ جس نے انتظار کرنے کا وعدہ کیا تھا اور جس کی

آنکھوں میں۔ اور چہرے پر سچ لکھا تھا۔

کیا وہ اس کی محبت کو اس کی رفاقت کو ٹھکرادے یا پھر اس کی محبتوں سے اپنی خالی جھولی

بھر لے۔

اور زندگی کا سفر بہت طویل اور تھکا دینے والا ہے۔ کوئی تو ہو۔

جس کے کندھے پر سر رکھ کر رویا جاسکے۔

کوئی شجر سایہ دار، جس کی ٹھنڈی ٹیٹھی چھاؤں میں، تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ کر دھوپ

کی تمازتوں سے بچا جاسکے۔

ہاں کوئی تو ہو۔

جس کے مہربان سینے پر سر رکھ کر ساری تھکاوٹیں بھول جائیں، جس کے پاس بیٹھ کر سارے دکھ درد کہہ کر تھوڑی دیر کو آدمی ہلکا پھلکا ہو جائے۔

اور یہ شخص کامل رضاءت!

ایسا ہی مہربان تھا اور ایسا ہی شفیق

کسی ٹھنڈے شجر سایہ دار کی طرح۔

”کیا سوچنے لگی ہو رشک، کچھ مت سوچو، میری بات کا یقین رکھو، ہم اچھے دوست ہیں اور ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے اگر تم ایسا نہیں چاہتی ہو تو میں تمہیں اس کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔ تم اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو، اور بتاؤ، میں ماں جی کو ساتھ لے کر تمہارے گھر آؤں؟“

”ہوں۔“

رشک نے بالکل غیر ارادی طور پر اثبات میں سر ہلادیا۔

”تھینک یو..... تھینک یو رشک۔“

کامل کے بے تاثر چہرے پر مشعلیں سی جل اٹھیں۔

”میں کل شام کو آؤں گا۔“

”لیکن وہ نہ آسکا۔“

”سوری رشک۔“ اگلے دن اس نے معذرت کی۔

”میں نہ آسکا۔“ کل اچانک میری چھوٹی بہن کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ میں نے تمہیں ایک بار بتایا تھا کہ میری کزن کے دل میں سوراخ ہے تو میری وہ کزن میری سگی بہن ہے۔ یہاں اسی شہر میں میرے دو بھائی اور دو بہنیں اور امی رہتی ہیں۔ جب میں کراچی میں تھا تو ان سے اتنا قریب نہیں تھا، لیکن اب یہاں آیا ہوں تو خود بخود دل ان کی طرف کھینچتا ہے۔ میری یہ بہن بہت پیاری اور سادہ دل ہے، لیکن شاید اس کی زندگی بہت مختصر ہے، ڈاکٹروں نے بہت پہلے چھ ماہ پہلے ہی ناامیدی ظاہر کر دی تھی۔ مگر شاید اس کے اندر زندگی کی خواہش اتنی پادور فل ہے کہ وہ زندگی سے لڑ رہی ہے چھ ماہ پہلے بھی وہ موت کے منہ سے ہلکی تھی اور

اس نے کچھ سوچتی نظروں سے کامل کی طرف دیکھا۔  
 ”ہم ایک ہی آفس میں کام کرتے ہیں۔ میں نے کچھ رشپ کے لیے اپلائی کر رکھا ہے  
 اور جیسے ہی مجھے کچھ رشپ مل جائے گی میں یہ جاب چھوڑ دوں گی۔“  
 ان نے تفصیل بتائی۔  
 ”کامل یونیورسٹی میں بھی تھے، لیکن مجھے آج تک علم نہیں تھا کامل تمہارے بھائی  
 ہیں۔“

”ہاں کامل بھائی کو بتایا ابانے بچپن میں ہی لے لیا تھا۔“ کلثوم نے بتایا تو اس نے سوچا۔  
 تبھی جب اس نے پہلی بار کامل کو دیکھا تھا تو وہ اسے اجنبی نہیں لگا تھا۔ شاید عمار بھائی  
 سے کہیں اس کی شکل ملتی تھی اور آنکھیں..... آنکھیں تو بالکل صالحہ جیسی تھیں۔ سیاہ لمبی  
 آنکھیں، جن میں محبتوں کے سمندر موجزن تھے۔  
 ”کامل بھائی کیسے ہیں؟“ صالحہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

”اچھے ہیں، بالکل تمہاری طرح۔“  
 وہ مسکرائی۔

عمار اور کامل باہر چلے گئے شاید ڈاکٹر کے پاس۔ وہ بہت دیر تک بیٹھی صالحہ سے باتیں  
 کرتی رہی۔

”ایک مرتے ہوئے شخص کی آخری خواہش کو پورا کیا جاتا ہے ناں کوئی آپا، اگر میں  
 آپ سے کوئی خواہش کروں تو کیا آپ میری بات مانیں گی؟“  
 ”ہی! تم ابھی بہت سارے سال زندہ رہو گی۔“  
 ”نہیں بتائیں ناں۔“ اس نے ضد کی۔  
 ”تمہیں کچھ نہیں ہو گا گڑیا۔“  
 ”نہیں پلیز، پھر بھی وعدہ کریں ناں۔“  
 ”اچھا۔“ رشک نے وعدہ کیا۔

”تو پلیز! آپ کامل بھائی سے شادی کر لیں۔ آپ بھی بہت اچھی ہیں اور کامل بھائی بھی  
 اور آپ یہ کبھی نہ سوچے گا کہ کامل بھائی ہمارے بھائی ہیں وہ تو بتایا ابانے بیٹے ہیں۔“

اب ایک بار پھر موت اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اب پتا نہیں اس بار وہ یہ جنگ ہار جاتی ہے یا  
 جیت جاتی ہے۔“

”کوئی بات نہیں کامل! خدا تمہاری بہن کو زندگی اور صحت دے۔“  
 رشک نے اسے تسلی دی اور جب آفس ٹائم کے بعد وہ اس کے ساتھ اس کی بہن کو  
 دیکھنے ہسپتال آئی تو وہاں عمار اور کلثوم کو دیکھ کر حیران ہوئی ”تو..... تو..... کامل.....!“  
 ”کیسی ہو کوشی؟“ عمار اسے دیکھ کر بولا۔

”آپ..... آپ انہیں جانتے ہیں عمار بھائی؟“ کامل نے عمار سے پوچھا۔  
 ”اسی لمحے صالحہ نے اسے پکار لیا۔  
 ”کوشی آپا! آپ ادھر آجائیں میرے پاس۔ اس وقت تو میں خدا سے کچھ اور مانگتی تو وہ  
 بھی مل جاتا۔“

”تم نے پھر خود کو بیمار کر ڈالا گڑیا!“  
 ”میں تو کمبل کو چھوڑتی ہوں لیکن کمبل ہی مجھے نہیں چھوڑتا۔“  
 وہ مسکرائی۔ وہ بے حد زرد اور کمزور لگ رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں زندگی کی چمک  
 سے لبریز تھیں۔

”آج صبح سے ہی صالحہ کی طبیعت بہت بہتر ہے ورنہ کل تو اس نے ہمیں ڈرا ہی دیا تھا“  
 کلثوم نے بتایا۔

”اور کوشی آپا۔“  
 صالحہ کی نگاہیں بدستور اس کے چہرے پر تھیں۔  
 ”آپ ٹھیک ہیں ناں؟“  
 ”ہوں، بالکل۔“  
 ”مگر آپ کمزور لگ رہی ہیں۔“  
 ”نہیں تو۔“

اس نے ہنس کر اس کے رخسار تھپتھپائے۔  
 ”آپ کو کامل بھائی کہاں ملے؟“

اور خدا کی قسم ہم نے یہ کبھی نہیں چاہا تھا کہ مہک بھائی کو عمار بھائی چھوڑ دیں۔“  
وہ حیران سی صالہ کو دیکھتی رہ گئی۔

بھلا صالہ کے دل میں یہ خیال کیوں آیا تھا۔

”ابھی جب آپ اور کامل بھائی آئے تھے تو آپ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بہت اچھے لگ رہے تھے اور میں نے دل ہی دل میں دعا کی تھی کہ آپ دونوں اسی طرح ہمیشہ ساتھ رہیں اور اللہ میاں مرتے ہوئے شخص کی دعا ضرور پوری کرتا ہے۔“

وہ بچوں کی سی خوشی سے بولتی رہی۔

اور وہ اس سے اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے چلی آئی۔

اور پھر ایک، دو، تین دن گزر گئے۔ وہ ہر روز کامل کے ساتھ صالہ کو دیکھنے جاتی رہی اور اس روز اسے حسام کے ساتھ اس کا یونیفارم خریدنے بازار جانا تھا۔ سودہ صالہ کی طرف نہ جاسکتی اور اسی روز صالہ زندگی کی جنگ ہار گئی۔

اسے پتا چلا تو بے حد دکھ ہوا۔

کتنے ہی دن وہ ڈسٹرب رہی۔

وہ معصوم سی پیاری لڑکی۔

جس کا دل محبتوں بھر اترنا تھا۔

جو اس کی کوئی نہیں تھی۔

لیکن جس کے لیے اس کے دل میں بے پناہ محبت تھی۔

وہ کامل کے بازو پر سر رکھے کتنی دیر روتی رہی تھی۔ اور کامل اسے تسلی دیتا رہا تھا۔

”وہ اتنی ہی زندگی لے کر آئی تھی رشک، اور اسے جانا ہی تھا۔“

میں یا تم اسے روک نہیں سکتے تھے۔

ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی۔

اس کی موت کے پورے ایک گھنٹے بعد تک وہ اس کے دل کو شاک لگا لگا کر جھٹکے دے

دے کر زندہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

لیکن اسے تو جانا ہی تھا۔

اور جانے سے پہلے اس نے مجھ سے ایک وعدہ لیا تھا، وہ یہ کہ میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل کر لوں۔

”پگلی، اسے کیا پتا تھا کہ تم تو پہلے ہی میری رگوں میں لہو بن کے دوڑ رہی ہو۔“

اور ایسا ہی ایک وعدہ صالہ نے اس سے بھی تو لیا تھا۔

مگر شاید یہ ممکن نہ تھا آدمی جو کچھ سوچتا ہے وہ ہو نہیں سکتا اور جو نہیں سوچتا، وہ ہو جاتا ہے۔

مہک نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔

”عمار نے مجھے طلاق دی تھی اور آپ اسی کے بھائی کے ساتھ رشک کو بیاہ دیں گی اور وہ سب یہاں اس گھر میں آیا کریں گے۔“

اماں خود سوچ میں پڑی تھیں اور رشک شرمندہ سی بیٹھی تھی۔

”اماں مجھے تو ہر گز معلوم نہیں تھا کہ کامل، عمار بھائی کے بھائی ہے، وہ تو اس روز جب میں صالہ کو.....“

اس نے تفصیل بتائی۔

”تم جھوٹ بولتی ہو کوشی، تمہیں ہمیشہ سے وہ سب اچھے لگتے تھے، تم ثابت کرنا چاہتی ہو کہ میں بری تھی میں ان کے ساتھ نباہ نہیں کر سکی اور تم کر لو گی، ہاں میں بری ہوں۔ تم اچھی ہو، بہت..... جو اس شخص کے بھائی سے شادی کرنا چاہتی ہو جس نے مجھے.....“

”نہیں مہک آپا، آپ غلط مت سمجھیں۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”مجھے پتا ہے، میں جانتی ہوں، تم ان سے ملتی رہتی ہو، ان کے گھر جاتی رہتی ہو۔“

وہ چیخ چیخ کر روتی رہی اور رشک گود میں ہاتھ دھرے ساکت بیٹھی رہی۔

شاید اسے ساری عمر جینا تھا۔

اس کی قسمت میں کوئی شجر سایہ دار نہ تھا۔

جہاں وہ لمحہ بھر کو دھوپ کی تمازتوں سے بچ کر بیٹھ جاتی۔

راہیل ایک سراب تھا۔

تو کامل بھی ایک سراب ہی تھا۔

شاید زندگی اس پر کبھی مہربان نہیں ہوگی۔

کامل کو اماں کا فیصلہ پسند نہ تھ، وہ بار بار ان کے پاس آیا تو وہ جیسے ہارسی گئیں۔

”مہک، کامل بہت اچھا لڑکا ہے اور پھر عمار یا اس کی بہنوں میں سے کوئی ادھر ہمارے

گھر نہیں آئے گا۔ کامل کا اپنا گھر ہے اور.....“

”وہ عمار کا بھائی ہے اماں۔“ وہ چیخنے لگی۔

”جس نے زندگی کو میرے لیے عذاب بنایا اور آخر کار مجھے طلاق دے دی۔ آپ بے

شک رشک کی شادی کامل سے کر دیں، لیکن اس سے پہلے مجھے زہر لادیں، میں زہر کھا لوں

گی، مر جاؤں گی۔“

”مہک بیٹا، اپنا دل تھوڑا سا بڑا کر لے۔“

لیکن مہک اپنا دل بڑا نہ کر سکی۔

اور ابا کہتے تھے۔

”کوشی بیٹا! تو اپنا دل بڑا کرنا، اس کا دل بہت چھوٹا ہے۔“

اور اس نے اپنا دل بڑا کر لیا۔

اور وہ شجر سایہ دار جو اسے چھاؤں دینے کو بے قرار تھا۔ اس کے سائے تلے سے ہٹ کر

وہ جلتی دھوپ میں آکھڑی ہوئی۔

سر پر جلتا ہوا سورج تھا۔

اور پاؤں تلے تپتی زمیں۔

اور دور دور تک کوئی شجر سایہ دار نہ تھا۔

اماں کے انکار کے بعد ایک دن اچانک کامل کہیں چلا گیا۔

اس نے آفس کی جاب چھوڑ دی اور اسے کالج میں لیکچرر شپ مل گئی تھی۔ زندگی میں

ایک ٹھہراؤ سا اگیا تھا کہ راجیل واپس آگیا۔ وہ وہاں ایڈ جسٹ نہیں ہو سکا تھا اور تعلیم ادھوری

چھوڑ کر پلٹ آیا۔ اس روز کالج سے نکلتے ہوئے یوں ہی اسے گمان سا گزرا تھا کہ سفید نشان میں

راجیل تھا۔

تو کیا وہ اب راجیل کو سوچتی ہے۔

اسے حیرت ہوئی تھی۔

اسے دوسروں پر راجیل کا گمان ہونے لگا ہے۔

لیکن پھر ندانے تصدیق کر دی کہ راجیل پلٹ آیا ہے۔

وہ راجیل سے ملنے نہ جاسکی۔

اماں نے کہا بھی لیکن وہ سوچتی ہی رہی اور دن گزرتے رہے۔

راجیل جب گھر آتا تو وہ گھر پر نہ ہوتی اور یوں وہ راجیل سے نہ مل سکی۔

مہک ان دنوں بہت خوش رہنے لگی تھی اس نے ایک دوبار اسے غور سے دیکھا شگفتہ

شگفتہ سے چہرے کے ساتھ وہ بہت خوبصورت لگتی تھی اور کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی بہت

اچھا.....!

بہت امیر شخص مہک کو پسند کر لے۔

اور مہک اپنی من پسند زندگی گزار سکے وہ دعا کرتی۔

وہ اب بھی مہک کے لیے سب سے اچھی چیز لے کر آتی تھی، جیسے ابا کی زندگی میں تھا۔

اسے معمولی کپڑا اور جوتے پسند نہیں آتے تھے اور اب وہ اس قابل تھی کہ اس کے لیے

منگے جوتے خرید سکے۔

چلو زندگی میں کچھ تو ٹھہراؤ پیدا ہوا۔

گھر میں سکون اور اطمینان تھا۔ ایسے میں دلدار ماموں نے راجیل کے لیے مہک کا رشتہ

مانگ لیا۔ اماں گنگ سی بیٹھی انہیں دیکھتی رہی۔

”میرے نزدیک مہک اور رشک دونوں ایک جیسی ہیں۔“ انہوں نے وضاحت کی

میں بہت شرمندہ رہتا تھا کہ میرا انتخاب اچھا ثابت نہ ہو اور مہک کو اجڑا پڑا۔“

”نہیں دلدار بھائی! آپ جانتے ہیں قصور مہک کا بھی تھا۔“ اماں ابھی تک حیرت کے

سمندر میں تھیں۔ ”آپ نے راجیل سے بھی پوچھا۔“

”میں اس کی ایما پر آیا ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ وہ درد جو انجانے میں، میں نے مہک

بچی کو دیا تھا وہ اس کا درد ماں بن رہا ہے۔“

”مگر۔“



اماں کا دل نہیں مان رہا تھا۔ رہ رہ کے آنکھوں کے سامنے رشک کا چہرہ آ رہا تھا۔  
ان کی سادول، محبت کرنے والی بیٹی کے نصیب اور راحیل کو تو انہوں نے ہمیشہ رشک کے دولہا کے روپ میں دیکھا تھا۔  
”آپ ایک دو دن سوچ لیں۔“ دلدار ماموں نے کہا۔ وہ ان کے دل کی کیفیت سمجھ رہے تھے۔

”ہماری کوشی بیٹی کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ وہ اتنی اچھی، اتنی پیاری اور محبت کرنے والی ہے کہ جس گھر میں جائے گی، اس کا مقدر سنور جائے گا، لیکن ممک کے لیے شاید باہر سے.....“

”اور یہ بھی اچھا ہے کہ راحیل نے اس کی خواہش کی، ورنہ میں ممک کے لیے بہت پریشان تھا۔“

”میں کس طرح آپ کی محبتوں اور مہربانیوں کا شکریہ ادا کروں۔ دلدار بھائی! کہاں کہاں، کس کس موقع پر آپ نے ہاتھ تھاما۔“  
”ایسی باتیں نہ کرو، میں تم لوگوں کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا۔“

پھر کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلے گئے اماں نے رشک کو بتایا تو اس نے ان کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے اماں، راحیل کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ وہ آپا کی خواہشوں کو پورا کر سکے، لیکن آپ پہلے آپا سے پوچھ لیں۔“

اماں کی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں، لیکن وہ بالکل بے تاثر تھا۔ کسی ملال کا کوئی رنگ، کسی دکھ کا کوئی بادل اس کے چہرے پر نہیں اتر رہا تھا، وہ اسی طرح ان کی پاستی بیٹھی ان کے پاؤں دباتی رہی۔

”میری عظیم بیٹی۔“ انہوں نے دل ہی دل میں اسے دعا دی۔ اور گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

ممک کی دوسری شادی سی لیکن راحیل کی تو پہلی شادی تھی اور ممانی ہر رسم کرنا چاہتی تھیں۔ اگرچہ دلدار ماموں نے سادگی اختیار کرنے کو کہا تھا پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

کالچ سے آکر مصروف ہو جاتی۔

نندا، اماں سب کی نظریں اس کے چہرے کا طواف کرتیں۔ حتیٰ کہ ممک کی نظریں بھی اسے کھوجتی تھیں، مگر وہ شاید پتھر ہو گئی تھی۔

”اجنبی“ کے ہیر کی طرح بے حس اور حقیقت پسند۔ کسی دکھ کا کوئی کاٹنا اس کے دل میں نہیں چبھا تھا اور کسی خوشی کی کوئی رقمق اس کے دل میں پھول نہیں کھلاتی تھی۔

ممانی کتنی بار اسے بلا چکی تھیں اور اس روز تو ٹکیلی صبح آکر ہی اسے لے گیا تھا۔  
”آج چھٹی کا دن ہے اور امی نے حکم دیا ہے کہ آپ تشریف لے آئیں۔ امی کو بھی کسی بیٹی کی مدد کی ضرورت ہے اکیلی وہ بے چاری کیا کیا کریں۔“

وہ اسی طرح شور مچاتا ہوا اسے ساتھ لے گیا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے ٹیپ چلا دیا۔

”یہ کیا فضول گانا ہے ٹکیلی، کیا شور مچاتا ہو اسرا۔“

”خوش ہو رہا ہوں بلکہ خوش ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”کیوں کوشش کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہارے بھائی کی شادی خوشی کا جواز ہے۔“

”بعض اوقات جواز ہوتا ہے پھر بھی آدمی کے اندر سے خوش نہیں پھوٹتی۔“

”بڑا فلسفہ بول رہے ہو۔“

وہ ہنسی۔ جانتی تھی کہ وہ اس سے نگاہیں ملا کر بات نہیں کرنا چاہتا۔ وہ سب اس سے نگاہیں چرار ہے تھے۔ ٹکیلی، عقیل، ماموں اور ممانی سب۔

”آخر ہوا کیا ہے، کون سا اس کی راحیل کے ساتھ باقاعدہ منگنی ہوئی تھی بس ذرا سی بات ہی تو تھی اور کبھی کبھی ایسا تو ہو جاتا ہے کہ آدمی اچانک راستہ بدل لے اور پھر آدمی کو چاہیے کہ وہ حقائق کو قبول کر لے۔ زندگی ہے تو ایسے حادثات ہوتے رہیں گے۔“

ٹکیلی خود بھی بلند آواز میں گارہا تھا۔

”یہ کیا حماقت ہے ٹکیلی؟“ اس نے ہاتھ بوہا کر ٹیپ بند کر دیا۔

”تم سب لوگ مجھ سے نظر کیوں نہیں ملاتے ہو۔ میں نے کوئی جرم کیا ہے یا تم نے؟“

ٹکیل نے لب پہنچ لیے اور خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

”کیا میں سمجھوں کہ میں نے سارے رشتے کھود دیے ہیں بغیر کسی قصور کے وہ میرے دوستوں جیسے بھائی ٹکیل، عقیل، میری پیاری ممانی، پر خلوص سے ماموں..... نہیں۔“

ٹکیل نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ ”نہیں کوئی، آپ تو ہم سب کو اب بھی اتنی ہی عزیز ہیں۔“

”تو پھر مجھ سے یہ بے رحمانہ سلوک مت کرو، مجھے یہ تاثر مت دو کہ میں تم سب سے دور ہو جاؤں، مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوا ہے۔؟“

”کچھ نہیں..... کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”بس ذرا تھکاوٹ سی تھی اور آپ نے جانے کیا سمجھا۔ آہا! یاد آیا، مندی والی رات کو ذرا ادھیان رکھے گا جس لڑکی کی طرف میں نے اشارہ کر دیا اسے نگاہ میں رکھ لیجئے گا۔“

وہ باتیں کرنے لگا اور رشک نے اطمینان بھر اسانس لیا۔

ممانی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

”شکریہ بیٹا تم آگئی ہو، یہ بری کے کپڑے ہیں، تم دیکھ لو، سیٹ کرو، ٹانگ دو، مجھے کچھ پتا نہیں۔“

”اچھا۔“ اس نے خوش دلی سے کہا اور اٹیچی کھول کر بیٹھ گئی۔

وہ سارا دن مصروف رہی اور عقیل اور ٹکیل بھی اس کے پاس بیٹھے اپنی باتوں سے اس کا دل ہلاتے رہے۔ مدتوں بعد وہ یوں دل کھول کر ہنسی تھی۔ عقیل باتیں ہی ایسی کرتا تھا کہ بے اختیار ہنسی آتی تھی۔ ممانی نے اسے ہنستے دیکھا تو اس کی پیشانی چوم کر دعا دی۔

”خدا کرے تو یونہی ہنستی رہو ہمیشہ، خدا تمہارا مقدر اچھا کرے۔“ اور پھر آنکھوں میں بے اختیار آنسو آنے والے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے باہر نکل گئیں۔

”یہ امی جان آج کل بڑی رقیق القلب ہو رہی ہیں، بات بات پر ان کے آنسو نکل آتے ہیں جیسے بیٹا نہیں بیٹی بیاہ رہی ہوں۔“ ٹکیل نے تبصرہ کیا۔

”ایک ہی بات ہے، بیٹی نہیں تو بیٹا تو رخصت کر ہی رہی ہیں۔ مکہ آیا ادھر ہمارے ساتھ کہاں رہیں گی وہ تو راحیل بھائی کے ساتھ الگ گھر میں رہیں گی کیوں کوئی؟“

”پتا نہیں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا دو پنا تہہ کر کے اٹیچی میں رکھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ راحیل بھائی نے اپنا فیصلہ۔“ عقیل کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ٹکیل نے اسے ٹوک دیا۔

”یاد دیکھو امی جان کیا کہہ رہی ہیں۔ اچھی سی چائے تو بنواؤ، موڈ ہو رہا ہے۔“

”اچھا۔“

عقیل سمجھ گیا کہ کہ ٹکیل نہیں چاہتا کہ وہ راحیل کے متعلق اس طرح کی کوئی بات رشک سے کرے۔

چائے پی کر ٹکیل بھی کسی کام سے باہر چلا گیا تھا۔ ممانی کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اس کا کام بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں موند کر دیوار سے ٹیک لگائی۔

”کوئی۔“ راحیل نہ جانے کب اندر آیا تھا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

”کوئی!“ وہ اس کے بالکل سامنے آکر بیٹھ گیا۔ ”میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں کنکریں سے چھینے لگے، لیکن وہ نگاہیں جھکائے بیٹھی رہی۔

”کوئی! پتا نہیں یہ سب کیسے ہو گیا، کیوں ہو گیا، میں تم سے کیوں بدگمان ہوا،

میں.....“

”اب ان باتوں کا کیا فائدہ، یقیناً مجھ سے کہیں کوئی غلطی ہوئی ہوگی راحیل، جس سے تم بدگمان ہوئے۔“

”نہیں غلطی تو مجھ سے ہوئی کوئی! میں مکہ کی باتوں میں آگیا تھا۔ میں نے سمجھا کہ

تم.....“ وہ ذرا دیر کو رکھا جیسے الفاظ ڈھونڈ رہا ہو۔

”میرے خیال میں اب یہ ذکر لا حاصل ہے۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”تم ایک نئی زندگی کا

آغاز کرنے والے ہو اس کے متعلق سوچو، جو گزر رہا سو گزر گیا۔“

”پلیز کوئی! دو منٹ رک جاؤ، میری بات تو سن جاؤ، میں بہت پریشان ہوں۔ کل سے

میں سویا نہیں ہوں۔ کل شام کو کامل ملا تھا مجھے۔“

”کامل!“ اس کے دل یک دم دھڑکا۔

وہ مہربان اور شفیق دوست۔

کتنے دنوں سے وہ اسے نہیں ملا تھا۔

پتا نہیں اچانک وہ کہاں چلا گیا تھا۔

”ہاں، کامل نے مجھے بتایا کہ تم.....“

”اچھا تو کامل نے.....“

ریشک نے سوچا، کامل کو تو اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ ایک ایک بات راحیل کی غلط فہمی اور مہک کی..... بدگمانی سب کچھ۔

”تھینک یو مہربان دوست۔“ اس نے دل ہی دل میں کامل کا شکریہ ادا کیا۔

”کامل نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں منالوں اور.....“

”میں تم سے خفا نہیں ہوں۔“ اس نے نرمی سے کہا۔

”مجھے پتا تھا تم مجھ سے خفا نہیں ہو گی۔ تم مجھ سے خفا نہیں ہو سکتیں تم..... تم بہت اچھی ہو کو کوشی، میں نے تمہیں بہت پریشان کیا، لیکن اب میں اس سارے دکھ کی تلافی کر دوں گا اور تمہاری جھولی میں اتنی خوشیاں ڈالوں گا کہ..... میں ابھی امی سے بات کرتا ہوں کہ مہک نہیں تم..... اور صرف تم ہی میری زندگی کی ساتھی ہو سکتی ہو۔“

”راحیل! ریشک کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔“ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ شادی بیاہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ تین دن بعد تمہاری بات ہے اور تم فیصلہ بدل رہے ہو، تم ہوش میں تو ہو۔“

”ہاں میں ہوش میں ہوں، میں تمہارے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔“

”سوری راحیل! یہ تمہیں پہلے سوچنا تھا اور میں ایسی لڑکی نہیں ہوں جو مہک آپا کی خوشیوں کے مزار پر اپنی خوشیوں کا محل تعمیر کروں، سوری راحیل۔“

”کو کوشی! مہک کی غلط بیانی کا راز کھلنے کے بعد میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکوں گا، میں اسے محبت نہیں دے سکوں گا۔“

”کوشش کرنا، مہک آپا اتنی بری نہیں ہیں۔ خواہشوں کی نا آسودگی نے شاید انہیں ایسا بنادیا ہے۔ بچپن سے ہی اس کی پسند اونچی تھی اور جب وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتی تھیں تو

الچلی تھیں، تم انہیں محبت دو گے، اعتماد دو گے اور ان کی خواہشوں کو پورا کر دو گے تو وہ اچھی رہتی ثابت ہوں گی۔“ ریشک نے تحمل سے سمجھایا۔

”لیکن کوشی۔“ اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ ”میں.....“

”پلیز راحیل! اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر دو اور خود کو اور اپنے گھر والوں کو تماشانہ بناؤ۔“ اور وہ اپنی بات مکمل کر کے تیزی سے باہر نکل آئی۔

راحیل اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اسے رک نہیں سکتا تھا۔ مٹا نہیں سکتا تھا کہ ڈور اس کے ہاتھ سے چھٹ چکی تھی۔

مہک جو اس کی زندگی کی رفیق بننے چلی تھی

اس سے تو اس نے کبھی محبت نہیں کی تھی۔

کبھی اس کے ساتھ دعا نہیں مانگی تھی۔

کبھی..... اور پتا نہیں کن جذباتی لمحوں میں اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا..... وہ ریشک سے الٹا تھا کیوں ہو گیا تھا کہ اس نے اس سے سارے ناتے ہی توڑ لیے۔

کاش ایک بار وہ اس سے پوچھ تولیتا کہ وہ عمار کے ساتھ کیوں تھی۔ اور پھر..... پھر شاید ایسا نہ ہوتا۔

اسے لگا جیسے قطرہ قطرہ زہر اس کی رگوں میں اتر رہا ہو، پچھتوے کا، ندامت کا دکھ کا زہر اور شاید اب یہ زہر اس نے ساری عمر پیتا تھا۔

یونہی قطرہ قطرہ کر کے۔

کہیں سے تریاق ڈھونڈ لاؤ۔

مگر کہاں سے؟

نہ کوئی حاتمہ نہ خضر ہم ہیں۔

کہاں ہے راہ نجات

صدیوں کے بعد بھی دل یہ پوچھتا ہے۔

مگر دشتِ امکاں میں۔

ایک صرف سوال ہے۔

اور کچھ نہیں ہے

کیوں کیا میں نے ایسا..... کیوں؟

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور وہیں بیٹھ گیا اور ایک درد..... گھر اور اس کے دل کو چھلنے لگا۔

☆☆☆☆☆

وہ آج بہت خوش تھی کہ بالآخر اس نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔

اور آج اب اس کی روح کتنی خوش ہو گی۔ اس نے دل میں ایک اطمینان سا محسوس کیا۔

نہ اور ثناتوں کی بہت اچھی جگہ شادیاں ہو گئی تھیں۔

ثنا نے بی۔ اے کر لیا تھا۔ نہ ابھی فور تھ ایئر میں تھی لیکن دونوں کے بہت اچھے رشتے آئے تو اس نے سوچا اچھا دونوں کے فرض پورے ہو جائیں۔ نہ انے خوب شور مچایا، لیکن اس نے اماں کو منالیا۔

اور اب دونوں کی رخصتی کے بعد وہ واپس گجرات جا رہی تھی۔ تقریباً ایک سال سے اس کی ٹرانسفر گجرات کالج میں ہو گئی تھی۔ وہ ہر جگہ گھر آ جاتی تھی اور آج پورے ایک ماہ کی چھٹیوں کے بعد وہ واپس جا رہی تھی۔

زندگی کا سفر مشکل ضرور تھا، لیکن طے ہو ہی گیا۔

سب کچھ اس کی خواہشوں اور آرزوؤں کے مطابق تھا۔

مہک شروع میں کچھ ڈسٹرب رہی۔

راحیل کا رویہ اس کے ساتھ کچھ زیادہ بہتر نہ تھا۔

لیکن رشک نے راحیل کو اس کا وعدہ یاد دلایا۔

”راحیل، ہم دوست تھے اور تمہیں یاد ہے کہ تم نے ہمیشہ میرے غم بانٹنے کا وعدہ کیا تھا۔“

”ہوں۔“

”تو پھر مہک کو خوش رکھو۔“

اور راحیل، مہک کو لے کر ملک سے باہر چلا گیا تھا اور مہک خوش تھی اور نام بھی۔ بارہ

ہر خط میں معافی مانگتی تھی۔

حسام کالج میں آگیا تھا۔

بس تھوڑا سا سفر باقی تھا۔

اور پھر اب اس کی آرزو کے مطابق سب کچھ ہو جائے گا۔

کاش..... کاش اباز نہ ہوتے۔

اس نے سیٹ سے سر ٹیک لیا۔

سب کچھ ٹھیک ہے۔

پھر بھی دل خالی خالی لگتا ہے۔

جیسے کچھ کھو گیا ہو، گم ہو گیا ہو۔

اور وہ کامل رضا باٹ۔

وہ پتا نہیں کہاں تھا۔

اس روز راحیل کے گھر سے واپسی پر وہ کامل کی طرف چلی گئی تھی لیکن کامل جا چکا تھا۔

ماں جی نے بتایا کہ وہ تو بس رات بھر ہی ٹھہرا تھا پھر چلا گیا۔

اور مہک لکھتی تھی۔

”کوشی! کامل ملے تو اس سے شادی کر لینا۔“

وہ بھی عمار جیسا ہی ہو گا۔

محبت کرنے والا دوست اور مہربان۔

میرے بے چین دل کو تب ہی سکون ملے گا جب تم۔“

اور وہ کامل جس کے ساتھ اس نے کوئی عہد دیہاں نہیں کیے تھے۔ وہ اکثر اس کے

تصور میں چلا آتا تھا۔

اپنے مہربان اور شفیق لہجے میں بات کرتا ہوا۔

اپنی سیاہ آنکھوں کے پسندیدہ میں محبتوں کا طوفان سمیٹے اے سکتا ہوا۔

”رشک..... رشک ماہ!“ قریب ہی کسی نے سرگوش کی تو چونک کر سیدھی ہو گئی۔

”میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“

”یہ آواز..... یہ آواز.....“

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ”کامل..... ہاں کامل! سیٹ کی پشت پر ہاتھ رکھے اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں وہی محبتوں کا سمندر موجزن تھا۔  
”کامل!“ وہ خوشی اور حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔  
”میں ابھی تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔“  
”تم میرے بارے میں سوچتی ہو؟“ کامل اس کے قریب بیٹھ گیا۔  
”ہاں، تم کہاں چلے گئے تھے؟“

”میں بارہ مولا کپواڑہ میں مجاہدین کے ساتھ تھا۔ کوشی کیا تمہیں خبر نہیں کہ وہاں کشمیر میں ظلم حد سے بڑھ گیا ہے۔“

”اور جب ظلم حد سے بڑھ جائے تو ساری زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں کامل۔“ رشک نے اپنے دل میں بڑی طمانیت محسوس کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”ہاں انشاء اللہ بہت جلد ظلم ختم ہو جائے گا۔ تم کیسی ہو اور کہاں جا رہی ہو؟“  
”میں گجرات جا رہی ہوں آج کل وہاں کے کالج میں ہوں اور کیسی ہوں..... تو اچھی ہوں۔“

”رشک! میں تمہارے بارے میں بہت سوچتا تھا اور میں نے تمہارے لیے بہت دعائیں کیں اور مجھے یقین ہے کہ میری دعائیں ضرور قبول ہوئی ہوں گی راجیل کیسا ہے کیا اس کی بدگمانی دور ہوئی؟“

”راجیل اچھا ہے، وہ اور ممک آپا آج کل سعودی عرب میں ہیں اور ان کا ایک بیٹا بھی ہے، گپلو سا، نیلی آنکھوں والا.....؟“

”راجیل اور ممک؟“ کامل کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

”ہاں، راجیل اور ممک آپا کی شادی ہو گئی تھی۔“ اس نے بڑے نارمل انداز میں بتایا۔

”لیکن میں نے تو راجیل کو.....“

”ہاں، تم نے راجیل کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی۔“ رشک نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”لیکن بہت دیر ہو چکی تھی کامل۔“

”کیا اب مجھے بھی دیر ہو گئی ہے؟“ کامل کے بے تاثر چہرے رنگ سے دوڑاٹھے۔ اور آنکھوں میں جگنو سے چپکنے لگے۔

”نہیں۔“ رشک نے نگاہیں جھکا لیں۔

”ہاں! ابھی دیر نہیں ہوئی۔“ کامل نے سرگوشی کی۔

”کیسے سے تریاق ڈھونڈ لاؤ۔“

ابھی بدن میں ہے جان باقی۔

ابھی لبوں پہ ہے زندگی سی

کیسے سے تریاق لے کے آؤ

اس سے پہلے

کہ زندگی

ساتھ چھوڑ جائے۔

”ہاں، ابھی دیر نہیں ہوئی رشک! میں تو شہادت کی آس لے کر گیا تھا، لیکن شاید خدا نے مجھے تمہارے لیے بچالیا مگر.....“ کامل نے اس کے کان میں..... سرگوشی کی۔

”مگر کیا؟“ رشک نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا

”مگر ممک آپا اور تمہارے گھر والے۔“

وہ سب..... وہ سب تمہارے منتظر ہیں کامل!“

”اوہ! میرے نصیب اتنے اچھے کہاں تھے رشک! لیکن خواب تو نہیں دیکھ رہا۔“

”نہیں۔“ وہ مسکرائی

کامل نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

”اب یہ ہاتھ کبھی نہیں چھوڑنا۔“

میری اپنی رشک۔

رشک ماہ کامل۔

”گجرات..... گجرات!“ کنڈیکٹر دروازے پر کھڑا آواز لگا رہا تھا۔

اور کامل کی وارفتہ نظریں رشک کے چہرے پر تھیں۔

اور رشک کی نظریں حیا کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔

اجساں ہوا کہ وہ کیسے احمقوں کی طرح بالکل گاؤں کی گنوار لڑکیوں کی طرح رو رہی ہے۔  
 تو اس نے جلدی سے منہ بند کر لیا اور آنکھیں صاف کر لیں اور اندر ہی اندر شرمندہ  
 ہوتے ہوئے سمیر اور کرن کی طرف دیکھا۔  
 ”سوری! میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔“

”نہیں۔ نہیں۔ ہم ڈسٹرب تو نہیں ہوئے۔ تمہاری بی جان کو کیا ہوا تھا ندیا۔“  
 ”بی جان کو“ اس نے چارپائی پر پڑا سنی ماموں کا خط اٹھا کر پڑھا

اور بی جان رات کو عشا کی نماز پڑھ کر سوئی تھی۔ ٹھیک ٹھاک۔ سنی ماموں سے  
 سونے سے پہلے اس کے متعلق پوچھا تھا کہ وہ کیسی ہے اور یہ کہ جانے ہوٹل میں اس کا  
 دل لگا کہ نہیں اور یہ کہ اگر سنی کو فرصت ہو تو چند دن کے لئے اسے گھر لے آئے۔

”ہائے۔“ اس نے سسکی لی۔ ”کتنی اچھی تھیں بی جان۔“ اس نے زیر لب دہرایا  
 اور سوچا کہ وہ انہیں کیا بتائے کہ بی جان اس کی کون تھیں۔ بظاہر تو اس کا ان سے کوئی  
 رشتہ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ وہ اس کے سنی ماموں کی ساس تھیں لیکن وہ اس کی  
 سب کچھ تھیں۔ ماما اور بابا کے فارن جانے کے بعد بی جان نے کس طرح اس کا خیال رکھا  
 تھا، جیسے وہ اس کی ماں ہوں۔ جب ماما اور بابا اسے ماموں کے پاس چھوڑ کر جا رہے تھے وہ  
 لٹکالٹکالٹک بلک کے روئی تھی اور وہیں پہلی بار اس نے بی جان کو دیکھا تھا۔ سفید شوار قمیص  
 اور سفید لمبل کا دوپٹہ لپیٹے وہ تخت پر بیٹھی اسے روتے دیکھ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے  
 ہاتھ میں پکڑی تسبیح نیچے رکھ دی اور اسے آکر اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

”نہ رو بچی!“

اور ان کے سینے سے لگ کر اسے بڑا سکون ملا تھا۔

کچھ عرصہ وہ سنی ماموں کے ہاں رہی تھی اور پھر سنی ماموں اسے مری ہوٹل میں  
 چھوڑ آئے تھے۔ اور وہاں مری میں وہ کتنا بور ہوتی تھی۔ اور چھٹیوں میں جب سنی

## بس ایک بار

بی جان کی موت اس کے لئے ایک حادثے سے کم نہ تھی۔ سنی ماموں کا خط پڑھ کر  
 وہ یوں حلق پھاڑ پھاڑ کر روئی کہ روم نمبر ۳ سے سمیر احسن ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی آئی  
 اور اسے یوں چیخ چیخ کر روتے دیکھ کر اشارے سے کرن حیدر سے پوچھا کہ اسے کیا ہوا۔  
 ”پتا نہیں۔“ کرن خود حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے تو خود سمجھ نہیں آرہی  
 تھی کہ یہ یکا یک نادرہ کو کیا ہو گیا ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے تو وہ اسے بھلا چنگا چھوڑ کر  
 ہاتھ روم گئی تھی اور دس منٹ میں ایسی کیا آفت آگئی تھی۔

”ندیا کیا ہوا پلیر، بتاؤ نا؟“ سمیر اور کرن نے ایک ساتھ پوچھا۔

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے بتایا۔ ”بی جان فوت ہو گئیں۔“

بی جان اس کی کون تھیں، نہ تو سمیر کو خبر تھی اور نہ ہی کرن کو مگر وہ جو اس طرح  
 رو رہی تھی تو یقیناً کوئی بہت ہی قریبی رشتہ ہوگا۔

کرن اس کے پاس بیٹھ کر اسے تسلی دینے لگی۔ بڑی دیر بعد وہ سنبھلی تو اسے

سچی بچی کو جدا کر دیا ہے لیکن پاپا نے ماما کی ایک بات نہ سنی تھی اور جب چھٹیاں ختم ہونے لگیں تو پاپا نے اسے دادا ابا کے پاس بھیجنے کا حکم سنایا۔ ماما نے جھگڑا کیا۔ وہ اسے گاؤں نہیں بھیجنا چاہتی تھیں لیکن پاپا نے تو ہمیشہ اپنی ہی منوائی تھی مگر ہوا یوں کہ اس کے جانے سے صرف دو دن پہلے اچانک ہی دادا ابا کا انتقال ہو گیا اور اس کا مسئلہ وقتی طور پر دب گیا۔ پاپا فوری طور پر پاکستان چلے گئے اور اسے دادا ابا کے مرنے پر بڑی عجیب سی خوشی ہوئی کہ چلو اب وہ پاکستان نہیں جائے گی مگر پاپا جب واپس آئے تو وہ اسے پھپھو کے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر آئے تھے۔

”پھپھو کے گھر!“ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ اس سے تو اچھا تھا دادا ابا نہ مرتے، پھپھو کا حقہ پینا، ان کی درجنوں مرغیاں ادھر سے ادھر بے تکلفی سے صحن میں گندگی پھیلاتیں۔ ان کے چاروں بیٹے جن کی ناکیں مسلسل بہتی رہتی تھیں اور جنہیں وہ ہمیشہ کرتے یا قیص کے دامن سے صاف کر لیا کرتے تھے۔

اسے ڈھیروں رونا آیا۔

”ہائے دادا ابا۔“ وہ چیخیں مار مار کر روئی۔

پاپا نے اسے لپٹا لیا۔

”ارے میری بچی کو دادا ابا سے اتنا پیار تھا۔“ انہوں نے اس کے رخساروں پر بوسہ دیتے ہوئے کہا اور بڑے پیار سے موت و زندگی کا فلسفہ سمجھانے لگے۔

پھر اس کی تیاری مکمل ہو گئی۔ پاپا کے بجائے ماما سے چھوڑنے آئی تھیں کیونکہ پاپا کو اب اتنی جلدی دوبارہ چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ اور ماما کو پھپھو کے گھر کا ماحول ایک آنکھ نہیں بھلایا اور کئی دن تک فون پر لمبے لمبے مذاکرات کرنے اور طویل خط لکھنے کے بعد ماما، پاپا کو اس بات پر رضامند کر سکی تھیں کہ اسے مری ہو سٹل میں داخل کر دیا جائے اور سنی ماموں کو اس کا گارجین بنادیا جائے۔ سنی ماموں اسلام آباد میں تھے اور

ماموں اسے گھر لاتے تو وہ بی جان کے بستر میں گھس کر مونگ پھلیاں اور چلغوزے کھاتے ہوئے ان سے کہانیاں سنتی۔ اور اسے بڑا اچھا لگا کرتا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے لئے بڑا انا کھا اور نرا لٹا تھا۔ ماما اور پاپا دونوں سر دس کرتے تھے۔ جب وہ بہت چھوٹی تھی تو ماما اسے دفتر جانے سے پہلے بے بی کیئر ہوم چھوڑ جاتیں اور شام کو جس کو بھی پہلے چھٹی ہو جاتی وہ اسے لے جاتا اور جب وہ ذرا سا بڑی ہوئی تو پاپا کو اس کی فکر لگ گئی۔

”یہاں کا ماحول ٹھیک نہیں۔ بچیوں کو اپنے ہی ملک میں تعلیم دینی چاہئے۔ یہاں پلنے والے بچے اپنے کلچر، اپنے ماحول اور اپنی ثقافت سے بہت دور ہو جاتے ہیں۔“

اتنے برسوں سے انگلینڈ میں رہنے کے باوجود وہ اندر سے کچھ مذہبی تھے۔ کہ مئی کی مخالفت کے باوجود اسے گاؤں دادا ابا کے پاس چھوڑ گئے۔ دادی ماں تو تھیں نہیں اور گاؤں میں اس کا ذرا بھی دل نہ لگتا۔ گھر میں تھا ہی کون۔ ایک ”جھلڑ۔“ سانو کر اور ایک ماسی نوراں اور پھر گاؤں میں پھوپھی کا گھر تھا۔ جب اس کا بہت دل گھبرا اٹا اور وہ رونے لگتی تو دادا جان اسے ان کے گھر لے جاتے۔ اور وہاں جا کر اس کا دل اور بھی گھبرا اٹا۔ کچی مٹی کا صحن اور اس میں کڑکڑ کرتی مرغیاں اور مرغیاں بھی ایسی ڈھیٹ کہ جس کا جہاں دل چاہتا وہیں استراحت فرمانے لگتی۔ اور پھر دادا ابا کے آنے پر پھوپھی سرخ پیڑھی ان کی چارپائی کے پاس رکھ کر ”حقہ“ پیتی تھیں اور جب وہ گڑگڑ کر کے دھواں اندر کی طرف کھینچتی تھیں تو اسے بہت عجیب لگتا۔ اس نے کبھی کسی عورت کو حقہ پیتے نہیں دیکھا تھا اور پھوپھی کے ننگ دھڑنگ بیٹے تو اسے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے جو موقع ملے ہی کبھی اس کا رہن نوچ لیتے اور کبھی پاؤں مسل ڈالتے اور وہ رات کو بستر پر لیٹ کر چپکے چپکے روتی تھی۔ وہ کتنی کمزور ہو گئی تھی۔ دادا ابا نے شاید پاپا کو خط لکھا تھا کہ چھٹیوں میں اسے اپنے پاس بلا لیں۔ بچی تمہارے لئے ادا اس ہو گئی ہے۔ اور جب پاپا اسے لے کر گئے تو وہ ماما کے گلے لگ کر اتار روئی تھی کہ ماما پاپا سے بہت دیر تک جھگڑتی رہی تھیں کہ اتنا

انکے لئے ویک اینڈ پر اسے لانا لے جانا آسان تھا اور یوں سنی ماموں کے گھر اس نے پہلی بار بی جان کو دیکھا تھا۔ سنی ماموں بے اولاد تھے۔ ان کی بیوی کے علاوہ گھر پر ان کی ساس بھی رہتی تھیں۔ بلکہ یہ گھر ہی بی جان کا تھا۔ مامی بی جان کی اکلوتی بیٹی تھیں اور شادی کے بعد سنی ماموں راولپنڈی سے اسلام آباد بی جان کے بے حد اصرار پر گئے تھے۔

سنی ماموں اور بی جان سے اس کی بہت دوستی تھی۔ البتہ آنٹی کچھ سنی تھیں۔ موڈ ہوتا تو بہت خوش دلی سے بات کرتیں، موڈ نہ ہوتا تو اتنی کھر دری اور تلخ ہوتیں کہ اسے ان سے بات کرتے بھی خوف آتا تھا۔ ایسے میں سنی ماموں اکثر اسے پہلے سے ہی باخبر کر دیتے تھے کہ مطلع ابر آلود ہے۔ شاید اولاد سے محرومی نے انہیں ایسا بنادیا تھا اور جب ان کا موڈ خراب ہوتا تو وہ سارا وقت بی جان کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ بی جان کے ساتھ اس نے بہت سے دکھ سکھ شیر کئے تھے۔ وہ ان سے بہت باتیں کرتی تھی اپنی سہیلیوں کی سسرز کی، اپنے اسکو لڑکی۔ اور اب میٹرک کے بعد اسے لاہور آنا پڑا تھا۔ پاپا کی بھی خواہش تھی کہ وہ لاہور میں پڑھے جبکہ وہ تو اسلام آباد میں ہی پڑھنا چاہتی تھی۔ یوں پہلی بار اس نے لاہور دیکھا تھا۔ کتنی ساری باتیں اس کے پاس بتانے کو تھیں شاہی قلعہ، شاہی مسجد، مقبرہ جہانگیر، مینار پاکستان۔ سب کے بارے میں وہ بی جان کو بتائے گی وہ اکثر سوچتی مگر بی جان۔ اور آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آگئے۔

”تم نے ابھی تک نہیں بتایا نہ وہ کہ بی جان کون تھیں۔؟“ سمیرا نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”بی جان!“ اس نے غم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا اور ایک دم ہی اس نے سیم کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور زور زور سے رونے لگی۔

”حوصلہ کرو ندیا۔ سمیرا نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔

”بی جان بہت اچھی تھیں سو! بہت اچھی۔ وہ میری کچھ نہیں لگتی تھی۔“

”ہیں!“ سمیرا نے اسے الگ کرتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں، میرا ان سے کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔“ اس نے ہتھیلیوں کی پشت سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ ”وہ میری ممانی کی ماں تھیں اور ماموں کی شادی بالکل غیروں میں ہوئی تھی۔“

”اور تم نے ان کی موت کو اتنا محسوس کیا؟“ کرن نے نرمی سے کہا۔ ”یقیناً وہ تمہیں بہت چاہتی ہوں گی۔“

”ہاں۔“ اس نے اعتراف کیا۔ ”سات سال کی عمر سے لے کر اب تک میں نے ساری محبتیں، ساری شفقتیں انہی سے پائی تھیں۔ پاپا اور ماما تو کبھی چھٹیوں میں آتے بھی تو ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ میرے پاس بیٹھیں، مجھ سے میرے مسائل پوچھیں، مجھے زندگی کی اچھائیوں اور برائیوں کے متعلق بتائیں۔ ان کی چھٹی تو رشتے داروں کے ہاں دعوتیں کھانے میں گزر جاتی تھی اور میں سوچتی ہی رہ جاتی تھی کہ کب ماما کو فرصت ہو اور میں ان کے پاس بیٹھ کر اپنی باتیں کروں۔ میرے سارے دکھ سکھ بی جان نے شیر کئے ہیں۔ مجھے ہر اچھی اور بری بات انہوں نے بتائی ہے۔“

”تمہارا دکھ اپنی جگہ پر ندیا لیکن موت ایسی چیز ہے جس پر آدمی کا اختیار نہیں ہوتا۔“ کرن حیدر نے اسے سمجھایا۔ اسے اپنی اس نازک سی بے حد خوبصورت روم میٹ پر بہت ترس آ رہا تھا، جو یہاں ہوٹل میں آنے کے چند دن بعد ہی اس اتنے بڑے دکھ کا شکار ہو گئی تھی اور وہ جو یہاں پاکستان میں تنہا تھی، اپنے ماں باپ سے دور اور پھر اس کا غم غلط کرنے کے لئے وہ اور سمیرا سے بانو بازار کی چاٹ کھلانے لے گئیں۔

چاٹ کھا کر وہ یونہی بے مقصد گھومتی پھریں لیکن اس کی اداسی کم نہ ہوئی تھی۔ سمیرا اور کرن کی خوشی کی خاطر وہ بظاہر ان کے لطیفوں اور دلچسپ باتوں پر ہنس رہی تھی لیکن اس کے دل پر بہت بوجھ تھا۔ یوں جیسے اچانک اس کے سر سے چھت اٹھ گئی



ہو۔ جیسے وہ تنہا ہو گئی ہو۔ اب اگر اسے کوئی مسئلہ درپیش ہو تو وہ کس سے کہے گی۔ ماما پاپا تو اتنی دور تھے اور سنی ماموں سے ہر بات تو نہیں کہی جاسکتی تھی۔

ہوسٹل واپس آکر اس نے سنی ماموں کو خط لکھا۔ بہت لمبا چوڑا شکوؤں سے بھرا ہوا کہ اسے بی جان کی موت کی اطلاع بروقت کیوں نہ دی گئی۔ وہ آخری بار انہیں دیکھ لیتی تو شاید دل پر اتنا بوجھ نہ ہوتا۔ خط لکھ کر جب اس نے کرن کی طرف دیکھا تو وہ تکیہ بازوؤں میں لئے گہری نیند سو رہی تھی۔ پورے ہوسٹل میں خاموشی تھی۔ زیادہ تر کمروں میں اندھیرا تھا۔ سینئر لڑکیوں کے کمروں میں کہیں کہیں لائٹ جل رہی تھی لیکن اتنا سنا تھا کہ نادرہ کو خوف سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے کمرے کی لائٹ جلنے ہی دی اور بستر پر آکر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر وہ یونہی بیٹھی ادھر ادھر دیواروں پر لرزتے سایوں کو دیکھتی رہی اور اندر ہی اندر اس کا دل خوف سے کانپتا رہا۔ کبھی اسے لگتا جیسے دیواریں ہولے ہولے اس کی طرف حرکت کر رہی ہوں اور ابھی اسے پیس ڈالیں گی۔ کبھی اسے یوں لگتا جیسے کوئی دبے پاؤں چل رہا ہو۔ ”کرن؟“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں اسے بلایا لیکن وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ تب کبوتر کی طرح وہ آنکھیں بند کر کے سکڑ کر لیٹ گئی اور ہولے ہولے سسکنے لگی لیکن خوف عجیب سا خوف اس کے وجود پر مسلط ہو رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ لرزتی کانپتی رہی۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ اسے کچھ پڑھنا چاہئے جتنی سورتیں اسے یاد تھیں وہ ان سب کو بار بار پڑھنے لگی اور یونہی پڑھتے پڑھتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

سنی ماموں اس کا خط ملتے ہی آگئے تھے۔

”سنی ماموں!“ وہ ان کے گلے سے لگتی کتنی دیر تک سسکتی رہی اور وہ ہولے ہولے اسے تھکتے رہے۔

”مجھے کیا خبر تھی گڑیا کہ تو بی جان سے اتنی اٹیچڈ ہو گی۔“

”وہ بہت اچھی تھیں سنی ماموں، بہت اچھی۔“  
”ہاں گڑیا۔“ سنی ماموں بھی بہت اداس تھے۔

اور پھر سنی ماموں اسے اداس دیکھ کر اپنے ساتھ ہی لے آئے۔ گھر آکر اسے بی جان اور بھی شدت سے یاد آئیں وہ آنٹی کے گلے لگ کر بہت روئی۔ آنٹی خالی خالی آنکھوں سے اسے تنکٹی رہیں تو وہ خود ہی چپ ہو گئی۔ سنی ماموں نے اسے اداس دیکھ کر پیپا سے بات کرادی تو وہ فون پر رو پڑی۔

”پیپا! میں آپ کے اور ماما کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔“

”بیٹا تم اپنی تعلیم مکمل کر لو۔“

”تعلیم تو وہاں بھی مکمل ہو سکتی ہے۔“ اس نے ضد کی۔ ”لوگ تو یہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ جاتے ہیں اور آپ نے مجھے یہاں بھجوا دیا ہے۔“  
”میں نے بہتر کیا ہے بیٹا اور میں سمجھتا ہوں کہ تم وہاں اپنے وطن میں رہ کر زیادہ بہتر تربیت حاصل کر رہی ہو۔“

”مگر پیپا۔“ وہ روہانسی سی ہو گئی۔ ”میں بہت تنہائی محسوس کرتی ہوں۔ بہت اکیلا پن۔“  
”بہادر بنو بیٹا!“ وہ اسے سمجھاتے رہے۔

اور وہ تھک کر خاموش ہو گئی، جانتی تھی کہ پیپا اس کی بات کبھی نہیں مانیں گے جانے ان کے دل میں یہ بات کیوں بیٹھ گئی تھی کہ انگلینڈ کے ماحول میں تعلیم حاصل کر کے وہ اپنے کلچر سے دور ہو جائے گی۔ پیپا سے بات کر کے وہ اور بھی اداس ہو گئی تھی۔ سنی ماموں نے اس کا دل بہلانے کے لئے اسے خوب سیر کرائی۔ شام کو دیر تک وہ گھومتے پھرتے، شکر پڑیاں، راول ڈیم، ایوب پارک کئی بار کی دیکھی ہوئی جگہیں وہ ایک بار پھر سنی ماموں کے ساتھ دیکھتی پھری۔ سنی ماموں نے اس کے ساتھ ڈھروں باتیں کیں، اپنی آنٹی کی، بی جان کی اور پہلی بار اسے پتا چلا کہ ہر دم ہنسنے والے

سنی ماموں کا دل اندر سے کتنا گداز ہے۔ اولاد سے محرومی کا دکھ وہ اندر ہی اندر اپنے سینے میں پال رہے تھے جبکہ آنٹی سے ہمیشہ وہ یہی کہتے تھے کہ انہیں اولاد کی خواہش نہیں ہے اور یہ کہ وہ اپنی زندگی سے بالکل مطمئن ہیں۔ مگر اس روز دامن کوہ میں نیلی آنکھوں والے پیارے سے بچے کو گود میں اٹھا کر جس طرح انہوں نے والہانہ انداز میں اسے پیار کیا تھا اس سے ان کا دکھ اس کے دل میں اتر آیا تھا اور اس نے سچے دل سے دعا مانگی تھی کہ خدا سنی ماموں کو اولاد کا سکھ دے۔

ایک ہفتہ پلک جھپکتے میں گزر گیا تھا اور جس روز وہ جارہی تھی اس روز سنی ماموں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ آج اسے انہیں اپنا دوست سمجھے گی اور اپنا ہر دکھ سکھ ان سے کہے گی اور یہ کہ وہ یہاں خود کو کبھی اکیلا نہ سمجھے اور جو باتیں وہ بی جان سے کیا کرتی تھی، ان سے کیا کرے۔“

اور ہو مثل کے گیٹ پر رخصت ہوتے ہوئے ایک بار انہوں نے کہا تھا۔

”یاد رکھنا گڑیا! آج سے ہم ماموں بھانجی بہت اچھے دوست ہیں۔“

کرن حیدر اور سمیرا حسن اس سے بہت وارفتگی سے ملیں۔ ”بچی ندیا ہم نے تمہیں بہت مس کیا۔“ انہوں نے شکوہ کیا۔

وہ رات گئے تک باتیں کرتی رہیں۔ وہ کافی حد تک سنبھل گئی تھی اور اس نے یہ حقیقت بھی جان لی تھی کہ وہ کتنا بھی روئے پیٹے اور چلائے، پایا اسے واپس ہر گز نہیں بلائیں گے، لہذا اسے یہیں دل لگانا تھا۔

ہو مثل آنے کے چند دن بعد ہی پایا کا بہت لمبا چوڑا خط اسے ملا تھا۔ ڈھیر دن نصیحتوں سے بھر اخط۔ اور اسے خط لکھنے کے ساتھ ہی انہوں نے شاید پھپھو کو بھی خط لکھ دیا تھا کہ وہ دوسرے دن ہی اس سے ملنے چلی آئیں۔ یوں بھی وہ لاہور سے قریب تھیں۔ ان کا گاؤں لاہور سے نزدیک تھا۔ پھپھو کے ساتھ شیر دل بھی تھا۔ پھپھو کا سب

بڑا بیٹا جو لاہور میں ہی تھا اور بی ایس سی میں تھا، پھپھو سے وہ خوش دلی سے ملی۔ شیر دل کو اس نے بس ایک نظر ہی دیکھا تھا۔ شلوار قمیص میں ملبوس وہ نگاہیں جھکائے بیٹھا تھا۔ نہ اس نے نادرہ کی طرف دیکھا تھا نہ بات کی تھی۔

پھپھو کو وہ اپنے ساتھ کمرے میں لے آئی اور شیر دل وہاں ہی انتظار گاہ میں بیٹھا رہا۔ اس کی روم میٹ نے پھپھو کی خوب خاطر مدارات کی اور پھپھو نے بہت خلوص و محبت سے بار بار انہیں گھر آنے کی دعوت دی صرف گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا تو راستہ ہے جب جی چاہے، دل گھبرائے شیر دل کے ساتھ آ جانا اور ان دونوں کو بھی لانا اور میں نے شیر دل سے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ تمہاری خیر خبر لیتا رہے گا۔“

”پھپھو نے جاتے ہوئے خوب بھیج بھیج کر تینوں کو گلے لگایا، سمیرا تو ایک دم ہی ان سے متاثر ہو گئی تھی۔

”بچی ندیا! تمہاری پھپھو کتنی اچھی ہیں، محبت کرنے والی، ایک ہماری پھپھو ہیں گلے ملیں گی بھی تو یوں فاصلے سے جیسے جراثیم چٹ جائیں گے۔“ سمیرا نے پھپھو کے سامنے ہی ندیا سے تعریف کر دی۔

”ارے میری جان! اگر میں ندیا کی پھپھو ہوں تو تمہاری بھی پھپھو ہوں۔“ اور پھر جب وہ تینوں انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئیں تو سمیرا نے شیر دل کو دیکھ کر کرن کے کان میں سرگوشی کی۔

”اللہ کرنی! یہ ندیا کا کزن کتنا ہینڈ سم ہے۔“

وہ پھپھو کو خدا حافظ کہہ کر پلٹی تو اس نے سمیرا سے پوچھا۔ ”یہ تم کرن کے کان میں کیا سرگوشیاں کر رہی ہو؟“

”یار تمہارے کزن کو ڈسکس کر رہے ہیں۔ بہت اسمارٹ بندہ ہے۔“

”ہاں ندیا، تمہارا کزن بہت اسمارٹ ہے۔“ کرن نے بھی سمیرا کی تائید کی تو اس

نے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا۔

”کون، تمہارا مطلب ہے شیر دل!“

”ہاں۔“ سمیرا نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس کی چٹکی لی۔

”ریلی ندیا! تمہارا کزن تو۔۔ دیکھو اسے گرفت میں لے لینا۔ کہیں ہاتھ سے نکل

ہی نہ جائے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی اور پھر شیر دل تو عام سالز کا ہے تمہیں جانے کیوں.....“ اس کی آنکھوں کے سامنے سرسبز بہتی ناک والا شیر دل آگیا جو بڑی بے تکلفی سے کرتے کے دامن سے اپنی ناک صاف کر لیا کرتا تھا اور جو اتنا ہونق تھا کہ صحن میں بھاگتے ہوئے اکثر اس کا پاؤں پھل دیتا تھا۔

”عام سالز کا ہے!“ سمیرا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ ”اتنا خوبصورت سا تو ہے اور پھر اس کی آنکھیں۔۔ اللہ کتنی کشش اور چمک تھی۔ بس ذرا غور سے وہ مجھے دیکھتا تو میں وہیں کھٹ سے گر جاتی۔“

”احق ہو تم۔“ وہ جھینپ گئی۔ ”کیسی فضول باتیں کر رہی ہو۔“

”ارے یہ فضول باتیں ہیں؟ کسی خوبصورت اور وجیہہ لڑکے کی تعریف کرنا۔“

”ہرگز نہیں۔“ کرن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ فضول باتیں ہرگز نہیں ہیں اور یہ

حقیقت ہے کہ تمہارا کزن بہت خوبصورت ہے اب کے اگر وہ آئے تو اسے دھیان سے دیکھنا۔“

”اچھا۔“ اس نے سر ہلادیا۔

اور جب اگلے وزیر ڈے پر وہ آیا تو اس نے بطور خاص اسے دیکھا مگر اسے کوئی

خاص بات نظر نہ آئی بس وہ ایک عام سالز کا تھا جیسے سب لڑکے ہوتے ہیں۔ اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ شیر دل نے اس سے کوئی خاص بات نہیں کی تھی، بس اس کا حال پوچھا تھا

اور یہ کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں اور اپنا فون نمبر اسے دیا تھا کہ اگر کبھی ضرورت پڑ جائے تو وہ اسے اس نمبر پر پیغام دے سکتی ہے۔

”تمہارا کزن آیا تھا؟“ سمیرا اسے واپس آتے دیکھ کر روم نمبر ۳ سے بھاگی چلی آئی۔ ”کیا کہہ رہا تھا؟“

”کچھ بھی نہیں، بس خیریت دریافت کی تھی۔“

”اچھا۔“ اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ ”یعنی کچھ بھی نہیں۔“

”ہاں اور کیا کہتا۔“

”یہ کہ تم بڑی خوبصورت ہو تمہاری آنکھیں۔۔۔“

”کیوں بھلا یہ کہنے کی کیا تک تھی۔“ وہ اپنی خوبصورت آنکھوں کو پھیلانے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

کرن حیدر کو اس سے وہ اتنی خوبصورت لگی کہ اسے بے اختیار اس پر پیار آگیا۔ اور اس نے اپنے بازو اس کے گرد پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”تم اس کی باتوں پر دھیان مت دو ندیا! اس کا قصور نہیں ہے یہ جو میں گھنٹے روم نمبر ۳ میں بیٹھنے کا اثر ہے۔“

”روم نمبر ۳ میں کیا ہے؟“

”روم نمبر ۳ میں صبحی رضا ہے جسے فلمیریا کی بیماری ہے اور جسے ہندوستان پاکستان میں بننے والی ہر فلم کی اسٹوری زبانی یاد ہے اور پچیس فی صد اسٹوریاں وہ سمیرا بی بی کو ازبر کر چکی ہیں۔ لہذا انہیں ہر طرف فلمی اسٹوریاں ہی نظر آتی ہیں۔“

نادرہ بے اختیار ہنس دی۔ اب اسے سمیرا کی تحقیق سمجھ میں آئی تھی۔

”یہ تو بہت خطرناک بات ہے کرن! میرا خیال ہے کہ سمیرا کا روم نمبر ۳ میں داخلہ بند کر دیا جائے۔“

”ہاں، قابل ذرا بات ہے۔ کیونکہ اب یہ راتوں کو بھی غائب رہنے لگی ہے۔ اس

رات جب تمہاری بی جان کی ڈیٹھ کی اطلاع آئی تھی تب بھی یہ محترمہ ادھر ہی سوئی تھیں اور آج بھی اپنا تکیہ وغیرہ اٹھا کر چلی گئی ہیں۔“

”بی جان۔۔“ کرن نے یہ کیا دلدل دیا تھا وہ ایک دم اداس ہو گئی۔

پتا نہیں، وہ کیوں بی جان کو نہیں بھیسولتی تھی۔ حالانکہ وہ اس کی کوئی نہیں تھیں۔ پھر بھی وہ اسے بہت یاد آتی تھیں۔ رات کو بستر پر لیٹ کر آنکھیں موندے وہ انہیں بہت یاد کرتی۔ ان کی صورت آنکھوں کے سامنے ہی پھرتی رہتی تھی۔

کرن نے اس کی آنکھوں کی سطح کو گیلے ہوتے دیکھا اور فوراً جان گئی کہ اس کا دھیان بی جان کی طرف چلا گیا ہے۔ اس نے کئی بار اسے چپکے چپکے روتے دیکھا تھا اور سمجھتی تھی کہ اسے بی جان سے کتنی بے تحاشا محبت تھی۔

”ارے ہاں۔ وہ روم نمبر ۱۵ میں ایک نئی لڑکی آئی ہے۔ ہری پور سے گل و گلزار۔ بڑی شے ہے۔ مونا کہہ رہی تھی کہ ایک دم شوباز ہے۔ آتے ہی اتنی شیخیاں بگھاری ہیں کہ مونا تو بیزار ہو گئی ہے کہہ رہی تھی کہ وارڈن سے کہہ کر کمرہ تبدیل کروالوں گی۔“ کرن نے اس کا دھیان بٹانے کے لئے کہا۔

”ہاں چلو، اس کا ریکارڈ لگاتے ہیں۔“ سیرا بھی کھڑی ہو گئی۔

”میں نہیں جاؤں گی۔“

”چلو یار!“ کرن نے بازو سے پکڑ کر اسے کھینچا تو اسے مجبوراً اٹھنا پڑا۔

کالج لائف کے سحر نے اسے جیکڑ لیا تھا اور وہ ایڈ جسٹ ہو گئی تھی۔ فکشنز، پارٹیاں، الیکشن کے ہنگامے ان سب کے بعد اب سنجیدگی سے پڑھائی ہو رہی تھی۔ سبھی ٹیچرز بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر مسز انور خورشید سے وہ بہت متاثر ہوئی تھی وہ اردو کی ٹیچر تھیں۔ بکھرے بکھرے بال، کھوئی کھوئی، کچھ ڈھونڈتی ہوئی، کھوجتی ہوئی سی آنکھیں، لباس کے معاملے میں اتنی بے پروا۔ ہمیشہ سفید شلوار پر کاشن کی قمیض

پہنتی تھیں لیکن پھر بھی ان کی شخصیت میں ایک خاص وقار اور حسن تھا۔ پہلے روز جب وہ کلاس میں آئی تھیں تو انہوں نے پوچھا تھا۔

”آپ جانتی ہیں، میں کون ہوں؟“

”جی آپ مسز توفیق ہیں، اردو کی ٹیچر۔“ کچھ لڑکیوں نے کہا تو ایک دم ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا

”میرا نام انور خورشید ہے۔ میں اپنے شوہر کے حوالے سے پہچانا جانا پسند

نہیں کرتی، پلیز آپ مجھے انور خورشید کہہ سکتی ہیں۔۔۔“

اور اس نے بے حد تاسف سے انہیں دیکھا تھا۔

”یقیناً ان کے شوہر کوئی انتہائی ظالم قسم کے شخص ہوں گے۔“

”کوئی المیہ۔“ کرن نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

پہلے دن وہ ان سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئی تھی لیکن پھر ہولے ہولے ان کی شخصیت کے جوہر کھلتے گئے۔ پڑھاتے ہوئے وہ کھوسی جاتی تھیں۔ لیکچر میں ڈوب جاتیں کہ پیریڈ گزرنے کا بھی احساس نہ ہوتا۔

سینئر لڑکوں سے پتا چلا تھا کہ وہ رائٹر ہیں اور دو تین کتابوں کی مصنف بھی۔ کچھ سیاسی قسم کے آرٹیکل لکھا کرتی تھیں۔ چونکہ میگزین کی انچارج تھیں اور نادرہ میگزین کی ایڈیٹر منتخب ہوئی تھی اس لئے نادرہ کو ان سے بہت واسطہ پڑا اور ان کے قریب جانے پر ہی ان کی شخصیت کا حسن اس پر واضح ہوا تھا اور وہ ان سے بہت متاثر ہو گئی تھی۔ انکا نام اگرچہ مردانہ تھا لیکن انہیں شاید اپنے نام سے عشق تھا۔ وہ سائن کرتے ہوئے اپنا پورا نام لکھتی تھیں۔

اور پھر مس مبارک تھیں اسلامیات کی لیکچرار۔ سانولے سے رنگ کی موٹی سی۔

مس مبارک کو لڑکیاں اکثر گھیرے رکھتی تھیں اور وہ ان کے دائرے میں کھڑے ہو کر

بہت ہنس کر ان سے باتیں کرتی تھیں۔ اپنے خاندان کی اور اپنے گھر کی۔ اور اپنے بھائی کا ضرور ذکر کرتیں جو ڈاکٹر تھا اور جس کے لئے وہ رشتہ تلاش کر رہی تھیں اور یہ بھی ضرور بتاتی تھیں کہ ان کے گھر کا ماحول بڑا مذہبی سا ہے اور ان کی شادی نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے والد خاندان سے باہر شادی کرنے کے قائل نہ تھے۔ اور جب وہ لڑکیوں کے ساتھ باتیں کر رہی ہوتیں تو وہ سوچتی کاش مس مبارک کسی دن سرخ رنگ کی لپ اسٹک کے بجائے کسی اور کھر کی لپ اسٹک لگائیں۔ وہ ہمیشہ سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگاتی تھیں۔

اور مس مشکور فاطمہ تھیں جو انگلش کی لیکچرار تھیں اور گولڈ میڈلسٹ تھیں لیکن جو پڑھانا بالکل نہ جانتی تھی۔ لڑکیاں ان کی کلاس میں اونگھتی رہتی تھیں ان کی ذہانت اور لیاقت کی ہر کوئی تعریف کرتا۔ پرنسپل نے اپنی پہلی تقریر میں ان کی ڈگریاں اور گولڈ میڈلز گوائے تھے لیکن عجیب بات تھی کہ ان کا پڑھائی کا طریقہ ایسا تھا کہ ایک لفظ سمجھ نہ آتا تھا۔ وہ ایک انتہائی بوسیدہ برقع پہن کر آتی تھیں۔ لڑکیوں سے ہی پتا چلا تھا کہ وہ ایک انتہائی ماڈرن خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے سب بہن بھائی بڑے عہدوں پر ہیں لیکن وہ بے انتہا سادہ ہیں اور انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لئے ملنے والا اسکالرشپ محض اس لئے رد کر دیا تھا کہ وہ امریکا کے ماحول سے متنفر تھیں۔ وہ گندمی رنگ کی کافی خوبصورت خاتون تھیں۔ نادرہ نے بار بار سوچا تھا کہ اگر وہ ڈھنگ کے کپڑے پہنیں اور اپنے آپ کو بنا سنوار کر رکھیں تو بہت سے لوگوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کر سکتی ہیں۔ لیکن وہ انتہائی پرانے فیشن کے فلیٹ کے سرخ سبز اور پیلے سوٹوں میں نظر آتیں جن کی قیصیں گھٹنوں سے اوپر ہوتیں۔ وہ میگزین کے انگلش حصے کی انچارج تھیں مگر اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے بھی گھبرا جاتی تھیں اور ان کی ہتھیلی اور پیشانی پسینے سے بھیک جاتی تھی۔

اور پھر فزکس کی لیکچرار تھیں مس آمنہ گیلانی۔ خوبصورت، ویل ڈریسڈ، ایکٹوڈین۔ وہ پورے کالج میں مقبول تھیں۔ ان کے پڑھانے کا انداز۔ ان کی گفتگو سب کچھ متاثر کن تھا۔ کھیل کا میدان ہو تو وہ موجود۔

ڈرامے کی تیاری کروا رہی ہوں تو وہ ریہرسل کروا رہی ہیں۔

لڈی تیار کرنا ہے تو وہ دوپٹہ باندھے لڑکیوں کو سیٹ اپ بتا رہی ہیں۔

ڈھولک بجانی ہے تو وہ ڈھولک پر تھپ دے رہی ہیں۔

”اللہ کیا کسی کی شخصیت اتنی مکمل اور بھرپور بھی ہو سکتی ہے۔“ اس نے ایک روز کرن حیدر سے کہا۔ ”اور یہ کتنی حیران کن بات ہے کہ مس آمنہ کی شخصیت میں اتنی دلکشی اور جاذبیت ہے مگر پھر بھی ان کی شادی نہیں ہوئی۔“

”تمہیں نہیں پتا۔“ کرن حیدر نے سینئر لڑکیوں سے حاصل کردہ معلومات اس کے سامنے اگل دیں۔ ”مس آمنہ میریڈ ہیں۔ ان کی شادی ان کے کزن سے ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے، صرف نکاح ہوا تھا پھر ان کا کزن اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر چلا گیا اور وہاں ہی اس نے شادی کر لی پھر نہ وہ پلٹ کر آیا اور نہ اسے طلاق دی۔“

”ویری سیڈ۔“ اسے سچ مچ دکھ ہوا لیکن دل یقین کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ مس آمنہ تو بہت فریش دکھائی دیتی تھیں بہت ہنس مکھ ہر وقت مسکراتی رہتی تھیں۔

پتا نہیں ان ساری کہانیوں میں جو مختلف ٹیچرز کے متعلق سینئر لڑکیوں نے انہیں بتائی تھیں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ۔ اور ان سینئر لڑکیوں کو یہ کہانیاں ان کی سینئر لڑکیوں نے بتائی ہوں گی اور ان کو ان کی سینئر لڑکیوں نے اور ان تک پہنچتے پہنچتے جانے

ان میں کتنی رنگ آمیزی ہو چکی ہوگی۔ ممکن ہے کچھ بھی سچ نہ ہو کچھ بھی حقیقت نہ ہو جیسے مسز مہروز کے متعلق بتائی جانے والی کہانی۔

مسز مہروز کر سچیں تھیں۔ ان کی عمر پچاس سال سے کم تو ہرگز نہ ہوگی۔ زیادہ تر ساری پہنتی تھیں اور پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک غضب کی میچنگ ہوتی تھی۔ وہ بھی انگلش پڑھاتی تھیں۔ لڑکیوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے لو میرج کی تھی۔



مہروز صاحب ایک بہت اونچی فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ والدین کے اکلوتے بیٹے، کروڑوں کی جائداد کے مالک تھے۔ ماں باپ ایک کر سچیں لڑکی سے ان کی شادی پر رضامند نہ تھے اور وہ کسی اور سے شادی کے لئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ ان سے شادی کر کے انگلینڈ چلے گئے اور وہیں کسی کالج میں شاید کہیں یونیورسٹی میں انہیں جاب مل گئی کیونکہ انہوں نے تعلیم بھی وہاں سے حاصل کی تھی۔ لہذا ایڈجسٹ ہونا مشکل نہ لگا۔ سنا تھا کہ انہیں اپنی بیوی سے عشق تھا۔ بیوی کھانا پکانا نہ جانتی تھی وہ خود پکاتے تھے حتیٰ کہ ان کے کپڑے تک استری کر دیتے تھے لیکن بد قسمتی سے ایک سال بعد اچانک ایک حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو لے کر ان کے والدین کے پاس چلی جائیں۔ وہ پاکستان آئیں مگر شوہر کے والدین نے انہیں قبول نہ کیا۔ البتہ ان کے بیٹے کو ان سے چھین لیا۔ وہ خاموش رہیں کہ ان کے شوہر کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ان کے والدین کے پاس پرورش پائے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ انہوں نے اپنے شوہر کے والدین سے بیٹے کے عوض کروڑوں روپے کی جائیداد لی تھی۔ ان کے پاس ایک محل نما گھر تھا جسے انہوں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں تبدیل کر رکھا تھا اور جہاں ملازمت پیشہ خواتین رہتی تھیں۔

مسز ایلس مہروزی گردن ہر وقت تنی رہتی تھی۔ وہ سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی

چلتی تھیں۔ وہ کوئی بہت خوبصورت خاتون نہیں تھیں عام سی شکل و صورت کی سانولی سی خاتون تھیں۔ مگر ان کی چال میں ایک وقار تھا ایک غرور، ایک بڑاپن سا تھا۔

”سنائے، ان کے میاں بے انتہا خوبصورت تھے۔“ لڑکیوں نے اسے بتایا۔  
”اور وہ جوانی میں بھی کوئی بہت زیادہ خوبصورت نہیں رہی ہوں گی۔“ اس نے بارہا ان کا جائزہ لیا تھا۔

پھر مہروز صاحب نے ان کی خاطر سب کچھ کیوں چھوڑ دیا، ماں باپ، وطن سب کچھ۔ اسے حیرت ہوتی یقین نہ آتا۔

اور اگر انہیں ایلس مہروز سے اتنی ہی شدید محبت تھی تو پھر مسز مہروز کو بھی تو ان سے اتنی ہی محبت ہونی چاہئے تھی مگر یہ کیسی محبت تھی کہ مسز مہروز اپنے آپ کو صدیقہ مہروز کے بجائے ایلس مہروز لکھتی تھیں اور اسی نام سے پکارا جانا پسند کرتی تھیں حالانکہ شادی سے پہلے جب وہ مسلمان ہوئی تھیں تو ان کا نام ان کے میاں نے صدیقہ رکھا تھا۔ مگر انہوں نے ان کی وفات کے بعد ان کا دیا ہوا نام چھوڑ دیا تھا۔  
یہ وفاتونہ تھی۔

یہ محبت تو نہیں تھی۔

اور پھر مسز مہروز نے اپنا بیٹا بھی تو.....

اور لڑکیاں تو ان کے متعلق اور بھی باتیں کرتی تھیں۔۔

یہ کہ کبھی کبھی جو بیس اکیس سالہ لڑکا انکی گاڑی ڈرائیو کر کے لاتا ہے وہ۔۔

اکثر وہ خود ہی ڈرائیو کر کے آتی تھیں۔ ہاں ہاں کبھی کبھی وہ اسمارٹ سا، خوبصورت ماینگ سالڑکا ان کے ساتھ ہوتا تھا۔

اور اسے لڑکیوں کی باتوں پر کبھی یقین نہ آیا تھا۔ کیسی کیسی عجیب باتیں کرتی تھیں لڑکیاں۔

وہ یہاں آکر نئے نئے تجربوں سے روشناس ہو رہی تھی۔ اس نے بہت سی ایسی باتوں کو جانا تھا جن سے پہلے وہ باخبر نہ تھی۔ اب اسے پتا چل رہا تھا کہ دنیا میں ہزار طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور ہر آدمی کی اپنی ایک کہانی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ اس کے لئے نیا اور تھریل پیدا کرنے والا تھا۔ وہاں مری میں زندگی بہت محدود تھی۔ اسکول میں سفید بالوں اور سفید لباس والی سسٹرز تھیں۔ سسٹر میری، سسٹر ہلنا، سسٹر جوزی اور مدر جانس۔ سب کی سب اس اجنبی دیس میں اجنبی ملک کی بچیوں کو تعلیم دے رہی تھیں مگر یہاں لاہور میں آکر اسے پتا چلا تھا کہ دنیا کیا ہے۔

سفید برف پوش پہاڑوں سے دور

بہت وسیع اور رنگارنگ

اسے یہاں آکر لگا تھا جیسے وہ دنیا اور لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اس کے اندر ایک نئی نادرہ بیدار ہو رہی تھی۔

لا علمی سے آگہی کی طرف

متجسس، پر شوق

ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی، سولہ یا سترہ برس لیکن اسے لگتا جیسے وہ ایک دم بہت بڑی ہو گئی ہو۔ اس کے اندر اعتماد پیدا ہو رہا تھا۔ پہلے کی طرح اب وہ ہوٹل کے کمرے میں اندھیرا ہو جانے سے ڈرتی نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی اور گالوں کے گلاب نکھر آئے تھے۔

وہ سب میں یکساں مقبول تھی۔

کلاس فیلوز اور ٹیچرز سب میں۔

اس کے چہرے میں ایک خاص طرح کی معصومیت اور پاکیزگی تھی۔ میک اپ سے

بے نیاز دمکتری رنگت۔

گلابی ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ۔

خوبصورت آنکھوں میں کچھ جان جانے کی خوشی۔

اکثر سینئر لڑکیاں اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ٹھٹھک کر رک جاتیں۔

”یہ نئی لڑکی کتنی خوبصورت ہے۔“

اور پھر وہ صرف خوبصورت ہی تو نہ تھی۔ اس میں بے شمار صلاحیتیں تھیں۔ وہ ہر

فلکشن میں نمایاں نظر آتی۔ اردو مباحثہ ہو یا انگلش مشاعرہ یا کھیل کا میدان، سوا سے

مقبول تو ہونا ہی تھا۔ سمیرا حسن کو بالکل یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی چھ ماہ پہلے آنے والی

سہمی سہمی سی لڑکی ہے جو کالج کے برآمدے میں یوں اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے

کھولے کھڑی تھی جیسے کوئی ہر نی راستہ بھول بیٹھی ہو اور جو اپنی بی جان کی موت کا سن

کر چیخیں مار مار کر روئی تھی اور جو رات کو اکثر کرن حیدر کا ہاتھ پکڑ کر سوتی تھی۔

”سچی ندیا! تو نے بڑی جلدی پر نکالے۔“ ایک شام کھانے کے بعد جب وہ تینوں

بچے کالج لان میں ٹہل رہی تھیں تو سمیرا نے کہا۔

”میں نے کیا کیا ہے سمو۔؟“ اس نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔

”بھئی جسے دیکھو تمہارا نام لے رہا ہے۔ حتیٰ کہ فور تھ ایئر کی باجیاں بھی۔“

”مگر اس میں میرا کیا قصور؟“ اس نے پریشانی سے سمیرا کی طرف دیکھا۔ ”اور کیا

یہ کوئی غلط بات ہے۔ میں تو وہاں بھی ڈبیٹ میں حصہ لیا کرتی تھی اور پیرینٹس ڈے پر

ہونے والے ڈراموں میں بھی مگر بی جان نے تو مجھے کبھی منع نہیں کیا تھا بلکہ وہ ہمیشہ

بڑے اشتیاق سے مجھ سے یہ سب کچھ سنا کرتی تھی۔“

”تم سچ مچ بہت معصوم ہو ندی۔“ سمیرا نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔ ”میں نے

یوگب کہا تھا کہ یہ کوئی غلط بات ہے بلکہ مجھے تو تم سے حسد ہو رہا ہے۔ پتا ہے کل مس

آمنہ تمہاری تعریف کر رہی تھیں۔

”ریلی۔“ وہ ایک دم خوش ہو گئی۔ ”مس آمنہ نے میری تعریف کی تھی۔ سچ؟“  
وہ تو اس کی آئیڈیل ٹیچر تھیں۔ وہ خود بھی ان جیسا بننا چاہتی تھی۔ زندگی کے  
اتنے بڑے ایسے کے باوجود ہنس مکھ، خوش دل اور بہادر، اور پتا نہیں وہ سب کچھ سچ بھی  
تھایا جھوٹ جو لڑکیاں مس آمنہ یا دوسری ٹیچرز کے بارے میں بتایا کرتی تھیں۔ آخر  
انہیں یہ سب کیسے پتا چلا تھا۔ وہ کیسے جانتی تھیں کہ مسز مہروز کے میاں بہت حسین و  
جلیل تھے اور یہ کہ۔۔۔

”کیا سوچ رہی ہو ندیا!“

”کچھ نہیں۔“ اس نے چونک کر کرن کی طرف دیکھا۔

”تم کچھ زیادہ نہیں سوچتی ہو؟“

”ہاں شاید۔“ وہ ہنس دی۔

”کیا سوچتی ہو؟“ کرن نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”اپنے کزن کو سوچتی ہو گی۔“ سمیرا حسن کی آنکھوں میں چمک تھی۔

”نہیں تو۔“ اس کے رخسار شفق رنگ ہو گئے۔ ”تم بہت فضول باتیں کرتی سو۔“

”ہائے فضول کہاں، تمہارا وہ کزن اتنا ہینڈ سم ہے کہ اس کو نہ سوچنا اس کے ساتھ

زیادتی ہے۔“

”مجھے تو اس میں کوئی خاص بات نہیں لگتی۔ اس جیسے سینکڑوں لڑکے ادھر

ادھر.....“

”تم انتہائی بد ذوق ہو۔“ سمیرا نے برا سامنہ بناتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

”دراصل اس کا قصور نہیں ہے۔ اس کا نام ہی ایسا ہے بھاری اور بوجھل سا۔ جی

ندو! تمہارا یہ نام کس نے رکھا تھا اتنا اولڈ۔؟“ کرن نے پوچھا۔

”دادا ابانے۔“ وہ افسردہ ہو گئی۔ اسے خود اپنا نام پسند نہیں تھا۔ وہاں کانوٹ میاں

بھی میری اور ٹونی اس کے نام کا مذاق اڑایا کرتی تھیں۔

”ویسے نام صحیح ہی رکھا ہے رکھنے والے نے یہ ہے نادر و نایاب چیز۔“ سمیرا نے

تعریف کی۔ ”تم نے دیکھی ہے پورے کالج میں کوئی ایسی بیوٹی کوئین۔“

”بناؤ نہیں۔“ وہ جھینپ گئی۔ اور سفیدے کے پرانے درخت سے ٹیک لگا کر

کھڑی ہو گئی۔

سامنے کالج کی وسیع و عریض عمارت ملگجے سے اندھیرے میں بڑی عجیب لگ رہی

تھی اوپر کمروں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ پڑھا کو قسم کی چند لڑکیاں اپنی روم میٹس

کے شور و غل سے گھبرا کر برآمدے میں بیٹھی پڑھ رہی تھیں اور چند ان جیسی لالہ بلی

لڑکیاں ٹہل رہی تھیں۔ فضا میں خنکی تھی اس نے اپنے ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈال

لئے اور ادھر ادھر دیکھا۔

سرو اور سفیدے کے درخت آم اور انناس کے درختوں کے سائے ملگجے سی

روشنی میں عجیب سا تاثر دے رہے تھے۔

”اس سب میں کتنی مسٹری ہے کرن!“

”ایک تو تم بندوں کے بجائے چیزوں سے زیادہ متاثر ہوتی ہو، سمیرا تمہارے اس

ہینڈ سم کزن کی بات کر رہی تھی۔ جو پچھلے دو ہفتوں سے نہیں آیا۔“

”وہ شاید گاؤں گیا ہوا ہے۔“

”ہمیں بھی لے چلونا کسی دن اپنے گاؤں میں۔ تمہاری پھوپھو نے کتنے خلوص سے

انوائیٹ کیا تھا اور تم اتنی بے حس ہو کہ ایک بار بھی نہیں کہا کہ بے چاری لڑکیاں

ہوسٹل کی اہلی دالیں اور سوکھی روٹیاں کھاتے کھاتے کمزور ہو گئی ہیں، انہیں گاؤں کے

مکھن پیڑے کھلا لائیں۔“

”تم گاؤں چلو گی؟“ اس نے حیرت سے پوچھا اور پھوپھو کے گھر کا نقشہ اس کی



آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

”صحن میں، برآمدوں میں اور کمروں میں بے تکلفی سے گھومتی ہوئی مر گئیں۔ حقہ پیتی ہوئی پچھو اور سر سر بہتی ناکوں والے ان کے بیٹے۔ مگر انہیں اب بھلا ان کی ناکیں کہاں بہتی ہوں گی۔ اب تو وہ سب ہی شیر دل کی طرح بڑے ہو گئے ہوں گے۔ بلکہ شیر دل نے تو بتایا تھا کہ ٹیپو سلطان آرمی میں چلا گیا ہے اور آج کل کاکول میں ٹریننگ لے رہا ہے۔“

”ہاں۔ سچی ذرا آؤنگ ہو جائے گی۔“

”اچھا چلیں گے کسی دن۔“ اس نے بے دلی سے کہا۔

”تمہارا وہ کسی دن جانے کب آئے گا۔ میں خود تمہارے کزن سے کہوں گی کہ ہمیں ذرا گاؤں لے چلے۔“ میرا نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ارے سمو! یوں اس طرح اندھیرے میں گھاس پر مت بیٹھو کہیں کوئی چیز نہ کاٹ لے۔“ کرن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا دیا۔

”بی بی، چھوٹی وارڈن کہہ رہی ہیں، اب اپنے کمرے میں جائیں بہت رات ہو گئی ہے۔“ بابا شفیق نے انہیں دیکھ کر آواز لگائی۔

”ایک تو یہ چھوٹی وارڈن جانے اس نے آنکھوں کی جگہ کتنے پاور کے لینس فٹ کروا رکھے ہیں کہ کمرے میں بیٹھ کر بھی ہمیں دیکھ لیتی ہے۔“ سمیرا بڑبڑائی۔

”جی، انہوں نے تو آپ کو نہیں دیکھا۔“ بابا شفیق نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

”بلکہ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر کچھ لڑکیاں گھوم رہی ہوں تو ان سے کہو کمروں میں جائیں۔“

”تو پھر۔“ کرن حیدر نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”ہم نہیں گھوم رہے ہیں۔ تم جاؤ۔“

”جی مگر وہ چھوٹی وارڈن.....“ بابا شفیق کا نام تو شفیق تھا لیکن وہ ہر گز شفیق نہیں

تھا۔ فرسٹ ایئر کی لڑکیوں کو ڈرا دھمکا کر ان سے پیسے وصول کرنا اس کی خاص ہابی تھی۔ جو لڑکی اس کی جیب گرم رکھتی، وہ وقت بے وقت جب دل چاہتا گیٹ سے باہر نکل جاتی اور جو بے چاریاں اس گھر سے ناواقف تھیں۔ وہ کسی ضروری کام سے بھی جاتی تو ان کی پیشی ہو جاتی، البتہ سکینڈ ایئر تک پہنچتے پہنچتے لڑکیاں بہت سی چالاکیاں سیکھ جاتی تھیں اور وہ شفیق بابا کی دھمکیوں کی پروا نہیں کرتی تھیں۔

”چھوٹی وارڈن کو خواب تو نہیں آتے اور نہ ہی الہام ہوتا ہے۔“ سمیرا نے بابا کی بات کاٹ دی۔ ”تم مت بتانا ہم ابھی کچھ دیر بعد چلے جائیں گے۔“

”جی پھر جلدی چلی جائیے گا ورنہ وارڈن مجھے ڈانٹے گی۔“

”چلے جائیں گے بھائی! اب جان بھی چھوڑو۔“ کرن بیزار سی ہو گئی تھی۔

”میرا خیال ہے چلیں، بابا شفیق شکایت ہی نہ کر دے۔“

”نہیں کرے گا۔ ابھی کل ہی تو میں نے اسے پورا دس کانوٹ دیا ہے۔“ سمیرا نے نادرہ کو اطمینان دلایا۔ اور وہ تینوں پھر ٹہلنے لگیں۔

کرن ہولے ہولے گنگنانے لگی۔ خنکی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ نادرہ کی انگلیاں رخ ہو گئیں تو اس نے کرن کے رخساروں کو چھوا۔

”اف کس قدر ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔“ کرن بے اختیار پیچھے ہٹ گئی۔ ”چلو چلیں، گھبراہٹ ہو رہی ہیں۔ اس وقت جب آدھے سے زیادہ ہو سٹل خواب خرگوش کے کمرے لے رہا ہے، ہم جیسا بھی کوئی پاگل ہو گا جو اتنی ٹھنڈ میں چہل قدمی کر رہا ہو۔“

سمیرا نے اپنے کمرے کی طرف واپس جاتے ہوئے کہا۔

”خاموشی سے۔“ کرن نے تاکید کی۔ ”مس حبیب کے کان بڑے تیز ہیں۔“

اور تب وہ تینوں دبے قدموں مس حبیب کے کمرے کے سامنے سے گزر رہی تھیں تو عین اس لمحے مس حبیب نے دروازہ کھول کر انہیں دیکھا۔

کرلی۔ مگر ان کی اونچی آواز سارے برآمدے میں گونج رہی تھی۔

”کیا کریں بھئی، ذمے داری ہوتی ہے وارڈن کی کل کلاں کو کوئی بات ہو جائے تو تمہارے والدین تو ہمیں ہی پکڑیں گے۔ پچھلے سال بھی ایک لڑکی یو نہی ٹہلنے کے بہانے اپنے بوائے فرینڈ سے باتیں کیا کرتی تھی پھر ایک روز۔۔“

دو تین کمروں کے دروازے کھلے اور لڑکیاں سر باہر نکال کر جھانکنے لگیں۔  
”سوری میڈم۔“ کرن نے فوراً معذرت کر لی۔ ”آئندہ خیال رکھیں گے کہ اتنی دیر تک نہ ٹھہریں۔“

مس حبیب نے دروازہ بند کر لیا تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔  
”شکر ہے ندیا۔ آج تمہاری وجہ سے بچ گئے۔“

”میری وجہ سے کیوں؟“ نادرہ کو حیرت ہوئی۔  
”یار! تمہارے یونین میں ہونے کی وجہ سے۔“

”اچھا تبھی میں بھی کہوں یہ آج مس حبیب نے اتنی جلدی پیچھا کیوں چھوڑ دیا۔“  
سمیرا نے سر ہلایا۔

”ہیلو!“ فوراً تھ ایئر کی ماریہ احمد نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے انہیں پکارا۔  
”ڈانٹ پڑ گئی۔“

”ہاں۔“ کرن ہنسی۔ ”پہلی بار۔“  
”بس اب محتاط رہنا۔ آج سے تم مس حبیب کی نظروں میں آ گئی ہو۔“ ماریہ نے اپنا تجربہ بتایا۔

”یار، یہ پچھلے برس والی لڑکی کا کیا قصہ ہے۔“ سمیرا نے اپنا چہرہ کھڑکی کے ساتھ لگا لیا۔ اس روز بھی مس حبیب رومانہ وغیرہ سے کہہ رہی تھیں۔

”آ۔۔“ ماریہ دل کھول کر ہنسی۔ ”ہر سال مس حبیب نئی آنے والی لڑکیوں سے

”ادھر آؤ، تینوں کہاں سے آرہی ہو؟“  
اور وہ تینوں ٹھٹھک کر رک گئیں۔

”تو بہ کتنی کرخت آواز ہے۔“ کرن بڑبڑائی۔

برآمدے میں زیر و کا مدھم سابلبل جل رہا تھا۔ مس حبیب نے اپنے کمرے کا دروازہ پورا کھول دیا روشنی میں ان تینوں کے دروازے واضح نظر آنے لگے۔

”ڈرادر شن تو کراؤ۔“ لہجہ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔  
تینوں کے چہرے جھک گئے۔

”آخاہ مس نادرہ ہیں۔“ وارڈن ان کے قریب چلی آئی۔ ”اور یہ کرن بی بی بھی اور سمیرا بیگم بھی۔“ سر سے پاؤں تک انہوں نے ان کا جائزہ لیا۔ پھر یکایک غصے سے چیخیں ”کہاں تھیں تم؟“

”جی وہ۔“ کرن نے ڈرتے ڈرتے کہا ”ہم ٹہل رہے تھے۔“

”بہت اچھا وقت ہے ٹہلنے کا۔ اتنی سردی میں رات کو بیمار پڑ گئیں تو مصیبت ہمارے لئے۔“ ان کا لہجہ پھر بدلا۔

”سچ بتاؤ کس کو ناٹم دیا ہوا تھا۔“

”جی!“ تینوں نے بے حد حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

”ہاں۔ ہاں مجھے کیا خبر تم نے کس کو چار دیواری کے باہر کھڑا کر رکھا ہے۔“

نادرہ کو ان کی ذہنیت پر افسوس ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا تھا۔  
”ہم ایسی لڑکیاں نہیں ہیں مس حبیب۔“ اس نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ سارا خون اکٹھا ہو کر اس کے رخساروں پر جمع ہو گیا تھا اور وہ بڑی ناگواری سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

مس حبیب نے اس کے لہجے کی تیزی محسوس کی اور آواز میں ذرا سی نرمی پیدا

کہتی ہیں کہ پچھلے سال ایک لڑکی -- حالانکہ مجھے چار سال ہو گئے ہیں ہو شل میں ان چار سالوں میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا اور اس سے پچھلے چار برسوں میں بھی ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا کیونکہ میری کرن اسی ہو شل میں رہی ہیں، تقریباً چھ برس تک مس حبیب کے آنے سے پہلے وہی مسز نواز کو اسسٹ کرتی تھیں پھر ان کی شادی ہوئی تقریباً چار برس پہلے تو مس حبیب ان کی جگہ آئیں۔ "ماریہ نے تفصیل بتائی تو سمیرا حسن نے تاسف سے سر ہلایا۔

"بے چاری نفسیاتی کیس ہیں۔" نادرہ نے سوچا۔ "جانے ان کی نفسیات کیا ہے۔" پھر وہ ماریہ کو شب بخیر کہتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئیں۔ ہو شل کی عمارت بہت بڑی تھی۔ تقریباً ساڑھے تین سو لڑکیاں ہو شل میں مقیم تھیں۔ مسز نواز کی عمر زیادہ تھی اور وہ اکیلے اتنی لڑکیوں کو کنٹرول نہیں کر سکتی تھیں۔ چنانچہ پچھلے سات آٹھ برسوں سے ان کی درخواست پر انہیں ایک اسسٹنٹ ملی ہوئی تھی اور اب چار برسوں سے تو مس حبیب بطور وارڈن یہاں کام کر رہی تھیں دراصل مسز نواز نے بیماری کی وجہ سے چھ ماہ کی رخصت لے لی تھی اور ان کی جگہ مس حبیب کو عارضی طور پر بھیجا گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کوئین میری میں تھیں۔ مسز نواز کے آجانے کے باوجود مس حبیب بدستور کام کر رہی تھیں اور چھوٹی وارڈن کہلاتی تھیں۔ اپنے مزاج کی تندگی کی وجہ سے کوئی بھی انہیں پسند نہیں کرتا تھا۔ اور مسز نواز سے بھی ان کی نہیں بنتی تھی اور مسز نواز بھی انہیں سخت ناپسند کرتی تھیں کیونکہ انہیں یہ خوف تھا کہ مس حبیب کی موجودگی کی وجہ سے انہیں جلد ریٹائر کر دیا جائے گا۔ ایک بار پہلے بھی ان کے ریٹائرمنٹ کے آرڈر آئے تھے لیکن پرنسپل کی سفارش پر ان کی مدت ملازمت میں توسیع کر دی گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی جانی دشمن تھیں۔ مس حبیب تو اونچی کرخت آواز میں خوب چیخ چیخ کر ان کی پارسائی کا بھانڈا پھوڑتیں۔ جبکہ وہ دبے دبے

لفظوں اور دھیسے لہجے میں ان کے خلاف زہرا گلتیں۔

"اگر مسز نواز ملکی سیاست میں حصہ لیتی تو بہت کامیاب رہتیں۔" یہ کرن کی رائے تھی ان کے بارے میں۔

جبکہ سمیرا کا خیال تھا کہ وہ انتہائی گھنی اور مکار ہیں۔

نادرہ بہت دیر تک بستر پر لیٹی مس حبیب کے بارے میں سوچتی رہی اور پھر یونہی سو گئی۔

نادرہ کو اچانک ہی درد اٹھا تھا۔ بہت شدید اور ناقابل برداشت درد۔ درد کے ساتھ ہی اسے بار بار قے بھی ہو رہی تھی۔ ایک گھونٹ پانی کا پیتی تو وہ بھی نکل جاتا۔ وہ بڑی بہادری سے درد برداشت کر رہی تھی۔ ڈپنسری میں موجود ساری دوائیں اس نے استعمال کر ڈالی تھیں مگر درد تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا، مسز نواز اپنے بیٹے کے پاس گئی ہوئی تھیں (وہ اکثر جمعرات کی شام چلی جایا کرتی تھیں) اور مس حبیب کے پاس جاتے ہوئے کرن حیدر کو ڈر لگ رہا تھا مگر پھر نادرہ کی حالت کے پیش نظر وہ ڈرتے ڈرتے مس حبیب کے پاس گئی۔

"دہی بڑے کھائے ہوں گے یا پھر چاٹ کھا کر آئی ہو گی۔"

"نہیں، ہم لوگ بازار تو گئے ہی نہیں۔ صبح سے ہی نادرہ کو درد ہو رہا تھا۔"

"صبح سے ہو رہا تھا اور اب بتانے آئی ہو رات کو! جیسے سارے شہر کے ڈاکٹر

میرے ملازم ہیں ناکہ جب بھی جاؤں گی، ہاتھ باندھے خدمت کو موجود ہوں گے۔"

"جی پہلے وہ ڈپنسری سے....."

"ہاں جاؤ سسٹرز بیدہ کے پاس، کہو درد کا ٹیکا لگا دے۔"

"انجکشن تو صبح زبیدہ نے لگا دیا تھا۔"

"اچھا تو پھر جاؤ میں کیا کروں۔ صبح ہی ڈاکٹر کے پاس بھجواؤں گی۔"

وہ مایوسی سے واپس پلٹ آئی لیکن نادرہ کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ دروازے دہری ہو رہی تھی اور اس کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو رہا تھا۔

”سمو کیا کریں اب؟“ کرن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”شام کو میں نے کہا بھی تھا کہ ڈاکٹر کے ہاں چلتے ہیں مگر ندیا نے مانا ہی نہیں۔“

”تم باجی خالدہ کے پاس جاؤ نا۔ وہ کس مرض کی دوا ہیں۔“ سمیرا نے ہوشل کی ہیڈ گرل کا نام لیا۔ ”ہم نے ان کو اس لئے تو ووٹ نہیں دیا تھا کہ وہ صرف وارڈن کی چمچ گیری کرتی رہیں۔“

”اچھا تم بیٹھو ندیا کے پاس میں جاتی ہوں۔“  
کرن پھر واپس چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد باجی خالدہ اور مس حبیب کے ساتھ واپس آئی جو مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔

”جانے کیا اوٹ پٹانگ چیزیں کھاتی پھرتی ہیں اور مصیبت ہمارے لئے بن جاتی ہے۔ آج شام شاپنگ ڈے تھا نا۔ کھا آئی ہوں گی بھینس کے کباب اور کچے نان۔“  
”میڈم ہم بازار نہیں گئے۔“ کرن نے پھر ان کی تصحیح کی تو انہوں نے لال لال آنکھوں سے گھورا۔ اور نادرہ کو دیکھنے لگیں۔

”کیا تکلیف ہے بھئی؟“  
”بہت شدید درد ہے میڈم!“ نادرہ نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دباتے ہوئے کہا۔  
”ہوں۔“ انہوں نے پیچھے مڑ کر ڈپنسری انچارج، سسٹر زبیدہ کو دیکھا جو گرم پانی کی بوتل لا رہی تھیں۔

”یہ بوتل رکھو، ٹھنڈ لگ گئی ہوگی۔ ان کو سردی میں چہل قدمی کا بھی تو شوق ہے رات کو پھر.....“

”تو میڈم۔“ کرن حیدر نے ان کی بات کاٹی، ”ہم تو اس روز کے بعد پھر۔“

”لڑکی!“ مس حبیب کو اس کے اس طرح بات کانٹنے پر شدید غصہ آیا۔ ”تم کمرے سے باہر نکل جاؤ۔“

ایک تو اس سردی میں وہ اپنے کمرے سے اٹھ کر آئی تھیں، دوسرے لڑکی کی حالت واقعی انہیں خطرناک لگ رہی تھی۔

”خواہ مخواہ کی مصیبت، ایک تو مسز نواز کو بھی سیر کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔ بھی اتنی ہی محبت ہے اپنے بیٹے سے تو ریزائن دے کر گھر بیٹھو اس کے گھٹنے بے لگ کر۔ میں اب کیا کروں؟“ وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھیں۔

”صبح سے کئی بار پانی کی بوتل گرم کر کے دے چکی ہوں۔“ زبیدہ نے بوتل نادرہ کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں اپنڈکس نہ ہو۔“

”اور یہ خیال اب رات کے دس بجے ظاہر ہو رہا ہے۔“ مس حبیب نے سارا غصہ اس پر نکالا۔ ”میں تنہا کوئی ذمے داری نہیں لے سکتی، مسز نواز بھی نہیں ہیں اور۔۔۔ اسے تو موقع چاہئے کوئی بات ہو گئی تو۔۔۔“ انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر نادرہ کو مخاطب کیا۔ ”تمہارا یہاں لاہور میں گارجین کون ہے۔ فون نمبر ہے اس کا؟“  
”جی پتا نہیں۔“ نادرہ نے سسکی لی۔

”یعنی تمہیں اپنے گارجین کا فون نمبر بھی نہیں معلوم۔۔۔“  
”جی، وہ سنی ماموں نے ہی فارم فل کیا تھا۔“

”سمجھتے ہیں ہمارے دماغ خراب ہیں جو ہم گارجین کا ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ اب ایسے موقعوں پر ضرورت پڑ سکتی ہے مگر رسمی کارروائی کر دیتے ہیں جس کا دل چاہا گارجین کے طور پر پتا لکھ دیا۔ پچھلے برس بھی ایک لڑکی کے ساتھ ایسا ہوا تھا، دو دروازے کے ایک ملنے والے کا نام پتا لکھو ادیا اور جب لڑکی کو اچانک ایسی ہی ایمر جنسی مین بھجوانا پڑا تو۔۔۔“ ان کے زرخیز ذہن نے فوراً پچھلے برس کا ایک واقعہ ترتیب دے لیا تھا۔

”میرا خیال ہے انہیں ایمر جنسی میں لے جائیں۔“ اب کے باجی خالدہ نے ان کی بات کاٹی تھی اس لئے وہ صرف اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

”اس کا ایک کزن بھی ہے یہاں گورنمنٹ کالج کے ہوٹل میں ہوتا ہے۔“ سمیرا نے بتایا۔

”رہنے دو لڑکی! یہ کزن وغیرہ کا رشتہ انتہائی مشکوک رشتہ ہے۔ مجھے کیا خبر کہ وہ اس کا کزن ہے یا.....“

”میڈم پلینز۔ آپ جائیں میرا درد خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“

نادرہ نے کروٹ بدل لی۔

مس حبیب اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آؤ خالدہ! ذرا اس کے گارجین کافون نمبر تو دیکھو رجسٹر میں۔ اگر کوئی ہے۔ نہیں تو ایڈریس لکھ لو۔“ بھجوادو اسے مقامی گارجین کے ہاں، وہی لے جائے گا ایمر جنسی میں۔“

”اب کیا ہو گا؟“ کرن حیدر نے بے حد پریشان ہو کر نادرہ کی طرف دیکھا۔ ”یہ جو تمہارے گارجین ہیں کیسے آدمی ہیں۔“

”پتا نہیں۔“ نادرہ درد کی شدت سے بے حال ہو رہی تھی۔ ”مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ وہ سنی ماموں کے دوست ہیں۔“

”پھر تو قابل اعتماد ہی ہوں گے۔“ کرن نے تشویش سے کہا۔ اس کے ذہن میں مس حبیب کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ”میریڈ ہیں یا۔۔؟“

”پتا نہیں۔“ نادرہ کی آنکھوں میں آنسو چل اٹھے۔ اب درد برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ ”سمو میں مر جاؤں گی۔“

”حوصلہ کرو ندیا! ہم تمہیں ابھی ہسپتال لے چلتے ہیں۔“ سمیرا نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ”نہیں سمو! یہ درد۔۔ نہیں، میں نہیں بچوں گی اب۔ مجھے بی جان کے قریب

الغن کرنا۔ سنی ماموں کو بتا دینا۔ یہ میری وصیت ہے اور مہی پاپا سے کہہ دینا کہ میں نے ان سے بہت محبت کی ہے۔“

”ندو! ایسی باتیں نہ کرو۔“ کرن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تب ہی باجی خالدہ نے اندر جھکا نکا۔ ”کیا حال ہے؟“

”خالدہ باجی، پلینز کچھ کریں اگر مس حبیب نہیں مان رہیں تو ہم خود اسے اسپتال میں لے جائیں گے اور.....“

”اور۔۔۔“ کرن نے غصے سے سمیرا کی بات کاٹ دی۔ ”اگر ندیا کو کچھ ہو گیا تو پھر مس حبیب بھی زندہ نہیں رہ سکیں گی ہم کوئی گئے گزرے لوگ نہیں ہیں میرے ڈیڑی.....“

”تم یو نہی جذباتی ہو رہی ہو، باجی خالدہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”بابا رحمت ٹیکسی لینے گیا ہے اور بابا شفیق ساتھ جائے گا اور ندیا کو اس کے گارجین کے گھر پہنچا آئے گا۔“

”کیا ہم اسپتال نہیں چل رہے؟“ سمیرا نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں، مس حبیب نے کہا ہے کہ نادرہ کو مبشر صاحب کے گھر پہنچا دیا جائے۔ دراصل رجسٹر میں اور فارم میں ان کے آفس کافون نمبر لکھا ہوا ہے گھر کا نہیں۔“

”لیکن کیا بہتر نہیں تھا باجی خالدہ کو ہم انہیں کسی بھی اسپتال کی ایمر جنسی میں لے جاتے۔ ممکن ہے مبشر صاحب گھر نہ ہوں ممکن ہے وہ.....“ سمیرا نے بحث کی۔

”بہتر تو تھا مگر مس حبیب کا حکم ہے۔“ باجی خالدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تو پھر میں اور سمیرا ابھی نادرہ کے ساتھ جائیں گے۔ کیا پتا وہ صاحب کیسے ہوں۔“ نادرہ کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں یا نہ جائیں۔ نادرہ تکلیف میں ہے اور بابا شفیق کا

کیا پتا نہ جانے کہاں چھوڑ آئے۔“

”ٹھیک ہے تم چلی جاؤ۔“

”کیا مس حبیب اجازت دے دیں گی؟“ سمیرا نے پوچھا۔

”میں بات کر لوں گی ان سے۔“

ٹیکسی آگئی تو باجی خالدہ انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ وہ دونوں بھی نادارہ کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھیں۔ خالدہ نے اچھی طرح بابا شفیق کو ایڈریس سمجھا دیا تھا۔

شادمان میں مبشر حسن کا گھر تلاش کرنے میں انہیں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی لیکن مبشر حسن براؤن گاؤن کی ڈوریاں کستا ہوا الجھا الجھا سا انہیں دیکھ رہا تھا۔ بابا شفیق شاید ٹھیک طرح سے انہیں اپنی بات سمجھا نہیں سکا تھا۔

”میں تو نادارہ نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا بھائی۔“

”دیکھئے مسٹر! شاید کیا یقیناً آپ نادارہ کو نہیں جانتے ہوں گے لیکن اس کی بد قسمتی یہ ہے کہ اس کے ہوسٹل کے ایڈمیشن فارم میں مقامی گارجین کی حیثیت سے آپ کا نام لکھا ہے۔ یقیناً سنی ماموں نے کسی بھروسے پر ہی آپ کا نام لکھوایا ہو گا۔“

”سنی“ اس نے کچھ سوچا۔ ”اوہ مائی گاڈ! یہ نادارہ سنی کی بھانجی ہیں۔ پلیز اندر چلیں اور مجھے ساری بات بتائیں لیکن میری بیوی وہ۔۔۔“ وہ کچھ ہچکچا گیا۔

”جی آپ کی بیوی کو اعتراض ہو گا کیا؟“ کرن کی زبان خاص تیز تھی۔

”نہیں، نہیں۔“ وہ کچھ گھبرا گیا۔ ”پلیز آپ چلیں لیکن کوئی ایسی ویسی بات مت

کیجئے گا اس کے سامنے۔“

”کرن“ نادارہ نے جو ٹیکسی سے ٹیک لگائے ہوئے ہونٹ بھینے کھڑی تھی، نقاہت سے بولی۔ ”چلو، شفیق بابا سے کہو ہمیں سروس اسپتال پہنچا دے اور۔۔۔“ اس نے پلکیں اٹھا کر

مبشر حسن کو دیکھا۔ ”ہم ناوقت تکلیف دہی کی معافی چاہتے ہیں۔“

مبشر حسن کی نگاہیں اس کے چہرے کے جمال پر ٹھہر سی گئیں۔

”آپ اتنی اجازت تو دیں گے ناکہ ہم ایک فون کر کے نادارہ کے کزن کو بلا لیں اور مصیبت تو یہ تھی کہ اگر مس حبیب مان جاتیں تو اب تک انہیں اسپتال میں ایڈمٹ بھی کر لیا جا چکا ہوتا۔ مگر۔۔۔“ کرن یکا یک نادارہ کی طرف پلٹ گئی۔ ”رات تو کسی طرح گزرے اور صبح ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کرنا ہے کہ سنی ماموں کو بلا کر اپنے گارجین کا نام بدلو۔۔۔ اگر شیر دل ہوتا تا۔۔۔“

”آپ یونہی ناراض ہو رہی ہیں۔“ مبشر حسن کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ آئی۔ ”آپ اتنا وقت تو مجھے دیں تاکہ میں گاڑی نکال لوں۔“

”پہلے اپنی مسز سے تو پوچھ لیں۔“ کرن بے حد تلخ ہو رہی تھی۔

اس کے چہرے پر سایہ سا آکر گزر گیا۔ اور وہ کرن کی بات نظر انداز کر کے شفیق سے کہنے لگا کہ وہ ٹیکسی پر چلا جائے۔ تب ہی اندر سے ایک خاتون باہر آئیں۔ گہرے نیلے اور ہلکے پیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھولوں والی نائیٹی پہنے کھلے بالوں کے ساتھ وہ کافی دلکش لگ رہی تھیں لیکن ان کے چہرے پر ایک کراختگی تھی جس نے ان کے چہرے کی جاذبیت کو کم کر دیا تھا۔ بہت ناگواری سے اس نے انہیں دیکھا۔

”موبی! کیا مسئلہ ہے۔ ایک تو یہ لڑکیاں رات کو بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ یہ نادارہ ہیں۔ یہاں۔۔۔۔۔ ہو لے ہو لے اس نے ساری بات اسے بتائی۔

مگر وہ بے یقینی اور شک سے انہیں دیکھتی رہی۔ نادارہ کو سخت توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ مبشر انہیں وہیں چھوڑ کر خود لباس تبدیل کرنے چلا گیا تھا اور اس کی بیوی نے اس دوران خاصا سخت انٹرویو لے ڈالا تھا ان کا۔ نادارہ کے اختیار میں ہوتا تو وہ ایک لمحہ بھی نہ ہٹکتی۔ اسے سنی ماموں پر غصہ آ رہا تھا جنہوں نے اس قدر کمزور ارادہ شخص کا نام لکھوایا تھا اور اگر جو کرن نے اس طرح باتیں نہ کی ہوتیں تو شاید بیوی کے خوف سے وہ رات

کے اس پہر اسے گھر سے ہی نکال دیتا۔

”اوہ گاڈ!“ درد کی شدت سے اس نے آنکھیں موند لیں۔

کرن نے اس کا ہاتھ تھام کر تھپتھپایا۔

”چلیں۔“ وہ گاڑی کی چابی ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔

کرن نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور تمام راستہ خاموش رہی۔ اسپتال نزدیک ہی تھا۔ فوراً ہی اسے ایمر جنسی میں لے جا کر ڈرپ لگا دی گئی پھر ڈاکٹر آئے انہوں نے چیک کیا۔ اسے اپنڈکس تھی آپریشن ضروری تھا۔ اسے آپریشن روم میں لے جایا جا رہا تھا۔ وہ کچھ بے سدھ سی پڑھی تھی۔ کرن بار بار مبشر حسن سے التجا کر رہی تھی کہ وہ گھر جانے سے پہلے شیردل کو خبر کر دے نادرہ چاہتی تھی کہ کرن کو منع کر دے کہ خواہ مخواہ وہ اس شخص کی منت نہ کرے لیکن اس پر غشی سی طاری ہو رہی تھی۔

کب آپریشن ہوا۔ کب مبشر حسن گھر واپس گئے۔ کب شیردل آیا اسے کسی بات کی خبر نہ تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے بازو میں ڈرپ لگی تھی۔ کرن اس کے بیڈ کے قریب زمین پر اپنی چادر بچھائے سو رہی تھی اور سمیرا بچ پر بیٹھی جھوم رہی تھی۔ اور اسے درد کا احساس ہو رہا تھا۔

”سمو!“ اس نے نقاہت سے پکارا۔

”نندیا!“ سمیرا اٹھ کر اس کے پاس چلی گئی۔

”میرا آپریشن ہو گیا؟“ آنسو اس کی آنکھوں میں جمع ہو گئے۔ اس طرح یولی کسمپری کے عالم میں کہ کوئی بھی اپنا پاس نہیں تھا اور اسے ایک شخص کا احسان مند ہونا پڑا تھا۔

”ارے ارے روؤ نہیں۔“ سمیرا نے اس کے آنسو پونچھے۔ تب ہی دروازہ کھلا۔ دروازے میں مبشر حسن کھڑے تھے۔ نادرہ نے آنسو پونچھ کر انہیں دیکھا وہ مسکرائے

اور ایک قدم آگے بڑھ آئے۔

”کیسی ہیں آپ؟“

”شکریہ۔ ٹھیک ہوں۔“

”میں نے سنی کو اطلاع کر دی ہے۔ وہ پہلی فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں۔“

”شکریہ۔“ اس نے پھر شکریہ ادا کیا۔ تو ان کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آکر معدوم ہو گئی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی باسکٹ بیبل پر رکھ دی۔

”لڑکیو، آپ کے لئے ناشتا۔“

”اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی ہم کینٹین سے منگوا لیتے۔“ سمیرا نے رسماً کہا۔

”یہ بھی کینٹین سے لائے ہوں گے بل پے کر دو۔“ کرن بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”آپ بہت خفا ہیں؟“ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”آپ نے شیردل کو اطلاع دی۔“ وہ اس کا سوال ہی نظر انداز کر گئی۔

”ہاں میں گیا تھا لیکن وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔“

کرن کے ساتھ نادرہ کو بھی افسوس ہوا۔ وہ کم از کم مزید اس شخص کا احسان مند نہیں ہونا چاہتی تھی۔ بلا سے وہ سنی کا دوست ہی کیوں نہ ہو۔

”یہ میرے آفس کا فون نمبر ہے۔“ اس نے اپنا کارڈ سمیرا کو دے دیا۔ ”آفس سے

واپسی پر تو میں آؤں گا لیکن اس سے پہلے اگر کوئی پراہم ہو جائے تو مجھے فون کر دیجئے گا۔“

سمیرا نے کارڈ لے لیا۔ نادرہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ اس کو آنکھیں بند کرتے دیکھ کر باہر نکل گیا۔

سنی ماموں آگئے تھے۔ ان کے آنے سے اسے بڑی ڈھارس ہوئی۔ سارا دن

ہوسٹل سے لڑکیاں اسے دیکھنے آتی رہیں۔

وہ سنی ماموں کے آنے کے بعد بھی کئی بار اسپتال میں آیا۔ لیکن اس کے پاس کوئی

لڑکی موجود ہوتی۔ سنی ماموں سے بات کرتے کرتے کبھی کبھی وہ اسے ایک نظر دیکھ لیتا تو اسے عجیب سا احساس ہوتا۔ وہ اس شخص کے سامنے پہلی بار عجیب کسمپرسی کی حالت میں گئی تھی۔ کاش! کاش، ایسا نہ ہوتا۔ وہ اس سے کسی اور طرح ملی ہوتی کسی اور پوزیشن۔

لیکن کیوں، میں بھلا ایسا کیوں سوچ رہی ہوں، وہ حیران ہو کر خود ہی سوچتی اور پھر خود ہی سر جھٹک کر یہ خیال ذہن سے نکال دیتی۔

جیسے ہی ڈاکٹر نے اجازت دی، سنی ماموں سے گھر لے آئے۔ آنے سے پہلے اسپتال میں اس کی موجودگی میں ہی کرن نے سنی ماموں کے سامنے تجویز پیش کی کہ گارجین کی جگہ اس کے بجائے شیردل کا نام لکھو ادیا جائے۔

”کیوں؟“ سنی ماموں نے حیرت سے پوچھا۔

”پھر کبھی خدا نخواستہ ایسی صورت حال ہو جائے تو ان کے لئے پر اہم ہوگا۔ اس روز بھی ان کی مسز کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اور مجبوراً انہیں آنا پڑا۔“ کرن اسے کسی صورت معاف کرنے کو تیار نہ تھی۔ ”کیا خبر پھر کبھی بچے کی طبیعت خراب ہو جائے۔“

”بچے تو خیر اس کے بھی اپنی طرح نہیں ہیں۔ مگر شیردل ہو شل میں رہتا ہے اور.....“

”کیا آپ بھی یہی چاہتی ہیں نادارہ کہ آپ کا گارجین کوئی اور ہو۔“ اس نے ذرا سا اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی تو اس کا دل عجیب طرح سے دھڑک اٹھا۔ اسکی آنکھوں کے سحر نے جیسے اسے جکڑ سالی۔

”نہیں۔۔۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ”جو نام اب لکھا ہوا ہے، وہ صحیح ہے۔“

سنی ماموں ضروری تو نہیں کہ روز ایسی ہی کوئی بات ہو۔“

اس نے انتہائی جلد اپنے والے انداز میں کرن کو دیکھا۔ تو کرن برا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”تھینکس۔“ اس نے جھک کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

سنی ماموں اب نرس کی طرف متوجہ تھے اور کرن، سمیرا سے محو گفتگو تھی اور وہ چاہنے کیوں گھبرا رہی تھی۔ اس کی پلکیں بار بار اٹھ اور گر رہی تھیں اس کی گھبراہٹ دیکھ کر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مبشر نے اپنا رخ سنی کی طرف کر لیا۔

گھر میں سنی ماموں اور آنٹی نے اس کا بہت خیال رکھا۔ آنٹی تو اسے بستر سے ہلنے بھی نہ دیتی تھیں اور انہوں نے اس کا اتنا خیال رکھا کہ اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ وہ یونہی ان کے بارے میں بدگمان رہتی تھی۔ اس نے تو خود ہی کبھی ان کے کسی طور پر قریب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی کبھی ان کا درد جاننا چاہا تھا۔ وہ تو بس بی جان سے ہی چمٹی رہتی تھی اور سمجھتی تھی کہ آنٹی سکی ہیں، تلخ مزاج ہیں اور اگر وہ تلخ مزاج بھی تھیں تو اس کی وجہ شاید اولاد سے محرومی تھی۔۔۔ تنہائی کا احساس تھا۔ آخر وہ کیا کرتیں۔ اپنی محرومیوں کا بدلہ کس سے لیتیں۔ اس لئے وہ چیختی تھیں، غصے میں رہتی تھیں۔ اور وہ انہیں انتہائی بے حس سمجھا کرتی تھی اور اکثر سوچتی تھی کہ اتنی اچھی بی جان کی ایسی بے حس بیٹی کیسے پیدا ہو گئی اور اب جس طرح وہ اس کے لئے پریشان تھیں اس کا خیال رکھ رہی تھیں۔ اس کا دل گداز ہوتا رہتا۔ کئی بار اس کا دل چاہا وہ ان سے کوئی بات کرے۔ ان کی اس بے تحاشا محبت کا شکریہ ادا کرے لیکن عجیب سی جھجک تھی۔ وہ بس نم آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہتی لیکن جس روز وہ واپس آرہی تھی تو انہوں نے گلے لگاتے ہوئے اس کی پیشانی کا بوسہ دیا تو وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، زور زور سے۔

”ارے ارے۔“ سنی ماموں بوکھلا گئے۔

آنٹی نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

”آنٹی، آپ بہت اچھی ہیں، بہت اچھی۔“ روتے روتے سسکیاں لیتے ہوئے اس



نے بمشکل اتنا ہی کہا اور دوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ وہیں گیٹ کے پاس کھڑی تھیں اور آنسو ان کی آنکھوں کے کناروں پر چمک رہے تھے۔

سارا راستہ وہ آنٹی کے متعلق سوچتی رہی۔

’ایک نیا درد۔۔۔ اس نے سوچا، ایک اور آگہی۔‘

آدمی کو سمجھنا اور پہچاننا کتنا مشکل ہے اور ہم لوگ بعض اوقات کسی کو دیکھ کر یوں ہی کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں، کوئی اچھی یا بری رائے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ بہت لوگوں کو ہم بہت اچھا سمجھتے ہیں لیکن وہ اتنے اچھے نہیں ہوتے اور بہت سے لوگوں کو ہم برا سمجھتے ہیں اور وہ برے نہیں ہوتے اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ فرسٹ امپریشن ازدی لاسٹ تو غلط کہا ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے مبشر حسن کی بیوی کا چہرہ آگیا۔

خوبصورت لیکن کرخت

پیشانی پر ناگواری کی شکنیں لئے۔

بیزاری سا۔

کیا پتا اندر سے وہ عورت اتنی کرخت نہ ہو جتنی کہ چہرے سے لگتی ہے۔ کیا پتا اندر

سے اس کا دل بہت نرم ہو۔

اور یہ ناگواری اور بیزاری۔

شاید سنی ماموں کا دوست اچھا نہ ہو۔

”مگر نہیں۔۔۔“ اس کے دل نے خود ہی تردید کر دی۔ ”وہ تو۔“

اور دل یک دم زور سے دھڑکا۔

اس نے گھبرا کر سنی ماموں کی طرف دیکھا جو اس سے بے نیاز گاڑی ڈرائیو کر

رہے تھے۔

”سنی ماموں۔ آپ کے یہ دوست۔۔۔“

”کون مبشر؟“

”جی ہاں۔“

”گھبراؤ نہیں گریا، وہ بہت پیارا شخص ہے۔ کچھ کو تا ہی اس سے ہوئی ہے اور اس کے لئے وہ مجھ سے معذرت کر چکا ہے۔ دراصل پہلے تو وہ ملک سے باہر گیا ہوا تھا پھر آیا تو تمہارا خیال ہی نہ رہا ورنہ خبر لیتا۔“

”یہ بات نہیں۔ میں تو پوچھ رہی تھی کہ آپ نے ان کی بیوی دیکھی ہے، کتنی پیاری ہیں لیکن کچھ اکھڑی اکھڑی سی لگتی ہیں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔“ سنی ماموں نے قہقہہ لگایا۔ دراصل ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اسے موبی کے لئے اپنے والدین کو چھوڑنا پڑا ہے۔ لو میرج ہے دونوں کی، موبی نے بھی ہومی کے لئے بڑی جنگ لڑی ہے۔ بہت پریشان رہا ہے۔ دونوں کے والدین رضا مند نہ تھے۔ عقیدوں کا فرق تھا۔ پھر آخر موبی جیت گیا تو اس کا اکھڑا ہونا فطری ہے۔ ہما بھابی بھی اپنے گھر میں بہت لاڈلی تھیں۔ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہیں۔“

’اچھا۔۔۔‘ اس نے سوچا، تو ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ آنٹی اس لئے سکی ہیں کہ ان کی اولاد نہیں ہے۔

”ہمارا اس لئے کرخت لگتی ہے کہ جدائی کا کرب سہہ رہی ہے۔ اسے ایک شخص کو پانے کے لئے اتنے بہت سوں کو چھوڑنا پڑا ہے۔ اور اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو کیا میں ایک شخص کے لئے سب کو چھوڑ دیتی مگر میرا ہے ہی کون۔۔۔؟“

”ماما اور پاپا اور وہ بھی سال میں صرف ایک ماہ کی رسمی ملاقات۔“

اور اگر کوئی مجھے اس طرح چاہتا اتنی شدت سے کہ میرے لئے مبشر حسن کی طرح جنگ لڑتا سب سے۔ تو۔ تو شاید۔۔۔۔۔“

اللہ، یہ محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔

چھوٹی وارڈن کو ایک باجی خالدہ کو۔“

”چھوٹی وارڈن کو ہائے۔“ سمیرا پیالی ہاتھ میں تھامے بستر پر دراز ہو گئی۔ تو نے یہ کیا غضب کیا!“

”تمہارا دماغ تو صحیح تھا۔۔۔“ رافعہ نے جو پلیٹیں اور چمچ اٹھائے آرہی تھی، حیرت سے اسے دیکھا۔

”دماغ تو صحیح ہے۔“ کرن بہت مطمئن تھی۔

”پھر یہ حماقت۔“

”یار! بے چاری چھوٹی وارڈن کیسی خشک اور بور زندگی ہے اس کی۔ سارا دن چمچ۔ اور رات کو اکیلی تنہا اس۔ میں نے سوچا آج انجوائے کر لے۔“

”خاک انجوائے کرے گی۔“ سمیرا نے جل کر کہا۔ ”الٹا ہمارا موڈ بھی خراب ہو گا۔“

”ایمان سے اتنی خوشی ہوئی تھی جب میں نے بلا کر کہا۔ ہنسی ہونٹوں سے نکل رہی تھی۔ فوراً ہی باجی خالدہ کو بلا کر کہا، ذرا شام کو پارٹی میں جانے کے لئے اس کے کپڑے نکال کر استری کر دے۔“

چھوٹی وارڈن کے آنے کا سن کر سب کچھ بیزار سی ہو گئیں لیکن شام ہوتے ہی سمیرا اور کرن کی جاننے والی سب لڑکیاں نئے کپڑے پہن کر میک اپ کئے چمکتی ہوئی آ گئیں۔

مس حبیب نے بھی ہلکا پیازی سوٹ پہنا ہوا تھا۔۔۔ لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی اور اچھی خاصی دلکش لگ رہی تھیں۔

”مس حبیب ہنس رہی ہیں۔“ سمیرا نے کرن کے کان میں سرگوشی کی۔

”اچھا“ کرن نے مڑ کر انہیں دیکھا اور چاٹ کی پلیٹ اٹھائے ان کے قریب آ گئی۔

”مس حبیب! آج آپ بہت خوبصورت لگ رہی ہیں۔“

”ریلی! مس حبیب ایک دم بہت خوش ہو گئی تھیں۔“

ایک مرد کی محبت

کس قدر خوبصورت اور دلنشین۔

جیسے..... جیسے مہروز نے مسز ایلس سے محبت کی تھی۔

کیسی طوفانی اور شدید محبت۔

لیکن انجام۔۔۔ یہ تو مقدر کی بات تھی نا اور اگر مہروز زندہ ہوتے تو.....

”کیا مجھے بھی۔ مجھے بھی کوئی چاہے گا کبھی اس طرح۔ یوں اتنی شدتوں سے؟“

یونہی لمحہ بھر کو اسے خیال سا آیا اور اسکے رخسار تپ اٹھے۔ اس نے چور نظروں

سے سنی ماموں کی طرف دیکھا۔

”اللہ۔ اگر سنی ماموں کو پتا چل جائے کہ میں کیا سوچ رہی ہوں تو کیا کہیں گے اور

میں ابھی صرف سولہ سال کی ہوں اور۔۔۔“

”کچھ ہو گی؟“ سنی ماموں نے ایک ریٹورنٹ کے سامنے گاڑی روکی تو اس کے

خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔



ہوشل میں سب نے اس کا پر جوش خیر مقدم کیا۔ کرن نے تو فوراً اس کی صحت

یابی کی خوشی میں پارٹی ترتیب دے ڈالی۔ سمیرا نے چاٹ بنائی۔ کرن اور رافعہ نے چندہ

اکٹھا کر کے بازار سے سمو سے اور کیک منگوایا۔ اور اپنی لائن کے ہر کمرے سے بسکٹ اور

نمکو اکٹھا کر کے فوراً چار پائیاں ایک طرف کر کے ٹیبلز لگا دیں اور خاص خاص لڑکیوں کو

شام کی چائے کی دعوت بھی دے آئی۔

”غیر متعلق لوگوں کو تو نہیں بلایا؟“ سمیرا نے مختلف کمروں سے مانگی ہوئی بیالیوں

کو میز پر ترتیب سے رکھتے ہوئے پوچھا۔

”صرف دو بندوں کو۔“ کرن اطمینان سے پاؤں پھیلاتے ہوئے بولی۔ ”ایک

”بے شک نادرہ سے پوچھ لیں۔ ندی! ادھر تو آؤ۔“

نادرہ نے، جو ایک لڑکی کا ہاتھ تھامے خدا جانے کیا کہہ رہی تھی، ایک دم چونک کر انہیں دیکھا۔

”دیکھ مس حبیب آج پیاری لگ رہی ہیں نا؟“

”ہاں، بہت پیاری۔“

”تھینک یو۔“ وہ بالکل بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھیں۔ پھر وہ نادرہ سے بولیں۔

”نادو! آپ مونا کا ہاتھ دیکھ رہی تھیں، ہاتھ دیکھنا آتا ہے آپ کو لکیروں کا پتا ہے؟“

”جی“ نادرہ کو شرارت سو جھی۔ ”مجھے پامسٹری سے کافی دلچسپی ہے، میں نے کیرو،

ایم اے ملکہ، نیاز فتح پوری وغیرہ کو بہت پڑھا ہے۔“

”اچھا“ ان کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔ پھر وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے

بولیں۔ ”بھلا یہ کس چیز کی لکیر ہے۔“

”یہ دل کی۔۔۔ یہ زندگی۔۔۔۔۔۔“ اسے اتفاق سے لکیروں کی کچھ شدید تھی۔ پھر اس

نے فوراً موضوع بدل دیا اور بولی۔ ”مس حبیب! یہ راکھی ڈانس کر لے؟ بہت اچھا

ڈانس کرتی ہے۔ پچھلے سال گولڈن نائٹ پہ۔۔۔“

”ہاں ہاں کر لے۔“ انہوں نے فراخ دلی سے اجازت دے دی۔

راکھی کا نام تو رخسانہ تھا لیکن سب اسے راکھی کہتے تھے لڑکیوں نے برتن سمیٹ

کر میز پر باہر نکال دیں راکھی دوپٹہ باندھ کر درمیان میں آگئی۔ کرن نے ڈیک لگا دیا۔

”میں ناگن تو سپیرا۔“

راکھی نے رقص کیا۔ نادرہ دم بخود سی دیکھا کی۔ اس کا بل کھانا، اس کا اٹھنا، بازو

پھیلا نا، جھکنا۔ سب کچھ ہی دم بخود کر دینے والا تھا۔ نئی لڑکیاں دم بخود سی بیٹھی تھیں۔

پرانی لڑکیاں تالیاں بجا بجا کر داد دے رہی تھیں۔

راکھی کے بعد نیانے بنگالی لڑکیوں کی طرح ساری کو تھوڑا اونچا باندھ کر رقص کیا تھا۔

”تمہارے آنے سے پہلے نیاس کالج کی بیوٹی کونین تھی۔“ سکینڈ ایئر کی طالبہ نے

اسے بتایا تو وہ چونک کر نیاس کو دیکھنے لگی۔

بلاشبہ وہ بہت خوبصورت تھی۔

”وہ اب بھی بیوٹی کونین ہے۔“

”نہیں بھئی لوگ کہتے ہیں اس کالج کی بیوٹی کونین اب نادر مومن ہے۔“

”ویسے ہی۔“ وہ جھینپ گئی۔

نیاس کا رقص ختم ہوا تو لڑکیوں نے زور زور سے تالیاں بجا بجا کر اسے داد دی اور

راکھی کو دوبارہ رقص کے لئے کہا۔

”نہیں بھی اب ختم کرتے ہیں، بے چاری پڑھا کو لڑکیاں پانی پی کر ہمیں کوس

رہی ہوگی۔“ نادرہ کو سب کا خیال رہتا تھا۔

”ہاں مسز نواز کی طرف بھی شور جارہا ہوگا۔“ مس حبیب نے بھی تائید کی۔ پھر

بڑی دیر سے جو سوال ان کے دل میں ہلچل مچا رہا تھا، بالآخر لبوں تک آہی گیا۔ ”تم نے

انہیں بلایا نہیں؟“

”ارے نہیں مس حبیب! ہم بھلا انہیں کیوں بلاتے۔“ کرن نے آنکھیں پٹپٹائیں

اور مسکے لگایا۔ ”ہمیں تو بس آپ ہی اچھی لگتی ہیں۔“

”مگر وہ برانہ مان جائیں۔“ انہوں نے بظاہر سنجیدگی سے کہا لیکن اندر ہی اندر وہ

بے حد خوش ہو رہی تھیں کہ چلو اچھا ہے۔ صبح انہیں خوب نمک مرچ لگا کر اس پارٹی کا

حال بتاؤں گی تو کتنا جلیں گی کہ میں لڑکیوں میں اتنی مقبول ہوں کہ وہ مجھے اپنے کمروں

میں بلاتی ہیں۔

”انہیں پتا تھوڑا ہی چلے گا۔“ کرن بھی شاید ان کی دلی کیفیت سمجھ رہی تھی۔

”اور اگر چل بھی جائے تو کیا ہے جس کو جس کا دل چاہے بلائے۔ اب کوئی زبردستی والی بات تو نہیں ہے۔“ کرن باقاعدہ ان کی ہاں میں ہلا مل رہی تھی۔ ”وہیے بھی یہ وقت تو ان کی عبادت کا ہے۔“

”عبادت۔۔۔“ مس حبیب نے قہقہہ لگایا۔ ”صرف نمائش، اگر اللہ میاں سے اتنی ہی دوستی تھی تو پھر میاں کو نہ مرنے دیتیں۔ اگر بیٹا پسند سے شادی نہ کرتا اور بہو تو انہیں ایک آنکھ نظر دیکھ بھی نہیں سکتی۔ یہ جو ہر جمعرات کو بیٹے کے گھر جانے کا بہانہ کرتی ہیں تا تو بیٹے کے گھر نہیں جاتیں۔ ایک سیہلی کے گھر جاتی ہیں، بلال گنج میں اور بیٹا رہتا ہے گلبرگ میں۔“

نادرہ ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دھیان سے ان کی بات سن رہی تھی اور اس کے اندر نامعلوم سی اداسی گھلنے لگی تھی۔ پتا نہیں کیوں مسز نواز کا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔

”آخر اس میں اداسی کی کیا بات ہے۔ اس نے سر جھٹک کر مس حبیب کی طرف دیکھا۔“

لڑکیاں سب چلی گئی تھیں اور مس حبیب بڑے خلوص سے کرن سے کہہ رہی تھیں۔

”بھئی، جب ٹی وی دیکھتا ہو تو میرے کمرے میں آ جایا کرو۔ بلا تکلف، اکیلی ہوتی ہوں میں بلیک میں کیا مزہ کل، تنہائیاں کی قسط آرہی ہے نا کلرپہ دیکھنا۔“

وہ تینوں بہت تھک گئی تھیں۔ سب کے جاتے ہی بغیر کوئی تبصرہ کئے بستر پر لیٹ گئیں۔ لیکن نادرہ بہت دیر تک جاگتی رہی۔

وہ یہاں خوش تھیں۔

مطمئن تھی۔

پھر بھی اس خوشی، اس اطمینان پر جیسے کوئی دبیز دھند چھائی ہوئی تھی۔ شاید وہ اتنی خوش اتنی مطمئن نہیں تھی جتنی کرن سمیر اور دوسری لڑکیاں رہتی ہیں اور وہ زندگی کو اتنا انجوائے نہیں کرتی جتنا باقی سب کرتے ہیں۔

”کیوں۔۔۔ کیوں نہیں۔“ وہ اکثر اپنے آپ سے پوچھتی تھی۔ مگر اس کیوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

شاید اس لئے کہ وہ پایا اور ماما سے دور ہے اتنے عرصے سے اگر وہ ان کے پاس ہوتی یا وہ اس کے پاس ہوتے تو پھر ایسا نہ ہوتا شاید اس کی خوشیوں پر دھند کی چادر نہ ہوتی اور جس طرح دھند لاہٹ جانے کے بعد چیزیں صاف اور واضح ہو جاتی ہیں اسی طرح اس کی خوشیاں بھی ہوتیں۔

صاف، روشن اور واضح۔

آج کرن اور سمیرا نے مل کر جو ہنگامہ پیا کیا تھا، صرف اس کے لئے۔ وہ خوش تھی لیکن اس خوشی پر اداسی کا غبار چھایا ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں، شاید وہ مس حبیب کے لئے اداس ہو رہی تھی جو اتنا چیخ چیخ کر بولتی تھیں۔ لیکن اندر سے کسی بچے کی طرح معصوم تھیں یا پھر مسز نواز کے لئے جن کا بیٹا ان سے تعلق توڑے ہوئے تھا اور وہ اپنا بھرم رکھنے کے لئے ہر جمعرات کو اس کے گھر جانے کا بہانہ کرتی تھیں۔ لیکن کیا پتا مس حبیب جھوٹ بول رہی ہوں۔ وہ تو یوں بھی ہر لمحہ مسز نواز کو نیچا دکھانے کے لئے کوشاں رہتی ہیں اور شاید اس طرح غلط بیانی کر کے وہ اپنے دل کو سکون پہنچا رہی ہوں۔۔۔ پتا نہیں، حقیقت کیا ہے۔

اور میں ابھی اتنی چھوٹی ہوں کہ کسی بھی بات کا صحیح ادراک نہیں کر پاتی ہوں۔

شاید میں اتنی باشعور نہیں ہوں۔

اور کرن کتنی جلدی بات کی تہ تک پہنچ جاتی ہے۔

حالانکہ وہ میری ہم عمر ہی ہے۔

اور میں تو اپنی اداسی کی وجہ سے بھی نہیں سمجھ پاتی ہوں۔ آنسو اس کی پلکوں کی نوک سے ٹوٹ کر تنکے میں جذب ہونے لگے اور وہ یونہی بے آواز رونے لگی۔ بلاوجہ، بے جواز۔

اس بات سے نا آشنا کہ وہ کیوں رورہی ہے۔ وہ روتی رہی اور یونہی روتے روتے سو گئی۔ صبح چھوٹی تھی اس لئے وہ دیر تک سوتی رہی۔ اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ نو بجے کے قریب کرن نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ ”اب اٹھو بھی بابا!“

”کیا ہے، سونے دو۔“ اس نے آنکھیں موندے موندے کہا۔

”میری بلا سے، تم چاہے سارا دن سوتی رہتیں، لیکن صبح سے اب تک کوئی سات بندے تمہیں بلانے آچکے ہیں۔“

”کون بندے؟“ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

”مس حبیب کے فرستادہ۔“

”مس حبیب۔“

”جی مس حبیب تمہیں یاد فرما رہی ہیں۔ غالباً رات پارٹی میں تمہارا رخ روشن.....“

”فضول بکواس بند کر دو کرن۔“ وہ پریشان ہو گئی۔ ”خیریت تو ہے نا۔ انہوں نے مجھے کیوں بلایا ہے۔“

”ارے جاؤ بھئی، تمہاری یاد آرہی ہو گی۔ چیز ہی ایسی ہو تم۔“

کرن مذاق کے موڈ میں تھی۔ اس لئے وہ خاموشی سے باتھ روم میں گھس گئی اور جلدی منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی تیز تیز برش کرتے ہوئے اس نے کرن سے التجا کی۔

”کرن، تم بھی چلو نا میرے ساتھ۔“

”نہیں یار، میں تو نہانے جا رہی ہوں اور تمہیں پتا ہے، آج کے دن باقاعدہ پہرا دینا پڑتا ہے، گرم پانی ختم ہو گیا تو پھر ٹھنڈے پانی سے نہایا نہیں جائے گا مجھ سے۔ سمیرا نہا رہی ہے۔ اور رافعہ کو باتھ روم کے باہر بیٹھا کر آئی ہوں کہ جوں ہی وہ باہر نکلے باتھ روم پر قبضہ کر لے۔“

نادرہ کے ہونٹوں پر بے اختیار ہنسی آگئی۔

”ویسے تم جاؤ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ ڈرنے والی کوئی بات نہیں کیونکہ وہ بے چاری صبح ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہی تھیں، چائے غالباً انہوں نے اب تک آپ کی خاطر نہیں پی ہو گی۔ لہذا آثار بتاتے ہیں کہ قطعی دوستانہ ماحول میں وہ آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہیں۔ البتہ میں آپ کی تسلی کو سمیرا کو آپ کی خبر لینے بھیجوں گی!“

نادرہ نے اس کی اس طرز گفتگو پر زچ ہو کر اسے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔



آج ہوٹل میں بہت رونق تھی۔ ہر کمرے سے گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچھ لڑکیاں نہا رہی تھیں، کچھ تیاری کر رہی تھیں۔ کچھ اپنے کپڑے دھو کر دھوپ میں پھیلا رہی تھیں۔ چھٹی کے دن یونہی رونق ہو ا کرتی تھی۔ وہ سر جھکائے تیزی سے نکل گئی۔

مس حبیب نے بڑی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔ ”آؤ آؤ ندیا، آج بہت سوئیں۔ کمزور بھی بہت ہونا۔“

”آپ نے مجھے بلایا تھا میڈم؟“

”بیٹھو نا۔۔ چلو چائے تو بناؤ۔ میں نے ابھی تک تمہارے انتظار میں چائے نہیں پی۔“

اس نے چائے دانی اپنی طرف کھسکائی اور بے اختیار اُمڈ آنے والی مسکراہٹ کو سر جھکا کر چھپا لیا۔

”کرن کجنت آدھی نجوی تھی۔ کیسے صحیح صحیح اندازے لگاتی تھی۔ ایک وہ تھی کہ کبھی کسی کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کر سکتی تھی۔ مثلاً جیسے آنٹی تھیں جنہیں ہمیشہ اس نے سخت دل اور بے حس سمجھا تھا۔

مس حبیب تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں اور پھر اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے۔

”تم کہہ رہی تھیں، تمہیں پامسٹری سے بہت دلچسپی ہے۔ ذرا ہاتھ دیکھ کر بتاؤ۔“  
”کیا میڈم! کیا بتاؤں؟“ وہ گھبرا گئی۔

”یہی کچھ قسمت کا حال۔“

ذرا سا جھوٹ بول کر وہ بری طرح پھنس گئی تھی۔ اس نے مس حبیب کا ہاتھ تمام لپا۔  
”میڈم آپ کی قسمت اچھی ہے۔ بالکل صاف اور سیدھی لکیر ہے کہیں کوئی نشیب و فراز نہیں۔ آپ کا دل بہت نرم ہے اور۔۔۔“ وہ یونہی ان کا ہاتھ پکڑے بولتی رہی۔ مس حبیب نے اچانک اسے ٹوک دیا۔

”یہ سب باتیں تو مجھے بھی پتا ہیں کہ میرا کردار کیسا ہے۔ تم کچھ اور بتاؤ نا۔“  
”کیا میڈم، آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟“ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کے بے تاثر اور کرخت چہرے پر ایک نرم سا تاثر ابھرا۔ ایک ایسا تاثر جس میں نرمی بھی تھی اور کچھ جھجک سی بھی۔

”شادی۔۔۔ میرا مطلب ہے شادی کی لکیر ہے۔“

”شادی کی لکیر!“ وہ اپنی حیرت کو چھپانے لگی لیکن مس حبیب نے کچھ محسوس نہ کیا، وہ جانے کس دنیا میں تھیں۔

”ہاں، ہاں بتاؤ نا۔“ ان کے لہجے میں کم عمر لڑکیوں والا اشتیاق تھا۔

”یا اللہ اب وہ انہیں کیا بتائے، حیرت کے شدید دھچکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے

ان کے ہاتھ کو پلٹا، تب ہی کرن نے اندر جھانکا۔

”میڈم پلیز سے آئی کم ان!“

”لیں۔“

”اتنی دیر سے ندیا نہیں آئی تو مجھے تشویش ہونے لگی تھی کہ کہیں خدا نخواستہ

میڈم کی طبیعت نہ خراب ہو۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا میڈم؟“

”ہاں، ہاں ٹھیک ہوں بیٹھو۔“ انہوں نے اپنے پاس کھسک کر اس کے لئے جگہ بنا دی۔ وہ اس سے کافی خوش تھیں۔

”ہاتھ دکھایا جا رہا ہے میڈم۔“ اس کی نظریں لمحوں میں سب کچھ تاڑ لیتی تھیں۔

”ہاں بھئی، بتاؤ نا ندیا۔“ مس حبیب پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”جی، جی میڈم! یہ لکیریں ہیں تو سہی شادی کی مگر۔۔۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر کرن کی طرف دیکھا جو اپنی گول گول آنکھیں چمک رہی تھی۔ اور پھر مس حبیب کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”میرا علم اتنا کچھ زیادہ نہیں ہے، بعض اوقات کسی کے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہوتی بھی ہے مگر اس کی شادی نہیں ہوتی۔“

”ارے نہیں، میڈم کے ہاتھ میں یہ لکیر شادی کی ہے۔“ کرن نے فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔ ”اور یہ جو باقی لکیریں ہیں نایہ سب بلند گی کی ہوتی ہیں۔ لگتا ہے کسی نے میڈم کو بہت پسند کیا تھا، اس حد تک کہ پرپوزل وغیرہ تک بھجوا یا ہو شاید کیوں میڈم۔؟“ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”ہاں۔“ مس حبیب کی آنکھوں میں اداسی گھل گئی۔

نادرہ کے اندر دھواں سا اٹھنے لگا۔ گہرا میٹلا دھواں۔

”میڈم آپ پر تو بہت لوگ مرتے ہوں گے جی، اب بھی آپ کی شخصیت میں

بڑا حسن ہے، دلکشی ہے۔“

نادرہ نے غور کیا، مس حبیب کی آنکھوں کی اداسی میں رنگ سے کھل رہے تھے۔  
”ہاں بہت لوگوں نے خواہش کی بہت نے چاہا۔“

”تو پھر میڈم آپ نے شادی کیوں نہیں کی۔ خواہ مخواہ ان کی دل توڑ دیا۔

”کرن!“ نادرہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تنبیہ کی۔ اسکا دل مس حبیب کے لئے پگھل رہا تھا اور کرن پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ ان کے جذبات سے کھیل رہی تھی لیکن کرن نے اس کی طرف سے نظریں ہٹالیں۔ جیسے وہ نادرہ کی بات سمجھ ہی نہ رہی ہو۔

”وہ آپ کو یاد تو کرتے ہوں گے۔ میڈم آپ نے بڑا ظلم کیا ہے ان پر۔“

مس حبیب چپ تھیں جیسے کچھ سوچ رہی ہوں، ان کا ہاتھ ابھی تک کرن کے ہاتھ میں تھا۔

”ویسے مس یہ جو شادی کی لکیر ہے نا۔“ اس نے چھوٹی انگلی کے نیچے والی لکیر پر انگلی رکھی۔ ”یہ اگر اس کے اوپر یہ چھوٹا سا کراس نہ ہو تانا تو پھر اسی سال آپ کی شادی یقینی تھی لیکن یہ کراس، ساری گڑبڑ تو اس کراس نے کر دی ہے۔ لیکن لکیریں بدلتی رہتی ہیں۔ ویسے تو اب بھی آپ کی شخصیت میں اتنی ڈگنٹی ہے، وہ شخص بڑا خوش نصیب ہو گا۔“

نادرہ کو کرن کا یہ مذاق بالکل پسند نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے داب کر میز پر پڑی مس حبیب کی تصویر اٹھالی۔ اس تصویر میں وہ گاؤں پہنچے ڈگری لے رہی تھیں۔

”میڈم، آپ کی یہ تصویر بہت اچھی ہے۔“ اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔  
”ہاں، یہ یونیورسٹی کی ہے۔ ٹھہرو میں اپنی کالج لائف کی اور یونیورسٹی کی دوسری تصویریں دکھاتی ہوں۔“ انہوں نے دراز میں سے اہم نکالی اور تصویریں دکھانے لگیں۔

نادرہ بے دلی سے بیٹھی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا اٹھ کر بھاگ جائے۔ یہ ایم اے پاس مس حبیب جن کی عمر کم از کم ۲۵ سال تو ہو گی، اس وقت بالکل کم عمر لڑکیوں کے سے انداز میں باتیں کر رہی تھیں۔ اور یہ بے بسی کا جانے کون سا موڑ تھا۔

خدایا! یہ میں کیا جان رہی ہوں اور جاننا، جان لینا کتنا بڑا عذاب ہے۔ ایک بار سنی ماموں نے جانے کس بات پر کہا تھا۔

”گڑیا! آگہی بہت کرب دیتی ہے، لاعلمی اچھی بات ہے۔“

اور تب وہ سنی ماموں کی بات نہیں سمجھی تھی لیکن آج اسے پتا چلا تھا کہ واقعی جان لینا عذاب ہے۔ وہ ہولے ہولے حقیقتوں سے آشنا ہو رہی تھی اور یہ آشنائی تکلیف دہ تھی۔ دل چیر دینے والی۔

کرن ابھی تک ایک تصویر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہی تھی اور مس حبیب خوشی ہو رہی تھیں۔

”میڈم! آپ نے شادی کیوں نہیں کی، کوئی وجہ تو ہو گی نا۔؟“

”کوئی خاص وجہ نہیں۔“ انہوں نے اہم بند کر دی۔ ”یہ تو میرے والدین کا شعبہ تھا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا ہو گا۔“

”کیا مطلب! شادی کو مناسب نہیں سمجھا۔“ کرن نے استفسار کیا۔

”نہیں بھئی، وہ پروپوزل جو میرے لئے آئے۔“

”اچھی میڈم!“ نادرہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

کرن نے اس کی بیزاری محسوس کر لی تھی۔ سو وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

”میڈم، شام کو آئیں گے، ٹی وی بھی دیکھ لیں گے کیونکہ وہاں ہال میں تو اس قدر

ہنگامہ ہوتا ہے کہ ایک لفظ سمجھ نہیں آتا۔“

”ہاں ہاں، ضرور آنا، میں تو بہت تنہائی محسوس کرتی ہوں۔ وہاں کوئین میری میں

مجھے اپنے ماموں کا بیٹا بہت پسند ہے جبکہ میری اماں کا خیال ہے کہ اس کی چاروں خالائیں اس پر دانت لگائے بیٹھی ہیں، کہیں کوئی پھانس ہی نہ لے۔ سو میں اس کو اس کو چھری سے ہی مٹانہ ڈالوں۔“

”بچہ! کرن آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔“ تو فکر نہ کر، تیری لکیریں ابھی پختہ نہیں ہوئیں۔ بدلتی رہیں گی۔ اپنی اماں کو لکھ، لڑکے کو اچھی طرح اپنی گرفت میں رکھیں اور آج شام کو اگر تو بانو بازار کی چاٹ کھلا دے تو پھر تیرے لئے چلہ کاٹیں گے۔ کر اس کا مطلب بدل جائے گا۔“

”مذاق نہیں کرن! صبح بتاؤ، کر اس کا کیا مطلب ہے؟“

”مجھے کیا خبر۔ بلکہ میرے فرشتوں کو بھی نہیں پتا۔ وہ تو بے چاری مس حبیب اتنی آس و امید سے مجھے دیکھ رہی تھیں تو میں نے سوچا کہ چلو، بابا! انہیں خوش کر دیں کہ مستقبل قریب میں شادی کا امکان ہے لیکن پھر اس خوف سے کہیں انہیں شادی مرگ نہ ہو جائے۔ میں نے یہ کر اس والا شوشہ چھوڑ دیا۔ لہذا اب امید و ناامیدی کی درمیانی کیفیت میں ہارٹ فیلیر کا کوئی خطرہ نہیں۔“

”کرن تم سے خدا سمجھے۔“ سمیرا انہیں دی تو کرن نے رخ موڑ کر نادرہ کو دیکھا۔

”اے تم کتابوں میں گھسی کیا کر رہی ہو؟“

نادرہ خاموش رہی تو کرن اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی اور نرمی سے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ اس کی پلکیں غم ہو رہی تھیں۔

”تم رو رہی ہو ندیا! کرن نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“

”نہیں کچھ تو ہے؟“

”وہ بی جان یاد آ رہی ہیں۔“

تو لڑکیاں آتی رہتی تھیں۔ اکثر گفٹ وغیرہ بھی یاد کرتی تھیں۔“

”یہاں کی لڑکیاں ایک دم کنجوس ہیں، گفٹ وغیرہ دینے کا تو انہیں پتا بھی نہیں ہے۔ نالائق ہیں نرمی۔“ کرن باہر نکلتے ہوئے بڑبڑائی۔

”مگر نادرہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا وہ بے حد چپ تھی۔ کمرے میں آتے ہی کرن نے نعرہ لگایا۔

”اے سمیرا، ایک بمبائٹک نیوز، جو اپنی مس حبیب ہیں نا، بہت جلد ان کی شادی ہونے والی ہے۔۔۔“

”ارے نہیں۔“ سمیرا کے ہاتھ سے برش گر پڑا۔

”ریٹلی۔ ابھی ابھی میں نے ان کا ہاتھ دیکھ کر پیش گوئی کی ہے لیکن ایک پر اہلم ہے ان کی شادی کی لکیر پر ایک کر اس ہے اس لئے یہ شادی شاید پیپڈنگ میں پڑ جائے۔“

”کرن!۔۔۔“ نادرہ نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔۔۔ ”اس طرح کسی کی بے بسی کا مذاق نہیں اڑاتے۔ کیا خبر کبھی قسمت ہمیں بھی اس موڑے پر لے آئے۔“

”تو تمہارا کیا خیال ہے، پینتالیس سال کی عمر میں ہم طوطے سے فال نکھو لیا کریں گے کہ میاں طوطے بتاؤ، ہماری شادی ہوگی یا نہیں۔ اللہ اللہ کریں گے بھی اور دوسروں کی شادیاں کروا گے خوش ہوں گے نہ کہ مس حبیب کی طرح۔۔۔۔۔“

”کرن پلزی!“ وہ روہانسی ہو گئی اور کرن کی طرف سے رخ موڑ کر اپنی الماری میں کتابوں کی ترتیب درست کرنے لگی۔ کرن دھڑام سے بیڈ پر گر کر ہنسنے لگی۔

”چچی سمو! بڑا مزہ آئے گا۔ اب مس حبیب صبح و شام اپنے ہاتھ کی لکیریں دیکھا کریں گی کہ کر اس ختم ہوا یا نہیں۔“

”چچی کرن! شادی کی لکیر پر کر اس کا یہ مطلب ہوتا ہے۔ میرے ہاتھ پر بھی کر اس ہے، کہیں میری شادی بھی تو پیپڈنگ میں نہیں پڑ جائے گی، تمہیں معلوم ہے۔“



”یہ بی جان بے وقت کیوں یاد آگئی ہیں؟“

”یاد آنا اور یاد کرنا اپنے اختیار میں تو نہیں ہوتا۔“

”ادھر دیکھو مندی، میری طرف، تمہیں اس وقت بی جان نہیں یاد آرہی ہیں تم مس حبیب کے لئے رو رہی ہو۔ یہ کانچ سادل لے کر کیسے جیوگی ندیا۔ اسٹیج پر اتنی دھواں دھار تقریریں کرتی ہو اور دل چڑیا جتنا ہے۔ اور یہ تم دوسروں کے لئے روتی رہو گی نا تو تمہارے آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو جائے گا۔ کچھ آنسو اپنے لئے بھی بچا کر رکھ لو۔ کیا خبر کبھی ضرورت پڑ جائے۔“

”خدا نہ کرے کرن! تم یونہی سوچے سمجھے بغیر بولتی رہتی ہو۔“

”سوری! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ کرن نے اسے پیار کر لیا۔

لیکن وہ یونہی کرن کے کندھے پر سر رکھے ہوئے ہوئے سسکتی رہی۔

وہ انارکلی کا چکر لگا کر لدی پھندی ہو شل گیٹ میں داخل ہوئیں تو بابا شفیق نے بتایا۔

”ندیابی بی کے وزیر آئے ہیں۔“

”شیر دل ہو گا۔“ سمیرا نے اندازہ لگایا۔

”یار، تیرا یہ کزن مجھے بہت پسند ہے۔ کسی دن سفارش کر دے گا۔“ کرن کا لہجہ

شوخی ہو گیا۔

”جس لڑکے کی کزن ندیا جیسی ہو۔ وہ تمہارے ایسی بلیوں کو گھاس نہیں ڈالا

کرتے۔“ سمیرا نے اسے ٹھوکا دیا۔ ”چل اب۔“

”لیکن ندیا کو شیر دل سے دلچسپی نہیں ہے۔ ہے نا ندیا؟“ اس کے ہاتھ سے شاہنگ

بیگ لیتے ہوئے کرن نے پوچھا۔

”میں پھوپھو کے سامنے تمہارا نام تجویز کر دوں گی، جب شیر دل کی شادی کی بات

چلی، ابھی تو وہ پڑھ رہا ہے۔“

”وعدہ! کرن نے دانت نکالے۔“

”ہاں، وعدہ۔“ اس نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور ہنستی ہوئی ان کی طرف بڑھ گئی۔

اماتاس کے درخت سے ٹیک لگائے مبشر حسن کھڑے تھے۔

”آپ!“ وہ چند قدم پر ٹھٹھک کر رک گئی۔

”میں ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا آپ کی خبر لیتا چلوں۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سگریٹ نیچے پھینک کر جوتے سے مسل دیا۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

”جی ٹھیک ہوں۔“ اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ اور مبشر حسن کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

”ہوشل میں کھانا وغیرہ تو اچھا مانتا ہے؟“

”جی۔“ اس نے مسلسل اسے اپنی طرف دیکھتے پکڑے چینی سے پہلو بدلا۔

”یہ میرے کارڈز ہیں، رکھ لیں۔ گھر کا اور آفس کا دونوں ایڈریس جب کبھی ضرورت پڑے کوئی پراہلم ہو تو بلا جھک آجائیے۔“

”جی بہتر مگر.....“

”مگر کیا؟“ اس نے بھویں اچکائیں۔ ”بی بی۔ میں پہلے ہی سنی سے بہت شرمندہ ہوں اپنی کوتاہی پر کہ آپ کی خبر گیری نہ کر سکا۔“

”میں کوئی چھوٹی بچی تو نہیں ہوں کہ آپ میری خبر گیری کرتے۔“

”اچھا آپ بچی نہیں۔“ اس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ وہ جل کر رہ گئی۔

”بہر حال اگر کبھی ہوشل کے کھانے سے جی ادب جائے تو میرے آفس فون کر

دیتے گا، میں اپنے کک سے کہہ کر آپ کی پسند کے کھانے بنوا دوں گا۔ آپ اپنی دونوں

روم میٹ کے ساتھ آجائیے گا۔“

”اور آپ کی مسز۔۔“ وہ کہنا نہیں چاہتی تھی لیکن منہ سے نکل گیا۔ مگر اس نے جملہ مکمل نہیں کیا۔

”میری مسز!“ ناگواری سے اس کی پیشانی پر لکیریں سی پڑ گئیں۔ ”اب میری کوئی مسز نہیں ہیں اگر ہوتیں بھی تو آپ کو کاٹ نہ کھاتیں۔ اوکے۔ بائے۔“

وہ اس کے حملے پر غور کرتی رہ گئی اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا گیٹ سے باہر نکل گیا۔ وہ وہیں المٹاس کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کے ارد گرد ابھی تک اس کی خوشبو موجود تھی۔ اس شخص کی شخصیت میں کتنا سحر ہے۔ اور۔ اور یہ کیا کہہ رہا تھا کہ مسز نہیں ہیں۔ کیا جھگڑا ہو گیا۔ ناراضگی یا علیحدگی۔

”اوہ نہیں۔“

اُسے افسوس سا ہوا۔ اور اس کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ خوبصورت، دلکش لیکن اپنی دلکشی میں بھی ایک کڑھکی لے۔

”اے شیردل چلا گیا۔“ کرن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑی۔

”شیردل نہیں تھا۔“

”تو کیا سنی ماموں تھے؟“

”نہیں مبشر حسن تھے۔“

”کیا کہتے تھے؟“ کرن نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”خیریت دریافت کرنے آئے تھے۔“

”لگتا ہے سنی ماموں نے سیدھا کر دیا ہے۔ کیا اکیلے تھے یا وہ ان کی کلف لگی نصف

بہتر بھی ان کے ساتھ تھیں۔“

”اکیلے تھے۔“

”چلو ذرا مس حبیب کی خیر خبر لے آئیں۔“

”نہیں کرن، میں بہت تھک گئی ہوں، اپنے کمرے میں چلو۔“

اور وہ کرن کے ساتھ چلتے ہوئے اسی کے متعلق سوچتی رہی۔

فرسٹ ایئر کے پر موشن ٹیسٹ ہو گئے تھے۔ اور نادرہ اپنے آپ کو بہت فریش محسوس کر رہی تھی۔ وہ کرسی کی پشت پر سر رکھے ہوئے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ کرن کپڑے استری کر رہی تھی۔

”سنو ندیا! آج خوب گھومیں گے۔ مینار پاکستان۔۔ گلشن اقبال۔ ریس کورس۔۔۔۔۔“

”بس بس زیادہ خواب نہ دیکھو۔“ سمیرا نے اسے ٹوک دیا۔ ”مینار پاکستان تک

ٹھیک ہے۔ اس سے آگے داخلہ بند۔۔ واپسی پر بہت دیر ہو جائے گی اور ہوٹل کا بند گیٹ آپ کی ساری تفریح کا مزہ کر کر کر دے گا۔“

”کوئی بات نہیں یار، آج کل مس حبیب سے گاڑھی چھنتی ہے۔ پتا ہے کل صبح کیا کہہ رہی تھیں مجھ سے؟“

”کل صبح تم ان کے پاس گئی تھیں۔ یہ بات غلط ہے بھئی۔ اب تم چوری چوری ان سے ملاقات کرنے لگی ہو۔“

”نہیں بھئی، وہ آمنہ وغیرہ پکڑی گئی تھی نا جعلی پاس بنا کر باہر چلی گئی تھیں، تو ذرا ان کی سفارش کے لئے گئی تھی۔ ورنہ مس حبیب تو یہ لے لے لیٹر بھجوا رہی تھیں ان کے گھر۔ وہ سب چلی گئیں تو مس مجھ سے کہنے لگیں۔“

”تمہیں اپنے بوائے فرینڈ سے ملنا ہے تو جاؤ بھئی۔ میں منع نہیں کرتی۔ ضرور بناؤ بوائے فرینڈز، ملوان سے، اگر چانس مل رہا ہے تو اسے ضائع مت کرو۔ کل کو پچھتاؤ گی۔ لیکن مجھے بتا کر جاؤ۔ مجھے پتا تو چلے کہ بھئی لڑکی اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے گئی ہے۔“

”یہ۔۔ یہ کہا مس حبیب نے؟“ نادرہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”ہاں بھئی بلکہ انہوں نے تو مجھے پورے خلوص سے مشورہ دیا ہے کہ مجھے اگر اس

طرح کا چانس ملے تو اسے بالکل ضائع نہ کروں۔“

کرن نے اپنی بائیں آنکھ کا کونا دبایا ”اور ایک تم ہو اتنی ظالم کہ شیر دل سے میری سفارش نہیں کرتیں۔ اب مس حبیب سے ہی کہوں گی کہ کوئی اچھا سا بوائے فرینڈ.....“

”لعنت بھیجو بوائے فرینڈ پر اور مس حبیب سے جا کر پاس بنو لاؤ۔ تاکہ گھومیں پھریں۔ اس طرح کچھ تو امتحانوں کی تھکن اترے گی۔“ سمیرا نے اسے ٹوک دیا تو وہ ہنستی ہوئی باہر چلی گئی۔

وہ تینوں کالج گیٹ کے باہر وینگن کے انتظار میں کھڑی تھیں کہ سلور کلر کی مزدا بالکل ان کے قریب آکھڑی ہوئی۔

بشر حسن نے باہر جھانکا۔ ”ہیلو لیڈیز!“

”السلام علیکم سر!“ سمیرا نے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

”فائن۔“ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور نادراہ کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے بولا ”آپ کیسی ہیں؟“

”اچھی ہوں۔“ نادراہ کی آواز میں ملکی سی کپکپاہٹ تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کی موجودگی سے اسے گھبراہٹ سی ہونے لگتی تھی۔ اس روز کے بعد وہ آج نظر آیا تھا۔

”مجھے آپ کے فون کا انتظار ہی رہا۔“

”بس ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ اس کے دیئے ہوئے کارڈ اب بھی اس کے بیگ میں پڑے تھے۔

”آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟“

”یو نہی گھومنے نکلے تھے۔ لیکن لگتا ہے، آج سواری نہیں ملے گی۔“

”چلیں کہاں جانا ہے۔ میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔“

”نہیں نہیں شکریہ۔“ نادراہ نے فوراً کہا۔

”بھئی میں فارغ ہوں۔ یونہی اتفاقاً ادھر آ نکلا تھا۔ اور بے مقصد چکر لگا رہا تھا۔“

آج آپ کے ساتھ آؤنگ ہو جائے گی تو میرا وقت بھی اچھا گزر جائے گا۔“

”تو ٹھیک ہے پھر چلے۔“ کرن فوراً اپنا پروگرام اسے بتانے لگی۔

نادراہ نہیں جانا چاہتی تھی لیکن کرن تو فوراً ہی دروازہ کھول کر بیٹھ چکی تھی۔ مجبوراً اسے بھی بیٹھنا پڑا۔

آکس کریم کھاتے ہوئے کرن کو اچانک اس کی بیوی کا خیال آ گیا۔

”سر، آپ اکیلے کیوں گھوم رہے تھے، وہ آپ کی سز کیا میکے چلی گئی ہیں؟“

”جی، میری سز ہمیشہ کے لئے میکے چلی گئی ہیں۔“

”مگر کیوں؟“ کرن نے بے حد حیرت سے پوچھا۔ ”آپ تو بے ٹھیک ٹھاک

بندے لگتے ہیں۔ کیا شکایت تھی انہیں آپ سے؟“

”معلوم نہیں۔“ اب وہ نارمل ہو گیا تھا۔ نادراہ بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”در اصل ہماری شادی ہی غلط ہوئی تھی اور اسے واپس تو جانا ہی تھا۔ کیونکہ اس کا

فیصلہ غلط تھا۔“ اس نے مختصر آبتایا اور بڑی خوبصورت سے موضوع بدل ڈالا۔

نادراہ کا دل اس کے لئے اداس ہو گیا وہ کس قدر تنہا اور اکیلا لگ رہا تھا۔ وہ زیادہ تر

خاموش ہی رہی تھی۔ البتہ سمیرا اور کرن خوب باتیں کرتی رہی تھیں اور انہوں نے

بہت انجوائے بھی کیا تھا۔ انہیں ہوٹل کے گیٹ پر اتارتے ہوئے بشر حسن نے ایک

گہری نظر اس پر ڈالی۔

”آپ اتنی خاموش کیوں رہتی ہیں، آپ کی عمر کی لڑکیاں ایسی تو نہیں ہوتیں،

اتنی سنجیدہ اور خاموش۔ اپنی پر اہلم؟“

”نوسر!“ اس کی آواز جانے کیوں بھرا گئی۔ ”نو پر اہلم۔“

”پھر؟ اس کی سوالیہ نظریں لمحہ بھر اس کے چہرے کا جائزہ لیتی رہیں۔“

”یونہی، میں ایسی ہی ہوں، شروع ہے ہی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”خوش رہا کریں بی بی، اس عمر میں اتنی سنجیدگی اچھی بات نہیں۔“ وہ اسے نصیحت کرتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اور وہ بہت دیر تک وہاں ہی کھڑی سوچتی رہی کہ پتا نہیں کیوں اس کے اندر کی اداسی نہیں جاتی۔ جبکہ اسے کوئی پرابلم نہیں، کوئی جواز نہیں اس کے پاس، یوں بے وجہ اداس ہونے کا۔

خدا جانے وہ کیا سوچتی ہے۔

کاش! کبھی وہ خود پر، اپنے آپ پر کھل جائے۔ اسے پتا چل جائے کہ یہ بے نام اداسی، یہ بے وجہ ملال کیوں ہے۔

”بندہ اچھا ہے لیکن اتنا بھی اچھا نہیں کہ آپ گیٹ سے ہی چپک جائیں اور یہ بھول جائیں کہ مس حبیب اندر ٹہل رہی ہیں اور اتنی دیر سے واپس آنے پر باز پرس بھی ہو سکتی ہے۔“

”فضول باتیں نہ کیا کرو کرن!“ اس نے بیزاری سے کہا۔

”بڑی دیر کر دی جی!“ شفیق بابا نے ان کا نوٹس لیا۔

”ہاں بابا آج اتنے دنوں بعد تو نکلے تھے، دیر ہو گئی سیر کرتے کرتے۔“ سیرانے بابا کو بتایا۔

مس حبیب شاید اپنے کمرے میں تھیں اور کھانے کی بیل ہو رہی تھی۔ لیکن مبشر حسن نے اتنا کچھ کھلا پلا دیا تھا کہ تینوں کو بھوک نہ تھی۔ کرن نے بستر پر گرتے ہوئے فل آواز میں ٹیپ لگا دیا۔

”اے کھانے کے لئے نہیں جانا کیا؟“ رافعہ نے اندر جھانکا۔

”نہیں یار! ہم لوگ باہر کھا آئے تھے۔“ کرن نے زور زور سے ناٹکیں ہلاتے

ہوئے کہا۔

”مس حبیب تمہیں پوچھ رہی تھیں۔ میں نے بتا دیا تھا کہ کمرے میں ہیں۔“ رافعہ نے دروازہ بند کر دیا تو کرن زور زور سے بولنے لگی۔

”جل تو جلال تو۔ سوائٹ آف کر دو۔ ابھی آکر کان کھائیں گی، کچی بالکل موڈ نہیں ہے ان کی باتیں سننے کا۔“

”صبح کے لئے مجھے اپنا یونیفارم استری کرنا ہے، کپڑے بدلنے ہیں۔“

”صبح کر لینا۔“ وہ منمنائی۔

تب ہی مس حبیب نے دروازہ کھولا۔ تو کرن فٹ سے لیٹ کر سوتی بن گئی۔

”آگئے آپ لوگ؟“

”یس میڈم آجائیں۔“ نادارہ نے بستر پر ان کے لئے جگہ بنائی۔

”کہاں کہاں گئے تھے؟“ وہ نادارہ کے پاس بیٹھ گئیں۔

”بس یونہی گھومتے پھرے۔“

”میرا دل آج بہت گھبرا ہوا تھا، دو تین دفعہ تمہارا پتا کیا۔ کبھی کبھی بڑا دل گھبراتا

ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کمرے کی چاروں دیواریں اپنی جگہ سے کھسک رہی ہیں اور ابھی

کچھ دیر میں مجھے پیس ڈالیں گی۔ جیسے۔۔ جیسے میں ان میں دب جاؤں گی کل رات میرا

دل چاہا تھا چیخ چیخ کر رونے لگوں۔ بہت ڈر لگا، بہت خوف آیا۔“

نادرہ نے ان کا ہاتھ تھام کر ہولے سے دبایا اور بولی ”آپ ادھر آجائیں میڈم

ہمارے کمرے میں۔“

”تم لوگ گھر جا رہی ہونا چھٹیوں میں۔“

”کل چھٹیاں ہو جائیں گی اور ہم لوگ پرسوں چلے جائیں گے۔ آپ جائیں گی؟“

”میں!“ وہ خاموشی سے اپنی انگلیاں مروڑتی رہیں۔ کہاں جاؤں گی؟“ کچھ دیر کے

بعد انہوں نے کہا۔ ”کون میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ بھائی اور بھابی کو میری پروا ہی نہیں،

”یا اللہ خیر۔“ نادرہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

کرن بھی ایک دم اٹھ بیٹھی۔ اس نے درخواست شفیق بابا سے جھپٹ لی۔  
”شیر دل آیا ہے لینے تمہیں۔ تمہاری آنٹی بہت بیمار ہیں۔“ اس نے درخواست  
مس حبیب کی طرف بڑھائی۔ ”میڈم آپ سائن کر دیں۔ اور ہم ذرا پتا کر آئیں کیا  
بات ہے۔“

وہ نادرہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”سنی ماموں کا فون آیا ہے کچھ دیر پہلے۔ انہوں نے کہا ہے کہ تمہیں لے کر فوراً  
پہنچوں۔ آنٹی کی طبیعت خراب ہے۔“

”مگر انہیں کیا ہوا ہے شیر ی؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلنے لگے۔  
”پتا نہیں۔۔۔“

مس حبیب بھی ان کے پیچھے آگئی تھیں۔

”کیا نام ہے لڑکے تمہارا؟“ ان کی تیز کراخت آواز نادرہ کے کانوں میں گونجی۔  
”شیر دل!“

”کیا رشتہ ہے؟“

”کزن ہوں۔“

”کزن!“ وہ عجب طرح سے ہنسیں۔ ”بھئی، میں اس وقت تمہیں اس کے ساتھ  
جانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔“

”میڈم پلیز، میری آنٹی بیمار ہیں۔ خدا جانے کیا ہو۔ ماموں مجھے کبھی اس طرح نہ  
بلائے، یقیناً کوئی بہت سیریس بات ہے، پلیز مجھے جانے دیں۔ یقین کریں، یہ میری  
پھوپھی کا بیٹا ہے۔“

”نہیں بھئی۔“ مس حبیب کے لہجے میں وہی سختی تھی۔ وہ چند لمحے پہلے کی مس

بن اپنے گھر میں مست ہے۔ جاؤں بھی تو اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ مجھ  
سے میرا دکھ پوچھے۔ بس اپنے بچوں کے پر اہلم۔ سنی کو بخار ہے۔ مانی کا برتھ ڈے ہے،  
نزی کمزور ہو گئی ہے۔۔۔“

”میڈم آپ کی امی اور ابو؟“

”میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ والدہ چھوٹی بھائی کے پاس کراچی میں ہوتی ہیں  
اور یہاں بڑے بھائی ہیں اور بہن ہیں۔“



آج مس حبیب بہت دل گرفتہ ہو رہی تھیں۔ بہت اپ سیٹ تھیں۔ کرن سوئی  
بن گئی تھی ورنہ اپنی مزیدار باتوں سے ان کا دل بہلا لیتی۔ اس کی آنکھوں میں بھی نیند  
بھری تھی۔ سمیرا بھی اونگھ رہی تھی اور مس حبیب باتیں کرنے کے موڈ میں تھیں۔  
جبکہ امتحانوں کی وجہ سے وہ کتنے دنوں سے جاگ رہی تھیں اور آج سونا چاہتی تھیں۔  
”پتا ہے ندیا! میری بھابی مجھ سے ہمیشہ ایک ہی بات کہتی ہے ثرو! تم بھی شادی  
کر لیتیں بھئی اب۔۔۔ کیا میں خود شادی کرتی۔ اور میری بھابی۔۔۔۔۔“

دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون ہے؟“

”شفیق بابا ہوں جی، چھوٹی وارڈن ہیں؟“

”ہاں۔“

”کیا بات ہے؟“ مس حبیب نے پوچھا۔

”جی یہ روم نمبر ۳۶ کی نادرہ بی بی کی درخواست آئی ہے، چھٹی لینے کے لئے

آئے ہیں۔“

”کون؟“

حبیب تو لگ ہی نہیں رہی تھیں۔ کرن نے جانے کیا کہا کہ وہ چیخ چیخ کر بولتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ نادرہ رونے لگی۔

”نندو! تم حوصلہ کرو، میں مسز نواز سے بات کرتی ہوں۔ شیر دل ایک اور درخواست لکھ دو۔“ کرن نے شیر دل سے کہا اور درخواست لے کر مسز نواز کی طرف چلی گئی، مگر وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔

اس نے کتنے ہی چکر لگا ڈالے تھے۔

”جانے کتنی لمبی نماز پڑھتی ہیں۔“ کرن بڑبڑائی۔

اچانک نادرہ کو مبشر کا خیال آگیا۔

”شیری! تم اس نمبر پر ڈرافٹ کر کے انہیں بلاؤ۔“ اس نے ان کا کارڈ نکال کر

اسے دیا۔

کچھ ہی دیر بعد مبشر موجود تھے۔

کرن مسز نواز سے بحث کر رہی تھی کہ وہ آگئے اور پھر خدا جانے انہوں نے کیا کہا، یوں بھی وہ گارجین تھے اس کے اور مسز نواز نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

وہ تینوں اسے گیٹ تک چھوڑنے آئیں۔ وہ بے حد زرد ہو رہی تھی۔ کرن نے اسے حوصلہ دیا تو وہ رو پڑی۔

”دعا کرنا۔“ اس نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اور شیر دل کی طرف دیکھا جو ابھی باہر کھڑا تھا۔

”تم نہیں چل رہے؟“

”اُس کے پیپر زہور نہ ہیں۔ میں نے خود ہی منع کیا ہے۔ ایک پیپر مس ہو جائے گا۔“ مبشر بولے۔

”مگر۔“ وہ گھبرا گئی۔

”پلیز، آپ گھبراہٹیں نہیں اعتماد کریں مجھ پر۔“

”میں ابھی سنی ماموں کو فون کر دیتا ہوں کہ تم مبشر بھائی کے ساتھ آرہی ہو۔“

”اچھا۔“

”اگر تم کہتی ہو تو میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔“ شیر دل نے شاید اس کی گھبراہٹ محسوس کر لی تھی۔

”نہیں شیری، تمہارا پیپر مس ہو جائے گا۔“

تمام راستہ خاموشی سے ہی کٹا۔ وہ آنکھیں موندے آنٹی کی زندگی کی دعائیں مانگتی رہی اور مبشر حسن خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہے۔

آنٹی کو شدید ایک ہوا تھا ڈاکٹر اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ وہ سنی ماموں کے گلے لگ کر بہت روئی اور آنٹی کے زرد ہاتھ کو ہاتھوں میں لئے بہت دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ مبشر حسن دوسرے دن چلے گئے تھے اور وہ صبح سے شام تک اسپتال ہی میں رہتی۔ آنٹی ہولے ہولے سنبھل رہی تھیں لیکن ابھی اسپتال ہی میں تھیں ان چند دنوں میں اس کی آنٹی سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ بالکل بی جان کی طرح۔ وہ ان سے باتیں کرتی رہتی۔ ہوٹل کی ٹیچر زکی، مس حبیب کی اور ان کے چہرے پر بڑی مہربان سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔

”آنٹی! آنٹی! آپ بہت اچھی ہیں۔ آئی لو یو آئی۔“

ان کے بال بناتے ہوئے اس نے ایک روزان کے رخساروں کو چوم لیا تو انہوں نے بے اختیار اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اور اس کے رخساروں پر اور اس کی آنکھوں پر بے تحاشا پیار کرنے لگیں۔

”میری بیٹی! میری چاند! میری گڑیا!“ آنسو ان کے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔ ”اے تو میرے پاس تھی میری گڑیا! میری بیٹی اور میں تیرے ہوتے ہوئے بھی اکیلی

رہی۔ تنہا ہی۔ کتنی پاگل تھی۔ میں۔ بس تو مجھے اپنی ماں ہی سمجھ، تو میری بیٹی ہے نہ تو میری جان، میری زندگی!“

”آپ سب کچھ ہیں میری ماں، دوست، بہن۔“ اس نے اپنی بائیں ان کے گلے میں ڈال دیں۔

آنٹی کے چہرے کی سختی نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اسپتال سے گھر آنے پر وہ چند روز ہی گھر پر رہی۔ چشٹیاں ختم ہو گئی تھیں اور رزلٹ آ گیا تھا۔ کرن نے لکھا تھا کہ اس نے چاروں سیکشنز میں ٹاپ کیا ہے۔ آنٹی نے اس کی اتنی شاندار کامیابی کی خوشی میں ایک چھوٹی سی پارٹی ترتیب دے ڈالی تھی۔ رات کو تھک کر جب وہ بستر پر لیٹی تو اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ بے نام سی اداسی کا غبار جو بی جان کی موت کے بعد ہر وقت اس کے دل پر چھایا رہتا تھا، خود بخود آپوں آپ ہی دھل گیا ہے۔ تب بے حد مطمئن ہو کر بڑی طمانیت کے ساتھ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کے اندر سکون سا پھیلتا چلا گیا۔

اماتاس کے تنے سے ٹیک لگائے لگائے اس نے چاروں اور دیکھا کتنی گہری خاموشی اور سناٹا تھا۔ عجیب سی ویرانی اور تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ زیادہ تر لڑکیاں اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔ چند ایک جو دور دراز سے آئی تھیں، وہ اپنے کمروں میں تھیں شاید ایک دو روز میں وہ بھی چلی جائیں گی۔ ایک ہفتے کی یہ چشٹیاں اچانک ہی ہوئی تھیں گورنمنٹ کالج کا کوئی لڑکا قتل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے کالجوں میں ہنگامے ہو رہے تھے۔

پرنسپل مسز مرشد نے ان کا کالج بھی ایک ہفتے کے لئے بند کر دیا تھا۔ پتا نہیں والدین نے اس لڑکے کے لئے کتنے خواب دیکھے ہوں گے اور کتنی آرزوئیں دل میں رکھی ہوں گی۔ مگر وہ سارے خواب اور ساری آرزوئیں یونہی تشنہ چھوڑ کر چلا گیا۔ پتا نہیں، کتنے لوگ یونہی اپنے والدین کے خوابوں کو بیچ راہ میں ادھورا چھوڑ کر مر جاتے ہوں گے اور اب نہ جانے اور کتنے.....

اس نے اماتاس کے تنے سے ٹیک لگائے لگائے سوچا۔

”جانے اس کی ماں بہنو نے اس کی موت کی خبر کیسے سنی ہوگی۔ شاید ان کے دل پھٹ گئے ہوں گے۔ ان کا سینہ فگار ہو گیا ہوگا۔ اور اس کا باپ اپنے خوابوں کے ٹوٹنے اور اپنی تمناؤں کے پورا نہ ہونے پر کس طرح اسے پکارتا ہوگا۔“

سب لڑکیاں خوش خوش گھر جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں لیکن وہ بہت اداس تھی۔ رہ رہ کر اسے اس لڑکے کا خیال آ رہا تھا۔ جو دو جماعتوں کے جھگڑے میں مارا گیا تھا۔ ”تم نے سنی ماموں کو فون کر دیا؟“ کرن نے جلدی جلدی بیگ میں کپڑے ٹھونسے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے جھوٹ بولا تھا۔

اس کا کہیں جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا وہ یہ چشٹیاں ہوسٹل میں ہی رہ کر گزارے گی مگر وہی دن میں اس کا دل گھبرا گیا تھا۔ مسز نواز اپنے بیٹے کے پاس چل گئی تھیں۔ صرف مس حبیب تھیں۔ وہ تھی اور چند لڑکیاں..... اور یہ چند لڑکیاں بھی شاید کل تک چلی جائیں گی۔

کرن اور سمیرا نے کتنی منتیں کی تھیں کہ اس بار وہ ان کے ساتھ چلے۔ لیکن اس نے نال دیا۔

”نہیں سمو! اسلام آباد ہی جاؤں گی۔ سنی ماموں وہاں اتنے اداس ہوتے ہیں۔ آنٹی کے بعد انہوں نے اپنی پروا کرنا بالکل چھوڑ دی ہے۔“

لیکن وہ نہیں گئی تھی۔ اسلام آباد جانے کے تصور سے ہی اس کا دل گھبرانے لگتا تھا۔ وہاں اس اتنے بڑے گھر میں اس کا دم گھٹتا تھا۔ چاروں طرف سے آنٹی کی آوازیں آتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آنٹی ابھی کسی طرف سے نکل آئیں گی اور اس کے رخساروں اور اس کی پیشانی کو بے تحاشا چومنے لگی گی۔

”میری گڑیا، میری بیٹی!“

محبتیں شاید اس کا نصیب نہیں تھیں۔ وہ کتنی خوش، خوش ہو سٹل واپس آئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ اب کے چٹھیاں جو اسلام آباد میں گزریں گی تو کتنا مزہ آیا کرے گا۔ وہ آنٹی سے ڈھیروں باتیں کیا کرے گی۔ ان کے ساتھ مل کر کام کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی بے معنی اور بے قصور باتیں۔ بچپن سے ہی اس کا دل چاہتا تھا کہ کوئی ہو جو اس کی بے معنی اور فضول باتوں کو بہت دھیان سے سنے اور آنٹی نے ہاسٹل سے آنے کے بعد کس طرح شوق اور اشتیاق سے اس کی باتیں سنی تھیں۔

لا یعنی اور فضول باتیں۔

بے کار اوٹ پٹانگ خواب۔

آنٹی نے اس کے کسی خواب کا مذاق نہیں اڑایا تھا وہ کہتی۔

”آنٹی! میں اپنی تعلیم ختم کروں تو پھر دنیا گھومیں گے۔ سائیکل پر۔ آپ بھی

میرے ساتھ چلنا۔“

”اچھا چلیں گے۔“ وہ مسکرا دیتیں۔

اور.....

اس نے سوچا تھا۔ وہ آنٹی سے اچھے اچھے کام کرنا سیکھے گی۔ آنٹی کے ہاتھ میں کتنی نفاست تھی۔ وہ کتنے خوبصورت پھول کاڑھتی تھیں۔ کیسی خوبصورت چیزیں بناتی تھیں۔ ہو سٹل میں رہنے کی وجہ سے اسے سوائے چائے بنانے کے کچھ نہیں آتا تھا اس نے سوچا تھا، وہ آنٹی سے ہر طرح کے کھانے پکانے سیکھے گی اور جب کبھی چھینوں میں ماما اور پاپا آئیں گے تو وہ اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے کھانے کھلا کر انہیں حیران کر دے گی۔

مگر اس کے سارے خواب بے تعبیر رہ گئے تھے۔

واپس آنے کے صرف چند ہفتوں بعد آنٹی نے دنیا سے نانا توڑ لیا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا ہفتوں۔ مہینوں وہ ادا اس رہی تھی۔ وہی نامعلوم اداسی کا غبار اس کے اندر پھیلتا رہتا اور کبھی کبھی یہ غبار اتنا گہرا ہو جاتا کہ اس کی آنکھوں کے آگے دھند سی چھا جاتی۔ گہری دبیز دھند تب اس کا دل چاہتا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے اور کوئی اسے منع نہ کرے، چپ نہ کرائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی ورنہ ہو سٹل میں کہانیاں بن جاتیں۔ لڑکیاں اسے مریض سمجھتیں۔ ترس اور ہمدردی سے دیکھتیں۔

زندگی کے تین طویل برس یہاں گزر گئے تھے۔ اب وہ بی اے فائنل میں تھی۔ اس کی معصومیت میں ایک وقار سا پیدا ہو گیا تھا۔ بے تحاشا خوبصورت آنکھوں اور گھنے بالوں والی نادرہ مومن آج بھی کالج کی ہر دل عزیز طالبہ تھی۔ اسے بے تحاشا پسند کیا گیا تھا۔

ٹیچرز نے.....

لڑکیوں نے.....

اور کالج میں آنے والے مہمانوں نے۔

وہ بلاشبہ اپنے کالج کا مان تھی۔

لیکن پھر بھی وہ اندر سے خوش نہیں تھی، خوش نہیں ہو پاتی تھی۔ کوئی چیز۔

کوئی نامعلوم احساس جیسے اس کی خوشیوں کی راہ میں حائل ہو گیا تھا۔

اس کی الماری انعام کی کتابوں اور ٹرافیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ شاندار تھا۔

تین سالوں سے مسلسل وہ آل راؤنڈ بیسٹ اسٹوڈنٹ آف دی ایئر قرار دی جا رہی تھی۔ پھر بھی کوئی کانٹا سا اس کے اندر چھپا تھا جو نکلتا نہیں تھا۔ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ان تینوں سالوں میں دو بار ماما اور پاپا آئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح دعوتیں کھاتے کھاتے ان کی چٹھیاں گزر گئی تھیں۔ ممی بالکل ویسے ہی تھیں، یگ اور خوبصورت، پاپا



پہلے سے زیادہ گریس فل ہو گئے تھے کنپٹیوں پر تھوڑے تھوڑے سفید بال ان کی شخصیت کے حسن میں اضافہ کرنے لگے تھے۔

شیر دل تعلیم ختم کر کے جاب کرنے لگا تھا۔ وہ اب ہر ویک اینڈ پر اس کی خبر لینے آتا تھا۔ لیکن اب کبھی کبھی کوئی ذومعنی بات کہہ کر وہ اسے اپ سیٹ کر دیتا تھا۔ سمیرا نے ایک بار کہا تھا۔

”سنو ندیا! تمہارا یہ کزن شاید تم سے محبت کرنے لگا ہے۔“

”فضول۔“ اس نے بیزاری سے منہ بنالیا تھا۔ اسے اس طرح کی غیر سنجیدہ محبتیں پسند نہیں تھیں۔ اس کا محبت کا نظریہ بالکل مختلف تھا۔ یہ فلمی کہانیوں والی محبت اسے محض تفریح لگتی تھی ایک سستی تفریح۔ دوسری کئی تفریحات کے مقابلے میں نسبتاً کم خرچ۔

یہ بھی کوئی محبت ہوتی ہے، وہ بیزاری سے سوچتی۔ محبت میں تو ایک وقار ہونا چاہئے۔ ایک خاص حس اس نے سوچا تھا اگر زندگی میں اس نے کسی سے محبت کی تو وہ بڑی میچور محبت ہوگی۔ بہت مختلف، بہت باوقار۔ یہ کیا کہ محبت میں آدمی اپنی اپنی غیرت سب کا سودا کر دے فلموں میں ہیر دُن کے پیچھے پیچھے بھاگ کر گانے گاتا ہوا ہیر داسے زہر لگاتا تھا۔

سمیرا کی منگنی اپنے ماموں زاد سے ہو گئی تھی اور بی اے کے بعد اس کی شادی تھی۔ سنی ماموں آنٹی کے بعد بہت اداس بہت خاموش ہو گئے تھے۔ وہ بہت کم باتیں کرتے تھے نہ پہلے کی طرح گھومنے جانا نہ ہنسی نہ مذاق۔ بس آفس سے آکر کمرے میں گھس جاتے۔ وہ جتنے دن گھر رہتی، ان کی ضروریات کا خیال رکھتی تھی۔ سنی ماموں کے لئے اس کا دل بڑا دکھتا تھا ماما نے بہت چاہا تھا کہ وہ شادی کر لیں لیکن وہ نہ مانے تھے۔ حالانکہ ابھی وہ بالکل یگ تھے۔

مگر کچھ لوگ اپنی محبتوں میں بڑے پختہ ہوتے ہیں۔ سات سال ازدواجی زندگی میں انہوں نے شاید کبھی آنٹی سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی، کبھی اولاد نہ ہونے کا شکوہ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ کئی بار آنٹی نے انہیں دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتے تھے۔

مبشر حسن اکثر اب اسلام آباد جانے لگے تھے۔

جب بھی وہ چھٹیوں میں وہاں ہوتی، وہ ایک آدھ چکر ضرور لگاتے تھے۔ ان تین سالوں کی سات آٹھ ملاقاتوں میں وہ ان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جان سکی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ٹی وی پروڈیوسر کی جاب کرتا ہے اور اپنی ایک تھیٹر کمپنی بھی ہے جس سے کبھی کبھی سالوں بعد وہ کوئی ڈراما پروڈیوس کرتا ہے اور یہ کہ اپنی بیوی ہما کے جانے کے بعد وہ ابھی تک اکیلا ہے۔ سنی ماموں نے اسے بتایا تھا کہ ہما بڑی آئیڈیلٹک لڑکی تھی اس نے موبی کی محبت میں والدین اور بھائیوں کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر وہ بہت جلد اپنے فیصلے پر پچھتانے لگی تھی وہ ان سے چھڑ کر موبی کے ساتھ خوش نہ رہی سکی تھی۔ سو واپس چلی گئی۔ موبی نے تو بہت کوشش کی تھی کہ کوئی متبادل صورت نکل آئے۔ وہ اس کے بھائیوں کی منت کرنے کو بھی تیار تھا لیکن ہما کو ایک دم جانے کیا ہو گیا تھا اس نے طلاق لے لی۔

اسے دکھ ہوا تھا یہ سب جان کر اور اس کے دل میں خود بخود ہی مبشر حسن کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ کھڑے کھڑے وہ تھک گئی تھی تو وہیں تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی ہوٹل اور کالج کی اس شاندار عمارت میں کتنی کشش ہے۔ سرخ اینٹوں سے بنی یہ عمارت۔

لبے لبے اندھیرے کوریڈور۔

اونچی چھتوں والے کمرے۔ ان سب سے کتنی اپنائیت کا رشتہ ہو گیا ہے۔

یوں جیسے برسوں سے اسی چار دیواری میں رہ رہی ہوں۔ اور جب چند ماہ بعد یہ ہو سٹل، یہ کالج چھوٹ جائے گا تو کتنا یاد آئے گا سب..... یہ دیواریں، یہ دروازے۔ یہ اونچی چھتوں والے کمرے۔  
بابا شفیق۔  
مس حبیب۔

املاس کا یہ اتنا پراندار دخت جو اس وقت بھی پیلے پھولوں سے بھرا ہوا تھا اور ذرا سی ہوا سے ڈھیروں پھول اس کے آس پاس گر جاتے تھے۔ اسے یہاں اس درخت کے پاس بیٹھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ ان تین سالوں میں اس نے کتنی بہت سی شامیں یہاں اس درخت کے نیچے بیٹھ کر گزاری تھیں۔ یونہی لالینی باتیں سوچتے ہوئے۔  
”ہیلو!“

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ایک لمبا بڑا لڑکا اس کے قریب کھڑا تھا، گھبرا کر اس نے گیٹ کی طرف دیکھا بابا شفیق جانے کہاں گیا تھا وہ سیدھا اندر ہی چلا آیا تھا۔  
”آپ کو کس سے ملنا ہے؟“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔  
”مس نواز سے۔“

”مس نواز تو اپنے بیٹے کے گھر گئی ہوئی ہیں۔“  
”بیٹے کے گھر!“ لڑکے کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

”جی، ان کا بیٹا یہاں لاہور میں ہی رہتا ہے وہ ہر ویک اینڈ پر اس کے گھر چلی جاتی ہیں۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

وہ بہت مضطرب دکھائی دیتا تھا وہ بار بار دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتا پھر کھول دیتا اور اس کی طرف دیکھتا۔

”آپ مس حبیب سے مل لیں چھوٹی وارڈن سے۔“

”نہیں، مجھے مس نواز سے ملنا تھا اگر وہ آئیں تو انہیں بتا دیجئے گا کہ میں آیا تھا ان سے ملنے۔“

مگر آپ کا نام، میں ان سے کیا کہوں کہ کون آیا تھا۔

”میں ہی ان کا بیٹا ہوں اور وہ سات سال سے میرے گھر نہیں آئیں۔“ وہ ایک دم تیزی سے پلٹ گیا۔

”نہیں۔“ اس کے اندر چھنا کا سا ہوا۔

اس کی صحت یابی والی پارٹی میں مس حبیب نے کہا تھا۔ مس نواز بلال گنج جاتی ہیں۔ اپنی سہیلی کے پاس اور بیٹا تو گلبرگ میں رہتا ہے اور انہیں پوچھتا بھی نہیں۔

”اور کیسے کیسے کس کس طرح اپنا بھرم رکھنا پڑتا ہے، اس کے اندر سے جیسے کچھ پگھل پگھل کر باہر آنے لگا۔“ اور یہ شخص بیدردی سے ان کا بھرم توڑ گیا تھا۔ جسے نہ جانے کیسے اب تک انہوں نے بنا رکھا تھا۔

آدمی کبھی کبھی نہ جانے کیوں اپنے ارد گرد جھوٹ کر دیواریں کھڑی کر لیتا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر مس نواز اپنے گرد جھوٹ کی یہ دیوار کھڑی نہ کرتیں، بتا دیتیں کہ ان کا بیٹا ان کی بہو انہیں پوچھتے نہیں لوگ الٹا ان سے ہمدردی ہی کرتے۔

مگر نہیں فرق پڑتا ہے۔

آدمی کا کوئی نہ ہو۔

اس کا پوچھنے والا، اسے چاہنے والا تو آدمی بڑا بے وقعت ہو جاتا ہے۔ بڑا چھوٹا بڑا معمولی۔ اس کی گردن جھک جاتی ہے اور مس نواز جب ہر ویک اینڈ پر اپنے بیٹے کے گھر جارہی ہوتی تھیں تو ان کا سر اٹھا ہوا ہوتا تھا۔

مگر کیا ان کے اندر بھی یہ فخر ہوتا ہوگا۔

اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا۔ ابھی کل تک اسے مس نواز سے

کراہٹ سی آرہی تھی۔ جس طرح انہوں نے مس حبیب کے خلاف لڑکیوں سے پرنسپل کی طرف خط لکھوائے تھے۔ اس سے مسز نواز سے بہت بری لگنے لگی تھیں۔ مگر اب اسے ان پر رحم آرہا تھا ترس آرہا تھا۔ وہ اس طرح کی ساری حرکتیں اس لئے کر رہی تھیں کہ وہ ریٹائر نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ یہاں سے نکل کر کہاں جاتیں وہ۔ بیٹا انہیں پاس نہ رکھتا۔ وہ بے بھرم ہو جاتیں۔ وہ ٹوٹ جاتیں۔

دکھ بے حد گہرا دکھ اندر ہی اندر اس کے دل کو چھیلنے لگا۔ وہ ہولے ہولے سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ سیڑھیوں پر اسے مس حبیب ملیں۔ شاکنگ پنک بھڑکیلے لباس میں پرس جھلاتی وہ کہیں جا رہی تھیں۔

”تم گئیں نہیں ندیا!“

”نومینڈم میں نے سوچا یہاں رہ کر پڑھوں گی، آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

”ایک فرینڈ کے پاس۔ تم بھی گھوم آؤ کہیں، وہ تمہارا کزن بھی تو ہے، اسی کے ساتھ سیر تفریح کر آؤ۔“

”جی۔“ اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو حیرت سی اتر کر معدوم ہو گئی۔

”کوئی چانس ملتا ہے تو اسے مس مت کرو۔ میرے تجربوں سے فائدہ اٹھاؤ۔“

اس کا جی چاہا، وہ ان سے پوچھے کہ کیا وہ شوخ رنگ کے کپڑے پہن کر اور تیز گلابی لپ اسٹک لگا کر کسی چانس کی تلاش میں جا رہی ہیں۔ مگر وہ پلٹ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ یہ مسز حبیب بھی عجیب تھیں۔

رات کو دیواریں انہیں پیستی تھیں۔

کمرے کی چھت ان پر آگرتی تھی۔

اور صبح خوب چیخ چیخ کر وہ لڑکیوں کو ڈانٹتی پھرتیں۔ گیٹ کے پاس کھڑے دیکھتیں تو ایسی ایسی باتیں سناتیں کہ آدمی ڈوب کر مر جائے۔ کسی کو بہت ضروری شاپنگ کرنی

بھی ہوتی تو ہزار باتوں کے بعد پاس دیتیں۔

دس ہزار گھڑی گھڑائی کہانیاں ان کے پاس ریڈی میڈ تیار رہتی تھیں۔ ہو سٹل کی لڑکیاں ان کے خوف سے تھر تھر کانپتیں لیکن کبھی کبھی ان کا یہ طمع اتر جاتا اور پھر وہ انہیں بوائے فرینڈز بنانے کے مشورے دیتیں اور.....

اللہ یہ انسانی فطرت بھی کیا چیز ہے اور آدمی کی نفسیات کو سمجھنا کتنا مشکل اور شاید تنہائی اور اکیلا پن آدمی کو ایسا ہی بنا دیتا ہے۔ اتنا ہی پیچیدہ اور عجیب جتنی کہ مس حبیب ہیں لیکن شاید جب آدمی کو محبت نہ ملے۔ کوئی چاہنے والا۔

خوشیوں میں شریک ہونے والا۔

اور دکھوں کو شیر کرنے والا نہ ہو تو شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔

اور میں.....

کیا میں بھی مس حبیب کی طرح ہو جاؤں گی۔

میرے چاہنے والے، مجھ سے محبت کرنے والے کہاں ہیں۔ ماما پاپا نے بچپن سے ہی مجھے الگ کر دیا تھا۔

اپنی محبتوں سے اپنی چاہتوں سے دور۔

بی جان تھیں۔

جو چلی گئیں۔

پھر آنٹی نے ان کی جگہ لینی چاہی اور اب سنی ماموں تھے جو آنٹی کے بعد کھو گئے تھے۔ اپنے آپ میں گم ہو گئے تھے۔ وہ انہیں اپنا دوست سمجھتی تھی۔ مگر.....

شیر دل تھا۔ پھوپھو تھیں۔ ان کے دوسرے بچے تھے مگر ان سب کے باوجود شاید اسے وہ محبت کہیں نہیں ملی تھی جو اس کے اندر چھائے اداسی کے غبار کو دھو دیتی۔

”تو کیا کبھی مجھے بھی مس حبیب کی طرح محسوس ہو گا کہ دیواریں مجھے پیس رہی ہیں؟“ وہ خود سے پوچھنے لگی۔

”نہیں۔“ اس نے خود کو یقین دلایا۔ ”میری عمر ابھی اٹھارہ سال ہے اور میرے سامنے تو ایک عمر بڑی ہے اور کہیں کوئی تو ہو گا جو مجھے چاہے گا جس کے دل میں میرے لئے بے تحاشا محبتیں ہوں گی، ہاں محبت ایک بڑی خوبصورت چیز ہے روح میں اتر جانے والے کسی بہت ہی حسین جذبے کا نام۔“

اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اعتراف کیا اور اٹھارہ سالہ نادرہ مومن نے اس لمحے اپنے دل کے سارے دروازے، ساری کھڑکیاں کھول کر ہر دروازے، ہر کھڑکی، ہر روشندان پر انتظار کا دیا جلا کر رکھ دیا۔

کسی بہت ہی اچھے، بہت ہی پیارے شخص کا انتظار کرنے کیلئے۔

جس کی محبت اس کی عمر بھر کی تشنگی کو ختم کر دے۔ جس کی محبت میں ایک وقار ہو۔ ایک بہت ہی مختلف، بہت ہی میچور قسم کی محبت جس میں چھپھور اپن نہ ہو۔ جو گھٹیانہ ہو، تفریح نہ لگے۔ ایسی محبت جو آدمی کو خود اپنی نظروں میں بلند کر دے اور نچا کر دے۔

اور چند لمحے پہلے کی ادا سی یکایک آپوں آپ ختم ہو گئی۔ اس نے اونچی آواز میں ٹیپ لگا دی اور اپنی کتابیں درست کرنے لگی۔ بہت دیر تک وہ گانے سنتی رہی اور اپنے نوٹس ترتیب دیتی رہی۔ چائے پینے بھی وہ نہیں گئی۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر لائٹ جلا دی۔ تب ہی بابا شفیق نے دروازے پر دستک دی۔

”آپ کے مہمان جی۔“ اس نے چٹ آگے بڑھائی۔

نادرہ مومن روم نمبر بتیس، مبشر حسن!

اس نے دھڑکتے دل سے چٹ تھام لی، پتا نہیں کیوں اس شخص کے سامنے وہ گھبرا جاتی تھی۔ عجیب سی بے چینی اور بے کلی محسوس ہوتی تھی اسے۔ دھڑکتے دل کو

سنہالے وہ نیچے اتری۔ گیٹ کے پاس تھری پیس سوٹ میں بہت شاندار لگ رہا تھا۔ ”ہیلو کیسی ہیں آپ؟“ اس کا لہجہ گھمبیر اور ٹھہرا ٹھہرا سا تھا۔

”جی ٹھیک ہوں۔“

”ادھر سے گزر رہا تھا سوچا آپ کی خیریت کی خبر لیتا جاؤں۔“ اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

نادرہ کی پٹلیں جھک گئیں۔ لمحہ بھر مبشر حسن کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی رہیں پھر اس نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔

”آپ کی وہ منکر نکیر کہاں ہیں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”وہ گھر گئی ہیں۔ کالج بند ہے نا۔“ وہ بھی مسکرا دی۔

”آپ نہیں گئیں؟“ اس کی نگاہوں نے پھر اسے اپنے خصار میں لے لیا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”بس یوں ہی دل نہیں چاہا۔“

”دل کیوں نہیں چاہا؟“

”ضروری نہیں کہ ہر بات کا کوئی جواز ہو سر! بعض اوقات یونہی بغیر کسی جواز کے بھی کچھ کرنے کو دل چاہتا ہے۔“ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہا تھا۔

”آل رایت میڈم! اگر آپ کا دل چاہے تو اس وقت ڈرائیور پر چلیں۔ ذرا آؤنگ ہو جائے گی، میرے خیال میں اس وقت تقریباً ہوٹل خالی ہے۔“

”ہاں۔“ اس نے مڑ کر دیکھا، صرف چند کمروں میں لائٹیں جل رہی تھیں۔

”مگر اس وقت میڈم بھی نہیں ہیں۔“

وہ ہچکچاہٹ تھی لیکن اس کی بات سننے بغیر اس نے بابا شفیق کو بلایا۔

”ان کو کچھ ضروری شاپنگ کروانی ہے۔ لے کر جا رہا ہوں۔“

”پاس ہے۔“ بابا نے فرض نبھایا۔

”ہاں..... کمرے میں ہے۔“ پاس تو صبح ہی اس نے لے لیا تھا کہ کیا پتہ دل نہ لگے اور وہ اسلام آباد یا پھوپھو کے پاس چلی جائے۔

”رہنے دو بابا ابھی تو آ جاؤں گا۔“

”آپ گھر نہیں جائیں گی؟“ شفیق بابا نے پوچھا۔

”نہیں صبح جائیں گی۔ اس وقت شاپنگ کریں گی کچھ۔“ اس نے مڑ کر نادرہ کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ”چلیں۔“

وہ سحر زدہ سی اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئی۔ وہ آنا نہیں چاہتی تھی لیکن انکار بھی نہ کر سکی۔

”ادھر آ جائیں پلیز!“ اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ وہ لمحہ بھر یونہی کھڑی رہی۔

”پلیز۔“ اس نے دوبارہ کہا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

پتا نہیں، وہ کون سی خوشبو لگا تا تھا جو اسے مسحور کئے دے رہی تھی، پھر اس کا دھیمہ دھیمہ ٹھہر ٹھہر الجھ، وہ مسحور سی بیٹھی رہی اور وہ یونہی باتیں کرتا رہا۔ اس کی اسٹڈی کے بارے میں اس کی غیر نصیابی سرگرمیوں کے بارے میں۔

”اخبار سے اکثر آپ کی کامیابیوں کا پتا چلتا رہتا ہے۔“

”اچھا۔“ اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی کہ وہ اخبار میں کالج فنکشنز کے بارے میں

چھپنے والی رپورٹ بھی پڑھتا ہے۔

”آپ میں بہت ٹیلنٹ ہے۔“

”شکریہ سر۔“

”کیا ارادے ہیں بی اے کے بعد؟“

”پتا نہیں، ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ سنی ماموں سے پوچھوں گی۔“

”کیوں آپ کی اپنی کوئی رائے نہیں؟“ اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے رکھے اس نے ذرا سارخ موڑ کر اسے دیکھا۔

”جی۔“ وہ اس کے اس طرح دیکھنے پر گھبرا گئی۔

”اب آپ بڑی ہو گئی ہیں، اپنے فیصلے خود کیا کریں۔“ وہ پھر سامنے دیکھنے لگا۔

ہاں، وہ بڑی ہو گئی تھی آج شام، آج شام ہی تو اس کے دل میں ایک بڑی انہونی سی خواہش نے جنم لیا تھا۔ چاہے جانے کی خواہش، محبت کی طلب نے۔

تھوڑی دیر وہ یونہی گھومتے رہے پھر یونہی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے کباب کھائے اور کوک پی۔ ہو سٹل کے گیٹ پر اتارتے ہوئے وہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔

”شکریہ اس کمپنی کا۔ میں آج بہت تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ آپ نے میری تنہائی کو شیر کیا تھینکس مچ۔“

پھر وہ تیزی سے گاڑی نکال لے گیا۔ وہ لمحہ بھر ششدر سی کھڑی رہی۔ پھر سر جھٹک کر گیٹ میں داخل ہو گئی۔

مسز نواز شاید ابھی کچھ دیر پہلے آئی تھیں اور بابا شفیق سے بات کر رہی تھیں۔ انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ پھر چلا کر بولیں۔ ”ادھر آؤ لڑکی!“

”جی۔“ وہ ان کے قریب چلی آئی۔

”یہ تم ہو ندیا۔“

یونین میں ہونے کی وجہ سے سب ہی اسے جانتے تھے اور لحاظ کرتے تھے۔ مسز نواز نے بھی اسے ڈانٹنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

”اتنی دیر تک باہر نہ رہا کرو۔“ انہوں نے تنبیہ کی۔

”بس میڈم! وہ ذرا دیر سے ہی گئی تھی کچھ کام تھا۔“

”اور یہ مس حبیب کب سے غائب ہیں، اچھی ذمے دار ہیں۔ بھائی میں نہیں تھی تو انہیں اس طرح ہوٹل میں چند لڑکیوں کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے تھا۔“

”شام کو ہی گئی تھیں میڈم وہ۔“

”اچھا بھئی، تم لوگ بھی چلے جایا کرو چھٹیوں میں گھر۔“ وہ آگے بڑھیں تو اچانک اسے یاد آیا۔

”میڈم وہ۔ وہ آئے تھے آپ کے بیٹے۔“

”کیا؟“ مسز نواز یکدم اس کی طرف پلٹیں۔

”جی، وہ آپ کے بیٹے۔ کہہ رہے تھے بتا دیا انہیں۔“

”مظہر..... مظہر آیا تھا؟“ انکی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

”نام تو نہیں بتایا تھا لیکن کہا تھا آپکا بیٹا ہوں۔“ وہ ایک قدم اٹھا کر ان کے قریب آگئی۔ گیٹ کے قریب جلتے والے بلب کی روشنی میں ان کا چہرہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ بار بار رنگ بدلتا۔ جگہ جگہ سے چٹختا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“

”جی، میں یہاں تھی، ادھر کھڑی ہوئی تو وہ اندر آگئے تھے۔ میں نے بتایا کہ آپ نہیں ہیں۔ بیٹے کے گھر گئی ہوئی ہیں۔“

انکا چہرہ یکدم سیاہ پڑ گیا اور آنکھیں جھلملانے لگیں لیکن فوراً ہی وہ مسکرا دیں۔

”ہاں..... ہاں مظہر ہی ہوگا۔ میں ذرا اپنی دوست کے گھر چلی گئی تھی نا۔ تو اس نے سمجھا ہوگا ہوٹل آگئی ہوں۔ بہت پیار کرتا ہے مجھ سے۔ جب جاتی ہوں آنے نہیں دیتا۔ کہتا ہے۔ بس مئی آپ میرے پاس رہیں اور چھوڑیں، یہ نوکری وغیرہ ملے گی کروں گھر میں دل گھبراتا ہے۔ عادت نہیں ہے اس طرح بیٹھنے کی۔“ ان کی آواز

بھرائی ہوئی تھی لیکن وہ بڑی ہنس ہنس کر بات کر رہی تھیں۔

’آپ کو کیا پتا میڈم! آپ کا یہ بہت اچھا بیٹا آپ کا بھرم توڑ گیا ہے جسے آپ اپنی دانست میں اب تک قائم رکھے ہوئے ہیں اس نے بڑی دل گر فگلی سے سوچا۔‘

”سنو۔“ چلتے چلتے اچانک انہوں نے پوچھا۔

”یہ مس حبیب تو نہیں تھیں ادھر، اس وقت جب مظہر آیا تھا۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ مس حبیب سے تو نہیں ملانا۔“

”نہیں میڈم!“

اور ان کے چہرے پر پھیلا اضطراب قدرے کم ہو گیا۔

”بھئی، تم لوگوں کو ڈر لگے نا تو جو چھ سات لڑکیاں ہونا ایک ہی کمرے میں سو

جانا۔“ اپنے کمرے کی طرف مڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”نو میڈم ڈر کیسا۔“ اس نے کہا اور اپنے کمرے میں آگئی۔

لحہ بھر کو تو کمرے کے سنائے سے اس کا دل خوف کھا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اونچی آواز میں ٹیپ لگا دی۔

رات کو دیر سے سوئی تھی اس لئے صبح دیر سے اٹھی۔ فاطمہ زبیری اس کا ناشتا کمرے میں رکھ گئی تھی۔ وہ تقریباً نو بجے تک سوئی رہی۔ نو بجے فاطمہ نے ہی اسے اٹھایا تھا۔

”تم ابھی تک سو رہی ہو اور تمہارے انگل تمہیں لینے بھی آگئے ہیں۔“

”سنی ماموں! اس نے بے حد حیرت سے سوچا۔ بھلا انہیں کیسے پتا چلا کہ میری چھٹیاں ہو گئی ہیں۔“

وہ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر نیچے کی طرف بھاگی لیکن وہاں مبشر حسن کو دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی۔

”آپ!“

”بی بی، میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ جائیں بیگ لے آئیں جلدی سے۔“  
”مگر میں آپ کے ساتھ کس طرح جاسکتی ہوں؟“ اس نے اٹک اٹک کر کہا۔  
”جیسے پہلے جاتی رہی ہیں۔“

”مگر آپ تو بیگ لانے کا کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں، وہ تو کہہ رہا ہوں۔“ وہ اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔

”کیا آپ اسلام آباد جا رہے ہیں سنی ماموں کے پاس؟“

”اگر آپ کہتی ہیں تو اسلام آباد بھی لے جاؤں گا مگر اس وقت آپ کو گھر سے لے

جا رہا ہوں۔“

”گھر۔“ اس نے نگاہیں اٹھائیں تو وہ بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”سوری سر! میں آپ کے گھر کس طرح جاسکتی ہوں۔ آپ وہاں اکیلے رہتے ہیں۔“

”ہاں، یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ میں اکیلا رہتا ہوں۔“ اس کے ہونٹوں پر

شریر سی مسکراہٹ تھی۔

”پھر۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ بیٹھیں کوک منگواؤں۔“ نادرہ نے کہا۔

”نہیں۔“ اس کے لب بھینچ گئے اور پیشانی پر لکیروں کا جال سا بن گیا۔ ”آپ

مجھے یہ قوف سمجھتی ہیں بی بی۔“

وہ حیران سی اسے دیکھنے لگی۔

”میں آپ کو اپنی والدہ کے گھر لے جا رہا ہوں۔ بہنیں ہیں وہاں میری، یہاں اکیلا

رہ کر کیا کریں گی۔ جائیں اپنا سامان لے آئیں۔ اس کے لہجے میں تحکم تھا۔ ایک بار تو

اس کا جی چاہا وہ انکار کر دے لیکن پھر خاموشی سے پلٹ گئی۔

وہ اسے والدہ کے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ وہاں اس گھر میں اسکی والدہ کے علاوہ اس کی دو بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی تھا۔ سب لوگ اس سے بڑی محبت سے ملے۔ اس کی والدہ تو سنی ماموں کو یاد کرتی رہیں۔ انہیں آنٹی کی بے وقت موت کا بہت دکھ تھا۔ وہاں اس کا وقت بہت اچھا گزرا لیکن مبشر حسن تو شاید اسے وہاں چھوڑ کر بھول ہی گئے تھے۔ وہ لاشعوری طور پر ان کا انتظار کرتی رہی تھی۔ چوتھے دن اس نے اپنا سامان سمیٹا۔

”میں اب جاؤں گی آنٹی، مدثر کو کہیں مجھے ہو سٹل چھوڑ آئے۔“

”ارے بیٹی، موبی آجاتا تو خود ہی لے جاتا تمہیں۔“

”نہیں آنٹی کل تو کالج کھل جائیں گے۔“

”عجیب بے پروا لڑکا ہے، پھر مڑ کر خبر ہی نہیں لی۔“ وہ خود ہی بڑبڑائیں۔ ”جب سے ہماگئی ہے اور بھی بے خبر ہو گیا ہے۔ ہزار بار کہا اب اکیلے ہو، ادھر ہی آ جاؤ، مگر نہیں مانتا، مانا ہماری مرضی شامل نہیں تھی اس کی شادی میں لیکن ہم نے منع بھی نہیں کیا۔ پر عقیدوں کا فرق بڑا فرق ہوتا ہے۔ خود ہی چھوڑ گئی۔ مگر اس نے روگ لگا لیا ہے خود کو..... وہاں اتنے بڑے گھر میں اکیلا رہتا ہے۔“

وہ آپ ہی آپ بولتی رہیں وہ چپ سر جھکائے سنتی رہی۔ تب ہی مدثر آ گیا۔

”آئیں باجی، میں رکشالے آیا ہوں۔“

اور وہ مدثر کے ساتھ واپس آ گئی۔ ایک دو روز تک اسے افسوس سا ہوتا رہا کہ وہ

پھر نہیں آیا تھا لیکن پھر وہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئی..... اور اس کا خیال اس کے

ذہن سے جاتا رہا لیکن وہ جو اس شام اس نے اپنے دل کے دروازوں پر انتظار کے دیئے

جلائے تھے وہ اسی آب و تاب سے جل رہے تھے۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹ کر

آنکھیں موندتی تو ایک دھندلی سی شبیہ اس کے تصور میں چلی آتی۔

پتا نہیں کون ہو گا وہ جو اس کے اندر کے خلا کو پر کرے گا اور جو اس کے دل پر

چھائے ادا سی کے اس نامعلوم غبار کو دھو دے گا۔ وہ آنکھیں موندے موندے سو جتی۔  
کوئی تو ہو گا۔ خلوص و صدق و وفا کا پیکر۔

جو۔

مجھے مژدہ جانفزا دے۔

کوئی تو ہو گا۔

ایک امید کا چراغ اس کی آنکھوں میں جلنے لگا تھا۔

”اے لڑکی!“ ایک روز کرن نے اس کی آنکھوں میں جلتے چراغوں کو دیکھ کر کہا۔

”تجھے کسی سے محبت تو نہیں ہو گئی؟“

”نہیں۔“ وہ ہنس دی۔ ”لیکن کرن میں محبت کرنا چاہتی ہوں۔“

”تو کر لو اجازت ہے۔“ اس نے فراخ دلی سے کہا۔ ”مگر کس سے، شیر دل سے؟“

”نہیں۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔ ”شیر دل نہیں۔“

”پھر کون؟“

”پتا نہیں۔ مگر وہ جو کوئی بھی ہو گا کرن، وہ عام لوگوں سے مختلف ہو گا۔ اس کی

محبت اس طرح چھپھوری محبت نہیں ہو گی، جس طرح فلموں اور کہانیوں میں ہوتا

ہے۔ بلکہ بڑی میچور محبت ہو گی۔ بہت مختلف۔ اس کی محبت میں ایک وقار ہو گا مگر اس

وقار کے باوجود وہ مجھے ٹوٹ کر چاہے گا۔ اتنا کہ دنیا میں کسی نے کسی کو نہ چاہا ہو گا اور میں

بھی۔ میں بھی اسے۔ ہمیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ ہم ایک دوسرے سے

محبت کرتے ہیں بلکہ.....“

”آنکھوں آنکھوں میں معاملات طے کئے جائیں گے۔“ کرن شرارت سے

آنکھیں گھما رہی تھی۔

”نفاق نہیں کرن، میں سنجیدہ ہوں۔“

”ریٹلی ندو! تم سنجیدہ ہو۔“

”ہاں۔“

کرن لمحہ بھر اسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ”ندیا! کبھی کبھی تمہاری باتیں مجھے ڈرا

دیتی ہیں۔ تم اتنی مختلف مت بنو کہ کہیں ایڈ جسٹ ہی نہ ہو پاؤ۔“

”کیوں کیا میں تمہارے ساتھ ایڈ جسٹ نہیں ہو پائی؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، میں اپنی بات نہیں کر رہی ندو! دنیا کی بات کر رہی ہوں۔ شیر دل اچھا لڑکا

ہے۔ وہ خوبصورت.....“

”نہیں کرن! پتا نہیں کیوں۔ میں نے شیر دل کے لئے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ یوں

بھی وہ تو تم.....“

”میں..... میں تو یونہی مذاق کرتی ہوں۔“ کرن نے گھبرا کر اس کی بات کاٹی۔

”ادھر میری طرف دیکھ کر بات کرو کرن!“

”کیا؟“ کرن نے نظریں جھکائی ہوئی تھیں۔

”کیا تمہیں شیر دل اچھا نہیں لگتا؟“

”بھئی، وہ اچھا ہے تو اچھا ہی لگے گا نا۔“ کرن نے کہا لیکن اس کے رخسار شفق

رنگ ہو رہے تھے۔

”کرن! میں شیر دل سے اتنی بے تکلف تو نہیں ہوں لیکن پھر بھی اس سے بات

کر دو گی کہ کسی دن اور پھوپھو سے بھی کہوں گی۔ مجھے پتا ہے تم اس سے محبت کرنے

لگی ہو۔“

”محبت۔۔۔ پتا نہیں ندیا۔ لیکن اکثر میں نے سوچا ہے کہ زندگی کے سفر میں اگر وہ

میرا مسافر بن جائے تو زندگی بڑی سہل ہو جائے گی بہت خوبصورت اور حسین۔“

”آئی۔ وش۔ یو۔ ٹو گڈ لک۔“ نادرہ نے پورے خلوص سے اسے دعا دی اور سوچا



کہ وہ شیر دل سے کرن کی بات ضرور کرے گی۔

مگر اس روز کے بعد شیر دل آیا ہی نہیں۔ اس روز بھی وہ شیر دل کے خیال سے نیچے چلی آئی تھی، وزینگ ڈے تھا۔ لڑکیاں ادھر ادھر لان میں اپنے اپنے عزیزوں کے پاس بیٹھی کھلتے چہروں اور مسکراتی آنکھوں سے باتیں کر رہی تھیں۔

کاش! اسے بھی کوئی ملے آجائے اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچا۔ کتنے سارے دنوں سے کوئی اسے ملنے نہیں آیا تھا نہ سنی ماموں اور نہ شیر دل۔

”شیر دل کو خدا جانے کیا ہوا تھا شاید گاؤں چلا گیا ہوگا۔

ماما پاپا کا بھی بہت دنوں سے نہ فون آیا تھا نہ خط۔

جینیلی کے جھنڈ میں اپنے مخصوص بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہ گیٹ کی طرف اٹھی۔ مبشر حسن، بابا شفیق کے پاس کھڑا شاید اسے بلانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی کتنے سارے دنوں کے بعد وہ آیا تھا۔ جب وہ اسے بھلائی کی ہوتی تو وہ پھر آجاتا یوں نہیں اچانک غیر متوقع۔ آج وہ شیر دل کا انتظار کر رہی تھی مبشر حسن نے بھی اسے دیکھ لیا اور وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا اس کے پاس آگیا۔

”ہیلو کیسی ہیں آپ؟“ اس نے وہی مخصوص لہجے میں پوچھا۔

”جی ٹھیک ہوں.....“

”ادھر سے گزر رہا تھا.....“

”سوچا، آپ کی خیریت معلوم کرتا ہوں۔“ نادرہ نے بالکل غیر ارادی طور پر اس کی بات مکمل کر دی تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔

”سوری بی بی! ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب کبھی آپ کے ہوٹل کے سامنے سے

گزرتا ہوں تو آپ کا خیال آجاتا ہے۔ ورنہ میں اتنا مصروف رہتا ہوں کہ.....“

”میں گلہ تو نہیں کر رہی۔“

”نہیں آپ گلہ کریں۔ بلکہ آپکو مجھ سے ناراض ہونا چاہئے تھا کہ میں آپ کو امی کے پاس چھوڑ کے پھر گیا ہی نہیں۔ پور تو نہیں ہوئی تھیں آپ وہاں“

”نہیں۔“ اس کو واقعی اپنے یوں نظر انداز کر دیئے جانے پر افسوس ہوا تھا لیکن اب وہ اس سے کیا کہتی۔

”آپ کی امی اور بہنیں بہت اچھی ہیں اچھا وقت گزرا، مدثر بھی بیمار اچھے ہے۔“

”ہاں، میں ہی بد نصیب ہوں جو ان کی محبتوں سے فیض یاب نہیں ہو پاتا۔“ اس نے زیر لب کہا اور پھر نگاہیں اس کے چہرے پر جمادیں۔ ”آپ ناراض ہوں یا نہیں لیکن مجھے تو سوری کرنا چاہئے نادر اصل آپ کو پتا ہے نا، میں نے اپنی ایک تھیٹر کمپنی بنا رکھی ہے۔ اسی کے لئے ڈراما لکھ رہا تھا۔ پھر کرداروں کا چناؤ۔ کریکٹرز پر بحث اور یوں ایک دم سے بڑی ہو گیا۔ اب کہیں جا کر سب سیٹ ہوا ہے تو ریہرسل شروع ہوئی ہے۔“

”السلام علیکم۔“ کرن اور سمیرا اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آگئی تھیں۔

”وعلیکم السلام۔“ اس نے بڑی خوش دلی سے جواب دیا۔

سمیرا کوک لے آئی اور کوک پیتے ہوئے وہ تینوں سے باتیں کرتا رہا۔ کرن اپنی فطرت کے مطابق فوراً ہی اس سے بے تکلف ہو گئی تھی اور اس نے اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ انہیں ریہرسل دکھانے کے لئے اپنے آفس لے جائے گا۔

”آپ کل کالج ٹائم کے بعد اجازت نامہ لے کر رکھیں، میں لے جاؤں گا۔“

جاتے جاتے اس نے کہا۔

کرن نے اس کے جانے کے بعد انکشاف کیا۔ ”یہ شخص تم سے محبت کرنے کے تذبذب سے گزر رہا ہے۔“

”کیا؟“ وہ چونکی۔

بھئی، یہ جو مبشر حسن صاحب ہیں نا۔ یہ محبت کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے والے ہیں،

ہوں اور اگر وہ تمہیں.....“

”بس بس۔“ سمیرا نے ہاتھ اٹھایا۔ ”ہمیں علم ہو گیا ہے کہ تم نے ہماری عدم موجودگی میں خلیل جبران کو گھول کر پی لیا ہے۔“

”ندو!“ کرن نے مصنوعی تشویش سے اسے دیکھا۔ ”ایک بات تو بتاؤ یہ تم ہماری غیر حاضری میں مس حبیب کی صحبت میں زیادہ تو نہیں بیٹھنے لگی تھیں؟“

”کیوں؟“ اس نے بھوئیں اچکائیں۔

”یہ محبت کرنے کی خواہش اور یہ تمہارے نظریات میں اتنا زبردست چیلنج۔“

”محبت پانے کی خواہش کس کے دل میں نہیں ہوتی۔ ایک بچے سے لے کر ایک بوڑھے تک کے دل میں یہ چاہ ہوتی ہے کہ لوگ اسے چاہیں۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ مس حبیب سے صرف ایک بار ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے۔“ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچنے لگی۔ ”مجھے شیر دل کے ساتھ باہر جانے کا مشورہ دیا تھا۔“

”رنیلی!“ کرن اچھل پڑی۔

”سوچ رہی ہوں ان کا مشورہ اچھا تھا۔“

”یہ دھاندلی ہے بھئی۔“ کرن نے اسے گھورا۔ ”آپ مجھ سے وعدہ کر چکی ہیں۔“

”جی۔“ وہ ہنس دی۔

”چلو پھر ذرا مس حبیب کی خیر خبر لے آئیں۔“ سمیرا نے تجویز پیش کی۔ تو وہ تینوں مس حبیب کے کمرے کی طرف چل دیں۔

اس نے آخری پیریڈ چھوڑ دیا تھا کیونکہ اسے مبشر کے آفس جانا تھا۔ اس روز وہ ان تینوں کو رپہرسل دکھانے لے گیا تھا۔ ڈراما بالکل نیا اور عام موضوع سے ہٹ کر تھا۔ کام کرنے والے بھی سب ٹی وی کے منجھے ہوئے اداکار تھے۔

”اس سے پہلے ہماری کمپنی نے ”الحمر“ سے ایک ڈراما پیش کیا تھا اگرچہ وہ عوامی

لیکن یہ تو پہلی کیا آخری سیر ہی تک چڑھ کر واپس بھی آچکے ہیں سمیرا نے یاد دلایا۔

”بھئی، پرانی محبتوں کو گولی مارو۔ یہ ایک نئی محبت کے لئے خود کو تیار کر رہے ہیں۔ اپنی دنیا کے ساتھ۔“

”جھوٹ۔“ نادرہ نے یقین سے کہا۔ ”ضروری نہیں کہ ہمیشہ تمہارا خیال صحیح ہو۔“

”دیکھ لینا۔“ کرن نے کندھے اچکائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

نادرہ مبشر کے متعلق سوچنے لگی۔ وہ جب بھی اسے ملتا وہ یونہی ڈسٹرب ہو جاتی تھی اور اسے اپنی اس ڈسٹرینس کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ خدا جانے اس کی شخصیت کا سحر تھا یا اس کی آنکھوں کا حزن تھا وہ گھنٹوں اس کے متعلق سوچتی رہتی تھی۔ کیا کرن صحیح کہتی ہے کہ وہ..... کبھی کبھی وہ دیکھتا تو اسی طرح ہے یوں جیسے گردش سے بے خبر ہو گیا ہو اور میں..... کیا میں بھی؟ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا مگر وہاں کوئی ہلچل نہ ہوئی۔ شاید محبت کے لئے ابھی میں کم عمر ہوں۔

اور شاید مبشر حسن وہ شخص نہیں ہے جس کے لئے میں نے اپنے دل کے دروازے کھول رکھے ہیں۔



”اے کیا سوچنے لگیں؟ سمیرا نے اسے بازو سے پکڑ کر ہلایا۔

”مبشر حسن؟“ کرن کی آنکھوں میں شریسی چمک تھی۔

”فضول باتیں نہیں کیا کرو کرن!“ وہ خفا ہو گئی۔

”ناراض نہیں ہو بھئی۔ میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ بالی داوے محبت کے بارے میں تمہارا کیا نظریہ ہے۔ کیا محبت کی پکار پر لپیک نہیں کہنا چاہئے؟“

”محبت کی پکار۔“ اس نے سوچتی نظروں سے کرن کو دیکھا۔ ”ہاں، محبت تمہیں بلائے تو اس کے پیچھے ضرور جاؤ چاہے اس کے رستے کٹھن اور دشوار گزار ہی کیوں نہ

سطح پر کامیاب نہیں ہوا تھا لیکن میچور طبقے نے اسے پسند کیا تھا۔ اب یہ میرا دوسرا ڈرامہ ہے۔ میں عوام کو اچھے اور معیاری ڈراموں سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ڈراما یہودہ اور فضول سے بے معنی مکالموں کا نام نہیں ہے۔

”مگر شاید پہلے کی طرح اب بھی تمہارا یہ ڈراما کامیاب نہ ہو کیونکہ لوگ وہی یہودہ مذاق دیکھنا چاہتے ہیں۔ تمہارا یہ اتنا سنجیدہ ڈراما کون دیکھے گا۔“ ایک اداکار نے نرمی سے کہا۔

اس نے کندھے اچکائے۔ ”نہ دیکھے مگر مجھے ڈرامے سے عشق ہے۔“

پھر وہ مختلف لوگوں کو ان کے کردار سمجھا تا رہا تھا۔

تینوں خاموشی سے ایک طرف بیٹھی اسے ادھر ادھر آتے جاتے دیکھتی رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح وہ انہیں لا کر بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی کوئی اداکار یا اداکارہ ان کے پاس آکر بیٹھ جاتی تھی۔ وہاں موجود تقریباً سبھی لڑکیوں نے اس کی خوبصورتی کی تعریف کی تھی اور اسے ٹی۔وی پر آنے کی دعوت دی تھی۔ ہیر وئن کا کردار نورین احمر کر رہی تھی۔

”کیسا لگا آپ کو ڈراما؟“ جب وہ انہیں واپس چھوڑنے جا رہا تھا تو اس نے پوچھا۔

”اچھا۔ موضوع بہت خوبصورت اور منفرد ہے، کرداروں کا چناؤ بھی خوب ہے، سبھی اپنی اپنی جگہ حقیقی کردار لگ رہے تھے۔ لیکن نورین احمر کچھ جچی نہیں۔ ایک تو ڈرامے کی ہیر وئن سولہ سالہ لڑکی ہے جبکہ نورین احمر کی عمر بہت زیادہ ہے۔ دوسرے ان کی ڈائلاگ ڈیلیوری بھی کچھ صحیح نہیں تھی۔ چہرہ بالکل سپاٹ یوں لگتا ہے جیسے کسی روباٹ کے منہ سے جملے نکل رہے ہوں۔ حالانکہ جب وہ کہتی ہے کہ:

”مل جی رہی ہوں۔ پلیز، یہ آگ بجھا دو۔ سنو میں تمہیں سب کچھ دے دوں گی۔“

”تو ان سارے مکالموں میں اتنا تاثر ہونا چاہئے تھا کہ دیکھنے والا رو پڑے۔“

”ویری گڈ!“ مبشر حسن نے بہت حیرت سے اسے دیکھا۔ ”آپ کا مشاہدہ غضب کا ہے۔“

”آپ سعدیہ رضا کو کیوں نہیں لیتے وہ کم عمر بھی ہے اور اس پر یہ کردار سوٹ بھی کرے گا۔“

”ہاں لیکن وہ آج کل ملک سے باہر ہے۔“

”اپنی ندیا بھی تو غضب کی ایکٹنگ کرتی ہے تین سال سے مسلسل پرائز جیت رہی ہے۔“ کرن نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ مناسب ہے، ان سے پوچھ لیں.....“

”نہیں۔“ اس نے اس کی بات کاٹ دی

”کیوں نہیں؟“

”کیونکہ کالج کی اور بات ہے لیکن تھیٹر میں امپاسیبل ہے۔“

بظاہر بات ختم ہو گئی تھی لیکن چند دن بعد مبشر پھر آگیا تھا۔

”پلیز ندیا! تم میری آفر پر غور کرو۔ وہ نورین تو خفا ہو کر چلی گئی ہے۔ میں نے کئی لڑکیوں کو آزمایا ہے مگر کوئی بھی میری ڈیمانڈ پر پورا نہیں اترتی۔ میں سنی سے بات کر لیتا ہوں۔“

”سنی ماموں کی بات نہیں ہے سر! میرے پاپا شاید اسے پسند نہ کریں۔ آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے مجھے خود سے اس لئے دور کیا ہے کہ میں ایک اچھی مسلمان لڑکی بن سکوں۔“

”تم اپنے پاپا سے بات کرو نا۔ کیا خبر وہ اجازت دے دیں۔“

اور تب ہمیشہ کی طرح وہ اسکے سامنے مجبور ہو گئی۔ اس نے اس کے آفس سے ہی فون کیا لیکن پتا چلا کہ پاپا تبلیغی جماعت میں شامل ہو کر کہیں تبلیغی دورے پر گئے ہوئے

ہیں۔ تب اس نے انہیں خط لکھ دیا لیکن مبشر بہت مضطرب تھا جانے خط کا جواب کب آئے اس طرح تو بہت وقت ضائع ہو گا۔

”تم پلیز، ریہرسل کے لئے آجایا کرو۔ مجھے یقین ہے تمہارے پاپا انکار نہیں کریں گے اور جب تک ان کی اجازت آئے گی تب ہم ریہرسل مکمل کر لیں گے۔“

اور یوں وہ اس کے آفس جانے لگی تھی۔ اس وقت بھی وہ آخری پیریڈ چھوڑ کر گیٹ کی طرف جارہی تھی کیونکہ آج مبشر نے اسے جلدی بلایا تھا کہ مسز توفیق نے اسے بلالیا۔۔۔۔۔ ہمیشہ کی طرح ان کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ کائن کی پرنٹڈ قمیض اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھیں۔

”ندیا! ادھر آ جاؤ اور دو روم میں، یہ میگزین کے لئے ایک مضمون ہے، ذرا اس پر ڈسکس کر لیں۔“

وہ دو سال سے میگزین کی ایڈیٹر چلی آرہی تھی اور مسز توفیق سے اس کی بہت دوستی ہو گئی تھی، وہ ہر موضوع پر بات کرتی تھیں۔ البتہ ان کی ازدواجی زندگی کبھی زیر بحث نہیں آئی تھی ان کے قریب آ کر اسے پتا چلا تھا کہ وہ اندر سے کتنی نرم دل اور حساس ہیں وطن کی محبت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ پاکستان کو ایک دم سے صف اول کے ملکوں میں لاکھڑا کریں دراصل ان کا پورا خاندان باپ بھائی، ماں، بہنیں سب پاکستان ہجرت کرتے وقت شہید ہو گئے تھے اور وہ اپنے خاندان کی واحد بچی تھیں جو زندہ رہی تھیں۔ اس وقت وہ تقریباً دس سال کی تھیں۔ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے وہ بہت جذباتی ہو جاتی تھیں۔ لگتا ہی نہیں تھا یہ وہی مسز توفیق ہیں جنہوں نے پہلے روز اپنا تعارف انور خورشید کے نام سے کروایا تھا۔

”یہ مضمون جو تم نے لگایا ہے میرے خیال میں پرنسپل اس پر اعتراض کریں گی۔“

انہوں نے اسے مضمون دیتے ہوئے کہا۔

”مگر کیوں میڈم؟“

”بھئی، مجھے تو پہلے ہی وہ اسلام دشمن سمجھتی ہیں۔ بلکہ سنا ہے وہ مسز نور الدین کو میگزین کا انچارج بنا رہی ہیں۔ اور انہوں نے سارا میٹرمانکا ہے دیکھنے کے لئے میرا خیال ہے، تم اسے ایک نظر دیکھ لو اور اگر کوئی اور مضمون افسانہ اس طرح کا ہے تو اسے نکال دو اور میں نے تمہارا وہ افسانہ بھی نکال دیا ہے جو تم نے نطشے کے اس جملے سے شروع کیا ہے کہ (نعوذ باللہ) آج خدا۔۔۔۔۔“

”مگر میڈم! اسے آپ نے پورا نہیں پڑھا، وہ بہت زبردست کہانی ہے۔“

”ہاں لیکن کسی اعلیٰ پائے کے ادبی پرچے کے لئے۔ بھئی کیوں میری نوکری کے پیچھے پڑی ہو۔“

”ٹھیک ہے میڈم! وہ اداس ہو گئی۔“ میں یہ سب مواد ایک بار پھر دیکھ لوں گی۔“

”ابھی دیکھ لو۔ پرنسپل مانگ رہی تھیں۔“

”مگر ابھی تو میں جارہی ہوں۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”دیکھو ندیا! تمہاری عمر ابھی بہت کم ہے۔ یہ شو بزنس کی دنیا اور وہاں کے لوگ بہت عجیب ہوتے ہیں اور تم بڑی پیاری بچی ہو۔“

”میڈم، وہ میرے ماموں کے دوست ہیں، ڈرنے والی کوئی بات نہیں ہے۔“

”اچھا تو پھر بیٹھو۔ اکٹھے چلتے ہیں۔ میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔“

”تھنک یو میڈم!“

وہ ایک طرف بیٹھ گئی۔ اور سامنے بیٹھی مسز فیروز کو دیکھنے لگی جو اونچا جوڑا پہنائے لیو ساری بلیو جوتے اور بلیو سی جرابیں پہنے تھیں ہمیشہ کی طرح مغرور اور اکڑنی لگ ہی تھیں۔

”آئیں، چائے پی لیں۔“ انہوں نے مسز توفیق کو بلایا۔

”آؤ ندیا، چائے بناؤ اپنے لئے بھی بنانا۔“ مسز توفیق نے پیالیاں الماری سے نکال کر ٹیبل پر رکھیں۔

”نومیدم! تھینکیو میں نہیں پیوں گی آپ کے لئے بناتی ہو۔“ وہ چائے بنانے لگی تب یہ تاج بی بی نے اندر جھانکا۔

”وہ ہنی بابا آئے ہیں۔“

”اچھا بھیج دو۔“

اس نے مڑ کر دیکھا وہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا تھا۔ بڑی بڑی بے تحاشا خوبصورت آنکھیں اور بھیکتی مسوں والا یہ لڑکا۔ مسز فیروز کے پاس آکھڑا ہوا۔

”ہیلو می!“

”ہیلو!“ انہوں نے سرسری نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی، پوری کہانی اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی تھی۔

”بہت عرصے بعد آئے ہو؟“

”جی، میں دادا کے ساتھ باہر چلا گیا تھا اب چھ ماہ سے آیا ہوا ہوں لیکن پہلے کچھ بیمار رہا پھر موقع ہی نہ مل سکا آنے کا۔“

”کیسے ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“

”بیٹھو گے؟“

”نہیں چلتا ہوں۔“ وہ بات کر کے لمحہ بھر رک کر ان کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر ایک دم مڑ گیا۔ اس کی دلکش آنکھوں میں کسی محرومی کے گہرے سائے تھے، چہرے پر

دُور اور ملال کے بادل تھے۔

’نہیں۔‘ اس نے اپنے لب بھینچ لئے۔ یہ کیسی ماں ہیں وہ شاید سال بعد یا اس سے بھی زیادہ عرصے کے بعد آیا ہے مگر انہوں نے کس طرح اجنبیوں کی طرح اس کا مواگت کیا ہے۔ یوں..... یوں جیسے اس کا ان سے کوئی رشتہ نہ ہو، جیسے وہ کوئی غیر متعلق اجنبی لڑکا ہو۔ کتنا روکھا کتنا خشک لہجہ تھا جیسے کسی اسٹوڈنٹ سے بات کر رہی ہوں۔ ہمیشہ کی طرح کوئی چیز اس کے اندر پگھلنے لگی۔ کچھ ٹوٹنے لگا۔ دروازہ کھولتے ہوئے وہ مڑا۔

”میں شاید اب بہت عرصہ نہ آسکوں۔ دادا نے میرا ایڈمیشن امریکہ میں کروادیا ہے۔ خدا حافظ!“

اسے لگا جیسے وہ چھوٹا سا معصوم سا لڑکا اندر سے ٹوٹ رہا ہے۔ اس کا جی چاہا وہ اٹھے، اسے سینے سے لگائے، پیار کرے۔ اور اس سے کہے اپنی آنکھوں سے محرومی کے یہ بادل ہٹا دو، میں تمہیں..... لیکن وہ باہر چلا گیا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر کھڑی ہو گئی تھی۔ نادم کی ہو کر اس نے مسز فیروز کو دیکھا وہ پہلے کے سے انداز میں ہی چائے کی چسکیاں لے رہی تھیں۔ سپاٹ اور بے جان چہرے کے ساتھ انہیں تو چاہئے تھا وہ اسے بھی بھینچ لیتیں، پیار کرتیں۔ اس کے رخساروں پر اس کی آنکھوں پر، اس کے ہونٹوں پر اور اپنے آنسوؤں سے اس کا چہرہ بگھوڑا لیتیں مگر..... کاش! کاش! وہ ان کے دل میں جھانک سکتی، مانہیں یہ کیسی دنیا ہے اور یہاں رشتے کیا اہمیت رکھتے ہیں، کیا ہوتے ہیں۔

مانتا کیا ہے۔ محبت کیا ہے۔

مانتا تو کبھی مجبور نہیں ہوتی۔

کسی نے روکا تھا انہیں، کون منع کرنے والا تھا۔ وہ جی بھر کر اسے پیار کرتیں سینے سے لگاتیں، چومتیں۔

اس بچے کے لئے اس کے دل میں درد جاگ اٹھا۔

کاش! وہ اس کے پیچھے جا کر اس کو روک لیتی اور اس کے اس آنسو کو جو باہر نہیں نکلتا لیکن اس کی آنکھ کے گوشے میں چمک رہا تھا۔ اپنی انگلی سے پونچھ ڈالتی اور اس سے کہتی: ”ہنی بابا۔ مجھے اپنی بہن بنا لو۔ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ مجھے اپنا دوست سمجھ لو۔ ہم ایک دوسرے کی محرومیوں کا زالہ کریں گے۔“

”چلو بھئی۔“ مسز توفیق نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑی۔ باہر آکر اس نے چپکے سے منہ موڑ کر اپنے آنسو صاف کئے لیکن مسز توفیق نے اسے دیکھ لیا۔

”بہت چھوٹا سے دل ہے تمہارا اندیا۔“

”میڈم۔“ آنسو پھر اس کی آنکھوں میں مچلنے لگے۔

”اتنی حساس مت بنو کہ زندگی تمہارے لئے مشکل ہو جائے۔ یہ دنیا ہے۔ بہت پیارا بچہ ہے مسز فیروز کا۔“ انہوں نے مختصر سا تبصرہ کیا۔ ”تین سال پہلے پہلی بار ان سے ملنے آیا تھا۔ بچپن میں ہی دادا لے گئے تھے۔ مذہب کا پرالہم تھا شاید۔ اچھا ہے مسز فیروز بھی اس کی جدائی کو اتنا محسوس نہیں کرتیں۔“

”جی۔“ وہ خاموشی سے ان کے برابر بیٹھ گئی۔ مسز توفیق خود ہی ڈرائیو کرتی تھیں۔

اور کیا پتا۔ وہ محسوس کرتی ہیں یا نہیں اور اندر کا حال تو خدا ہی جانتا ہے اور جانے کیسے اور کتنی مشکل سے انہوں نے اپنی ماما کے آگے بند باندھ رکھے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس کے لئے سوچتی بھی نہ ہوں، اس بچے کے لئے جو ان کا تھا لیکن جو شاید ان کا نہیں تھا۔

وہ عجیب عجیب لایعنی اور اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی رہی۔

”بی ایڑی!“ انہوں نے گاڑی روکتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”یہ میرا گھر ہے۔ مبشر صاحب کا آفس تو آگے ہے۔ میں ذرا ڈاکٹر کا نسخہ لے لوں۔ راستے سے

”میڈیسن لے لوں گی۔ تم بھی اندر چلو۔“

وہ ان کے پیچھے پیچھے اتر آئی۔ وہ اسے اپنے بیڈ روم میں لائی تھیں۔ چاروں طرف ریکس میں کتابیں پڑی تھیں۔ بستر پر بھی کتابیں پڑی تھیں۔ وہ کسی خاتون کے بجائے کسی بچلے مرد کا گمرہ لگ رہا تھا اور بالکل سامنے ماؤزے تنگ کی فل سائز تصویر بھی۔ بڑے سے فریم میں جوزین سے چھت تک تھا۔ وہ حیران سی تصویر کو دیکھتی رہی۔

”یہ..... یہ تصویر؟“ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن مسز توفیق کمرے میں نہیں تھیں۔ اور جب وہ پلٹیں تو وہ خاموش ہی رہی۔ نہ کوئی سوال نہ استفسار۔ وہ تو اس انکشاف کے ہنگاموں کو سہہ رہی تھی۔ پتا نہیں، یہ سارے انکشاف صرف اسی پر ہوتے تھے یا سب پر اسی روح آگئی و انکشاف کے دروازے کھلتے رہتے ہیں، ہولے ہولے دھیرے دھیرے۔

”چلو۔“ انہوں نے ٹیبل پر کتاب کے نیچے دبائے اٹھایا۔ تب ہی ایک دبلا پتلا منحنی سا شخص اندر داخل ہوا۔ شکل سے وہ کوئی انتہائی شریف و خاموس طبع سا مکار لگتا تھا۔

”توفیق صاحب!“ انہوں نے آہستگی سے اسے مطلع کیا یا تعارف کروایا، وہ سمجھ نہ سکی۔ یہ ایک اور جھٹکا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ ان کے میاں انتہائی خوفناک قسم کے مجرماو سے اجڈ گنوار اور جاہل قسم کے آدمی ہوں گے کہ مسز توفیق ان کے حوالے سے پچھانا جانا پسند نہیں کرتیں۔

اس نے سر جھکا کر شائستگی سے سلام کیا اور مسز توفیق کے پیچھے باہر نکل آئی۔ آفس میں بالکل خاموشی تھی۔ اس نے ریسیپشن روم میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔

”کیا ابھی تک کوئی نہیں آیا؟“

”جی، وہ صاحب تو اندر والے کمرے میں ہیں۔“ جانے کہاں سے نصیر اکل کر اس

کے سامنے آگیا۔

”اور باقی لوگ؟“

”وہ تو ابھی نہیں آئے جی۔“

”اچھا۔“

وہ چھوٹے سے ہال سے گزر کر اس کمرے کے سامنے جا کر لمحہ بھر کو رکھی جو مبشر کا ذاتی کمرہ تھا۔ مبشر نے اسے بتایا تھا کہ کبھی جب اس کا گھر جانے کو دل نہ چاہے تو وہ یہاں سو جاتا ہے۔ اس نے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھا۔ اندر سے ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی، شاید مبشر حسن دھیمے سروں میں گنگنا رہے تھے۔

کس سے کہوں کہ آج میرے ساتھ آکے پی۔

اتریں گے کس کے حلقے سے دلخراش گھونٹ۔

کس سے کہوں کہ آج.....

آواز میں بڑا سوز اور درد تھا۔ لمحہ بھر ٹھہر کر اس نے دستک دی۔

”آجاؤ۔“ بھاری سی آوازی آئی۔

اس نے دروازہ کھولا، سامنے ہی آرام کرسی پر آنکھیں موندے مبشر حسن بیٹم دراز تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر گلاس میں کوئی مشروب تھا۔ آنکھیں کھول کر اس نے اسے دیکھا۔ نادارہ نے دیکھا اسکی آنکھیں ایک دم سرخ ہو رہی تھیں۔

”سرا! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

”ہاں۔“ وہ سیدھا ہو گیا اور میز پر پڑا ہوا گلاس اٹھا کر اس نے دراز میں رکھ دیا۔

مڑ کر اسے دیکھا۔

”سوری، میں تمہیں انفارم نہ کر سکا کہ آج ریہرسل نہیں ہوگی۔“

”تو پھر میں چلتی ہوں۔“

”بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔“

وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”پاپا کا جواب آیا؟“

”نہیں۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور نگاہیں جھکالیں کیونکہ اس کی نگاہیں اس کے

چہرے کا طواف کر رہی تھیں، وار فنگل لے۔

بے چینی سے اس نے پہلو بدلا تو چونک کر اس نے نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔

”سنو اگر ناگوار نہ ہو تو کپ بورڈ میں کافی بنانے کا سارا سامان ہے۔“ پلیز۔

”جی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جب اس کی طرف پیٹھ کئے وہ کافی بنا رہی تھی تو جیسے

کسی نے بہت نرمی سے اسے پکارا۔

”نادارہ!“

یوں اس طرح اس کا نام لے کر کسی نے پہلی بار اسے پکارا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا

لیکن مبشر حسن آنکھیں موندے کرسی کی پشت سے سر نکائے بیٹھا تھا۔

”شاید مجھے وہم ہوا ہے۔ وہ پھر پلٹ کر چائے بنانے لگی۔“

”نادارہ! سنو۔ تم نے اپنی آنکھوں میں خوابوں کے جو خزانے چھپا رکھے ہیں۔“

انہیں میرے نام کر دو۔“

یکبارگی اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ لمحہ بھر وہ یونہی ساکت کھڑی رہی پھر

بڑی آہستگی سے وہ مڑی، وہ آنکھیں کھولے بہت اشتیاق اور وار فنگل سے اسے دیکھ رہا

تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ ہولے سے مسکرایا اور پھر نگاہیں اس پر سے ہٹالیں۔

کافی بناتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ نگاہیں جھکائے جھکائے اس نے

پیالی اس کی طرف بڑھادی۔

”نادارہ! اگر تمہارے پاپا نے اجازت نہ دی تو پھر بڑی مشکل ہو جائے گی۔“

چند لمحے پہلے والا تاثر اب اس کے چہرے پر کہیں نہیں تھا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اس کی آنکھیں بے رنگ تھیں۔ کسی جذبے، کسی محبت، کسی خوشی کا رنگ ان میں نہ تھا وہی ملال کے دھندلے دھندلے سائے ان خوبصورت آنکھوں کی جھیلوں کو چھپائے ہوئے تھے۔

اسے اپنی سماعت بے اعتبار سی لگنے لگی۔

”ہاں نادارہ! تو کیا کریں گے پھر ہم؟“

”آپ..... آپ کسی اور لڑکی کو دیکھیں نا۔“

”کوئی لڑکی میرے معیار پر نہیں اترتی تم بہت ڈوب کر مکالمے بولتی ہو۔“

”اور کافی؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں تھینکس۔ نادارہ۔“

”آپ مجھے نادارہ کہہ کر بلارہے ہیں، یہ نام آپ کو مشکل نہیں لگا۔ بھاری بھر کم سا

نادارہ شاہ درانی کی طرح۔“

”نہیں، یہ نام تو مجھے بالکل پھولوں کی طرح لگا، انار کے پھولوں کی طرح تمہیں پتا

ہے انار کلی کا نام؟“

”ہاں۔“ اس نے آج سے پہلے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ انار کلی کا نام بھی نادارہ تھا

اور انار کلی، انار کلی تو محروم محبت تھی، کیا میں بھی..... نہیں..... اس نے پکی سی لی۔

”کیا سوچنے لگی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“

”پاگل ہو تم! ناموں سے کیا ہوتا ہے۔ تمہارے سامنے تو ابھی ایک عمر پڑی ہے۔

بہت خوشیاں ملیں گی تمہیں۔“

وہ شاید اس کے اندر جھانک رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔ ایک طمانیت بھری مسکراہٹ،

کافی پینے کے بعد وہ اسے لمبی ڈرائیو پر ساتھ لے گیا۔ گاڑی کھڑی کر کے وہ کچھ دیر راوی کے کنارے ٹہکتے رہے۔ انہوں نے آئس کریم کھائی۔ ماڈل ٹاؤن کی مخصوص دکان سے کباب کھائے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ سنی ماموں کی باتیں، ڈرامے کی باتیں، اس کی پڑھائی اور مستقبل کی باتیں۔ لیکن وہ ایک بات جو اس کے کان دوبارہ سننا چاہتے تھے وہ جسے کر کے بھول گیا تھا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے کبھی کبھی وہ گنگنا نے لگتا۔

”کس سے کہوں.....“

اور پھر ذرا سارخ موڑ کر اسے دیکھنے لگتا۔ کالج گیٹ پر اسے اتارتے ہوئے اس نے تھوڑا اس کی طرف جھک کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

”تمہارا بہت شکریہ نادارہ! آج میں بہت تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ اگر تم نہ آتیں تو شاید تنہائی مجھے ڈس لیتی۔“ اور پھر ہمیشہ کی طرح وہ گاڑی آگے نکال لے گیا۔

اس روز جب وہ بیڈ پر لیٹی تو اس کے کانوں میں ایک ہی جملہ بار بار گونج رہا تھا۔

”نادارہ، خوابوں کے جو خزانے تم نے اپنی آنکھوں.....“

اور پھر یونہی لیٹے لیٹے اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے دل کے دروازوں پر جلتے چراغوں کی لوتیز ہو گئی ہے اور کوئی شخص ان کھلے دروازوں سے اندر آ گیا ہے۔

”نہیں۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”میں ابھی..... ابھی میں محبت کا بار نہیں برداشت کر سکتی ابھی۔“

”محبت بار تو نہیں، یہ تو ایک بڑا لطیف جذبہ ہے۔“ اس کے دل نے سرگوشی کی۔  
”لیکن یہ شخص.....“

دوسروں سے مختلف، باوقار اور پر سحر سی شخصیت والا۔ جس کی محبت میں بھی ایک وقار ہو گا ایک میچور محبت جس میں چھپھورا پن نہیں ہو گا۔



”ہاں، یہی محبت ہے۔“

”نادرہ! اسے بتاؤ، یہاں اس سین میں اسے کس طرح انٹری کرنی ہے۔ کس طرح ایکشن دینے ہیں اور چہرے کے تاثرات کیسے ہوں۔“

اس کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں اور وہ لہرا نے لگی۔

”بس ایک بار مجھے ٹوٹ کر ملے کوئی۔“

پھر۔۔

اس نے اپنی بند ہوتی آنکھوں کو زبردستی کھولا پھر بند کیا۔

”اس کے بعد بکھر جاؤں ریت کی صورت!“

اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنا جھکا ہوا چہرہ اٹھایا۔ اس کی آنکھوں کے کونوں پر آنسو اٹکے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی اور آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

”بس ایک بار۔“

”اس کی آواز ٹوٹ گئی لیکن اس کے ہونٹ بل رہے تھے اور وہ گرتی جا رہی تھی۔  
”ونڈر فل!“ عندلیب اور کرن نے ایک ساتھ تالی بجائی۔ مبشر حسن کی آنکھوں میں تحسین تھی۔ جب وہ کرن کے پاس آئی، تب بھی اس کی آنکھوں کے گوشے بھیکے ہوئے تھے۔

”لگتا ہے۔ تم مکالمہ نہیں بولتی ہو بلکہ یہ تمہارے اندر کی آواز ہے، خاص طور پر اس آخری سین میں۔“

مبشر بالکل اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی، پتا نہیں کیوں۔ اس کی قربت سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔

”آپ کیوں نہیں یہ کردار لے لیتیں۔“ عندلیب اس کے قریب چلی آئی۔

”مجھے پسند نہیں ہے اسٹیج پر کام کرنا۔“ اس نے نرمی سے کہا۔ اور جہاں زیب کی طرف متوجہ ہو گئی جو بڑی دیر سے اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

”سنو۔“ جب وہ واپس جا رہی تھی تو مبشر حسن نے کہا۔ ”اس لڑکے جہاں زیب سے فری ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے ایک نظر اس کے تپے ہوئے چہرے کو دیکھا اور مسکرا دی۔

”آل رائیٹ سر، یوں بھی اب امتحان ہونے والا ہے میں پڑھائی میں بڑی ہو جاؤں گی اور شاید ادھر نہ ہی آؤں۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ ویسے بھی اب ہم فائل ریہرسل ”الحمر“ میں ہی کریں گے۔“



وہ پڑھائی میں بے طرح مصروف ہو گئی تھی لیکن ذرا دیر کے لئے جب وہ ریلیکس ہونے کے لئے کتابیں بند کر کے آنکھیں موندتی تو وہ اسکے تصور میں چلا آتا۔ ہولے ہولے، چپکے چپکے وہ اس سے محبت کر رہی تھی اور اپنے اس راز میں ابھی اس نے کسی کو بھی شریک نہ کیا تھا اور وہ شریک کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ یونہی ہولے ہولے چپکے چپکے محبت کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ایسا ہی سوچا تھا کہ اگر کبھی اس نے کسی سے محبت کی تو وہ یونہی محبت کرے گی۔ اس طرح خاموشی سے چپکے چپکے۔ اس دوران مبشر صرف ایک بار آیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہاں سے گزرتے ہوئے اس کی خیریت معلوم کرنے اور اس نے بتایا تھا کہ وہ ڈراما پیش نہیں کر سکا تھا۔ کئی پرائمر کھڑے ہو گئے تھے انہیں سلجھاتے سلجھاتے اداکار بکھر گئے تھے۔ کچھ لوگ ٹی وی کی نئی سیریل میں مصروف ہو گئے تھے۔ عندلیب کی شادی ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ مد ناز سعودی عرب فنکاروں کی ایک ٹیم کے ساتھ چلی گئی تھی۔ یوں وہ ڈراما پیش ہونے سے پہلے ہی فلاپ ہو گیا تھا۔ وہ بہت افسردہ تھا، نادرہ کو بھی اس کی محنت رائیگاں جانے کا افسوس ہوا تھا۔ پھر وہ جلدی آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا اور وہ امتحان میں مصروف ہو گئی۔

امتحان سے فارغ ہو کر بے اختیار اس کا دل اس سے ملنے کو چاہا اور وہ اس سے ملنے آفس گئی مگر آفس بند تھا تب اس کے ماڈل ٹاؤن والے گھر وہ اس کی والدہ سے ملنے چلی گئی۔ وہ بڑی محبت سے ملیں مگر وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ اس کے شادمان والے گھر بھی

گئی مگر وہ گھر بھی بند تھا۔ عجیب سی تڑپ اور بے چینی تھی وہ جانے سے پہلے اس سے ملنا چاہتی تھی اس کے دیئے ہوئے نمبروں پر وہ ہر روز دو تین بار فون کرتی لیکن وہ نہیں مل رہا تھا۔ اور یونہی وقت گزر گیا۔

سنی ماموں اسے لینے کے لئے آگئے۔ وہ کتنے کمزور اور تھکے تھکے لگ رہے تھے وہ یونہی بلاوجہ ان سے لپٹ کر رودی۔ وہ ہولے ہولے اسے تھپکتے رہے۔

بہت سی باتیں اسے رلا رہی تھیں۔

مبشر حسن سے نہ ملنے کا دکھ۔

ہوسٹل کو چھوڑنے کا دکھ۔

چار سال، زندگی کے چار خوبصورت برس اس نے یہاں گزارے تھے۔ اس کے دور دیوار سے خاصی وابستگی ہو گئی تھی۔ یہاں اس نے بہت کچھ پایا تھا، بہت کچھ سیکھا اور جانا تھا۔

آگئی کے بہت سے در اس پر وا ہوئے تھے۔

کرن اور سمیرا جیسی مخلص دوست ملی تھیں اور۔

اور۔

مس حبیب کا دکھ۔

مسز نواز کا غم۔

اور مسز فیروز کے اس بھیکتی مسوں والے بچے کا درد جس کی آنکھوں میں ایک آنسو منجمد ہو گیا تھا جو بہا نہیں تھا لیکن جس سے اس کا سارا وجود بھیگتا رہتا تھا۔

کاش..... کاش، وہ بچہ اسے کہیں مل جاتا۔ تو وہ اسے اتنا پیار کرتی، اتنا پیار کرتی کہ عمر بھر کی محرومیوں کی تلانی ہو جاتی۔

بھیکتی آنکھوں کے ساتھ سب ٹیچرز سے مل کر وہ سنی ماموں کے ساتھ اسلام

آباد آگئی۔

کرد جو بات کرنی ہے۔ اگر اس آس پر بیٹھے۔

کہ دنیا بس تمہیں سننے کی خاطر

گوش بر آواز ہو کر بیٹھ جائے گی۔

تو ایسا ہو نہیں سکتا۔

جسے تم وقت کہتے ہو، دھند لگا سا کوئی جیسے۔ زمیں سے آسمان تک ہے۔

یہ کوئی خواب ہے جیسے۔

نہیں معلوم کچھ اس خواب کی مدت کہاں تک ہے۔

کرد جو بات کرنی ہے۔

کرد جو بات کرنی ہے۔ کرد جو بات کرنی ہے۔

وہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹیکے بڑی دیر سے یونہی بیٹھی سوچ رہی تھی کہ وہ

کیا بات کرے، کس طرح بات کرے۔ کیا کہے اور وہ ہمیشہ کی طرح اس کے وجود سے

کچھ بے نیاز سا کرسی میں دھنسا بیٹھا تھا۔ وہ کتنے دنوں بعد آج اس سے ملنے آئی تھی اور

وہ اسے انور کئے ہوئے تھا۔ اس سے قطعی بے نیاز، اپنے آپ میں گم کچھ سوچتا ہوا آج

وہ مضطرب بہت بے چین ہو کر یونیورسٹی سے سیدھی اس اس کے آفس چلی آئی تھی۔

وہ جو کبھی کہتی تھی کہ وہ بڑی میچور قسم کی محبت کرے گی۔ ایسی محبت جس میں کچھ کہے بنا

لفظوں کا سہارا لئے بغیر خود بخود دل کی بات دل میں اتر جائے گی۔ اب کبھی کبھی اس کا

دل چاہنے لگا تھا کہ مبشر حسن اس سے اظہار کرے۔ اپنی محبت کا اپنی چاہت کا تو شاید

دل کے سارے خلا بھر جائیں۔ لیکن وہ اس سے دنیا جہان کی باتیں کرنے کے باوجود

اس موضوع پر بات نہیں کرتا تھا۔ ہاں۔ کبھی کبھی کوئی ذہنی جملہ کہہ کر اسے مالا مال

کر دیتا۔ وہ ہفتوں مہینوں اس جملے کو سوچ سوچ کر خوش ہوتی رہتی تھی لیکن وہ بات کر

کے بالکل انجان بن جاتا تھا۔ اس نے خود ایسی ہی باوقار محبت کی خواہش کی تھی، پھر پتا نہیں کیوں اس کا دل ہر وقت بھرا رہتا، کچھ سننے کو دل کرتا۔ پتا نہیں، وہ کیا سننا چاہتی تھی کیا چاہتی تھی۔ کرن نے ایک بار کہا تھا۔

”ندو! تو نے اپنے لئے کانٹوں بھری راہ چنی ہے۔“

یہ کانٹوں بھری راہ اسی کے حصے میں کیوں آئی تھی۔ لوگ تو آرام سے ساری زندگی پھولوں بھرے راستے پر چل کر گزار دیتے ہیں۔

بی۔ اے کے امتحان کے بعد وہ اسلام آباد آگئی تھی۔ اور اس کے اسلام آباد آنے کے چند دن بعد ہی پایا آگئے تھے۔ وہ اپنی تبلیغی جماعت کے ساتھ آئے تھے۔ اس نے ضد کی کہ وہ ان کے ساتھ جائے گی۔ وہ ان کے ساتھ ان کے پاس رہنا چاہتی تھی۔ کتنے سارے سال اس نے ہوشیاری میں گزار دیئے تھے وہ ماما کے ساتھ اپنے دکھ سکھ شیر کرنا چاہتی تھی۔ ان سے بی جان کی طرح باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اب بڑی ہو گئی تھی اور اس عمر میں تو ماں بیٹی ایک دوسرے کے دکھ سکھ کی شریک ہو جاتی ہیں، سہیلیوں کی طرح۔

وہ ماما کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ تین چار ماہ تھے اس کے پاس اور وہ یہ سارا وقت ان کے پاس گزارے گی۔ ان کے ساتھ۔

رزٹ کے بعد پھر اسے یہیں آ جانا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جرنلزم میں ایم اے کرے گی۔

دو مزید طویل سال ابھی اُسے ہوسٹل میں گزارنے تھے اور اب ان لمحوں کو وہ ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پھر پایا نے بتایا تھا کہ ماما کچھ بیمار ہیں۔ وہ انہیں آنٹی کی طرح کھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ان کے پاس اتنی دیر سے نہیں پہنچنا چاہتی تھی کہ پھر سوائے بچپتاؤں کے اور کچھ باقی نہ رہے۔

سنی ماموں اس کے کاغذات وغیرہ اوکے کر وارہے تھے اور پایا اسے ساتھ لے کر پھوپھو کے پاس آگئے پھوپھو بڑی محبت سے ملیں، بار بار اس کی پیشانی کو چومتیں۔ ٹیپو کی پوسٹنگ سیالکوٹ ہو گئی تھی۔ شیردل بھی آیا ہوا تھا۔ دونوں چھوٹے ابھی پڑھ رہے تھے۔ پھوپھو، شیردل کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ اپنی مخصوص بیڑی پر بیٹھ کر حقہ پیتے ہوئے انہوں نے پایا سے کہا تھا۔

”بھائی، دل چاہتا ہے، اب شیردل کی شادی کر دوں۔“ پھر انہوں نے کچھ ایسی نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ گھبرا کر وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ اور جاتے جاتے اس نے سنا تھا۔ پایا کہہ رہے تھے۔

”ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے صرف اٹھارہ سال کی اور وہ ایم اے کرنا چاہتی ہے۔ اور آپ کو پتا ہے، ہمیشہ سے میری یہ خواہش رہی ہے کہ میں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں۔“ اور وہ تیزی سے صحن میں آگئی تھی۔ پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے وہ دیہن صحن میں بکھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ پھوپھو کا گھبراہٹ بہت صاف ستھرا ہو گیا تھا اور اب ہر طرف بے تکلفی سے گھومنے والی مرغیاں بھی نہیں تھیں اور صحن میں ہی ایک طرف دو نئے کمرے بن گئے تھے شیردل اور ٹیپو کا کمرہ۔ اس نے صحن میں بیٹھے بیٹھے چور نظروں سے برآمدے کی طرف دیکھا۔ پایا اور پھوپھو اس کی طرف پیٹھ کئے چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔

”نہیں۔“

وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ بھلا شیردل اور میں۔

مبشر حسن گہری گہری نظروں سے اسے دیکھتا اس کے تصور میں چلا آیا۔

اور یہ تو زیادتی ہے کرن کے ساتھ۔ میں نے کرن کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میں شیردل سے اس کی سفارش کروں گی لیکن کیا کیا کہوں گی میں اس سے اور ادھر اگر پایا

نے فیصلہ کر دیا تو۔ نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہئے اور وہ ایک دم اٹھ کر شیر دل کے کمرے میں چلی گئی۔ شیر دل نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں وہ چور کرسی پر نیم دراز کوئی اخبار دیکھ رہا تھا، سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”آؤ دنیا!“ اس کے سرخ و سپید چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

لمحہ بھر وہ کچھ سوچتی رہی۔ پھر یکایک ہی اس کے اندر وہی اعتماد پیدا ہو گیا جس اعتماد کے سہارے اس نے بڑے بڑے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے پرائز جیتے تھے۔

”شیر دل!“ اس نے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ”تمہیں پتا ہے پایا اور پھوپھو باہر کس موضوع پر بات کر رہے ہیں؟“

”ہاں کچھ اندازہ تو ہے۔“ اس کی آنکھوں کی چمک گہری ہو گئی اور والہانہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

بے چینی سے اس نے اپنے ہاتھوں کو مسلا۔

”شیر دل! تمہیں پتا ہے میری فرینڈ کرن تمہیں بہت پسند کرتی ہے۔“

”تو؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ تم سے محبت کرتی ہے۔“

”لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ شیر دل اٹھ کے اس کے قریب چلا آیا۔

”فرق پڑتا ہے۔ شیر دل! تم پھوپھو سے کہو کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔“

”بے وقوف لڑکی۔“ شیر دل کے لمبے میں جانے کیا تھا کہ اس کی پلکیں جھک گئیں

اور دل دھڑکنے لگا۔ وہ اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اپنی پوری وجاہت اور دلکشی کے

ساتھ، محبت سے اسے تکتا ہوا۔ کرن نے صحیح کہا تھا کہ وہ ایک وجیہہ مرد ہے۔ ”کیا؟“

اپنی فرینڈ کے لئے قربانی دے رہی ہو۔

”نہیں۔“ وہ تھوڑی سی پیچھے ہٹ گئی۔ ”در اصل میں نے تمہارے متعلق ایسا کچھ

نہیں سوچا اس طرح میرا خیال ہے۔ میں تمہارے ساتھ خوش نہیں رہ سکوں گی اور تمہیں شادی تو کرنا ہی ہے نا تو پھر کرن کے ساتھ ہی کیوں نہ کر لو جو تمہیں اتنا پسند کرتی ہے۔“

شیر دل کے مسکراتے ہونٹ بھینچ گئے تھے۔ اس کی آنکھیں ایک دم دھواں دھواں ہو گئی تھیں۔ وہ بغیر کچھ کہے واپس اپنی جگہ پر چلا گیا اور وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

پھر جتنے دن وہ وہاں رہی، شیر دل سے اس کا سامنا نہ ہوا۔ جانے وہ کہاں رہتا تھا اور پھر تین ماہ انگلینڈ میں گزار کر جب وہ واپس آئی تو پھوپھو اس کی منتظر تھیں تاکہ اس کے ساتھ کرن کے گھر جا سکیں۔

”میرا دل تو تھا کہ تیرا اور شیر دل کا بیاہ کرتی۔“ انہوں نے بڑی ادا سی سے کہا تھا۔

پر.....“

اور اس نے نگاہیں چرائی تھیں پھر کرن بیاہ کر پھوپھو کے گھر آ گئی، سمیرا کی بھی

شادی ہو گئی تھی اور اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ سمیرا اور کرن کے بغیر

اس کا دل نہیں لگتا تھا وہ گھنٹوں یونہی بستر پر لیٹی لائینی باتیں سوچتی رہتی تھی۔ انگلینڈ

میں ماما کے پاس جا کر بھی وہ ان سے دور ہی رہی تھی۔ ماما صبح سویرے جاب پر نکل جاتی

تھیں پھر گھر آتیں تو اتنی تھکی ہوتی تھیں کہ بمشکل ڈنر تیار کر پاتیں اور لیٹ جاتیں اور

وہ سوچتی ہی رہ جاتی کہ ان کے پاس بیٹھے ان سے باتیں کرے۔ انہیں بی جان آنٹی،

کرن اور سمیرا کے متعلق بتائے۔

اور انہیں مبشر حسن کے متعلق بتائے۔

کہ وہ ایک شخص اسے اچھا لگنے لگا ہے۔

مگر شاید ان کے درمیان فاصلے پیدا ہو گئے تھے۔

دور یوں نے انہیں ایک دوسرے سے دور کر دیا تھا۔

ہاں، پیپا سے اس کی کچھ دوستی ہو گئی تھی۔

کبھی کبھی رات کو وہ دیر تک ان کی اسٹڈی میں بیٹھی ان سے باتیں کرتی رہتی۔ وہ اس کی کامیابیوں پر بہت خوش ہوتے تھے۔ پیپا کی قربت سے اس کے اعتماد میں اضافہ ہوا تھا۔ اور اسے محسوس ہوا تھا جیسے پیپا کا بخشا ہوا یہ اعتماد آئندہ زندگی میں اس کے بہت کام آئے گا۔

وہاں انگلینڈ میں ہی ایک روز اسے ہنی بابا بھی ملا تھا۔ ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور سے کچھ خریدتا ہوا۔

وہ دلکش آنکھوں والا مسز فیروز کا ہنی بابا۔ جس کی آنکھوں میں اس روز ایک آنسو منجمد ہو گیا تھا۔

اور اس نے چاہا تھا کہ وہ اس آنسو کو اپنی انگلی کی پوروں سے پونچھ ڈالے۔ اب اسے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں شاپنگ کرتے دیکھ کر وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھ گئی تھی۔

نیلی جینز پہنے اور بکھرے بالوں کے ساتھ وہ اسے اس دن والے لڑکے سے مختلف لگا لیکن اس کی دلکش آنکھوں میں کسی نامعلوم محرومی کا دھواں اسی طرح پھیلا ہوا تھا۔

اور اس ایک منجمد آنسو نے اس کی آنکھوں کی جھیلوں کو ڈھانپ رکھا تھا یوں جیسے سطح پر دھند چھائی ہو اور دھند کے پیچھے پانی کا شور۔

تو وہ ایک منجمد آنسو پگھلا نہیں تھا بلکہ اس کی آنکھوں میں ہی ٹھہر ا ہوا تھا۔

”ہنی بابا۔“ بالکل قریب جا کر اس نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس نے حیران نظروں سے اس اجنبی لڑکی کو دیکھا تھا جو آنکھوں میں محبتوں کے خزانے چھپائے اسے تک رہی تھی۔

وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ویک اینڈ گزارنے آیا ہوا تھا۔ اس نے اس بکھرے بکھرے لڑکے کو اپنی محبت کے حصار میں لے لیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ گھرائی تھی

اور پیپا اور ماما سے ملایا تھا۔

”سنو پیپا رے لڑکے! میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ میرے بھائی بن جاؤ۔“

اور اس لڑکے نے اس کا پر خلوص ہاتھ تھام لیا تھا اور یوں جب وہ انگلینڈ سے آئی تھی تو اس کے ساتھ ایک بھائی کی محبت بھی تھی۔ وہ بہت سادہ دل لڑکا تھا، چند ہی دنوں میں وہ اس سے بے تکلف ہو گیا تھا اور اس نے اس سے اپنے دل کی ساری باتیں کی تھیں۔ جس روز وہ واپس امریکا جا رہا تھا وہ اسے ایئر پورٹ پر چھوڑنے گئی تھی۔

”بجوا!“ اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس روز میں ماما کی بے اعتنائی کا جو دکھ لے کر لوٹ رہا ہوں، اس دکھ کو کسی اور نے بھی محسوس کیا ہے۔“

بجوا پلیر! اب..... ہمیشہ میرے ساتھ ایسی ہی محبت کرنا۔“ اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے خط لکھا کرے گی اور وہ بھی جب پاکستان آئے گا تو اس سے ملنے آیا کرے گا اور یوں انگلینڈ سے جب وہ لوٹی تو اس کے ساتھ ایک بھائی کی محبت بھی تھی۔

یہ محبت بڑی پیاری تھی، بڑی دلکش، یوں جیسے تیز کڑکتی دھوپ میں سیاہ گھنیرے بادل۔

وہ بڑی باقاعدگی سے اسے خط لکھتا تھا۔

اور ہوٹل میں اس کے خط پا کر وہ بہت خوش ہوتی تھی۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے بعد ایک دن اچانک سر راہ مبشر اسے مل گیا تھا وہ کچھ ضروری کتابیں لینے اردو بازار جا رہی تھی۔

”کیسی ہونا درہ؟“ اس کے بالکل قریب گاڑی روکتے ہوئے اس نے یوں بات کی تھی جیسے چند دنوں بعد ملا ہو۔ حالانکہ وہ پورے آٹھ ماہ بعد اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ایک دم نرم ہو گئی تھیں۔ اور اس نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روکنے کی

کوشش کی تھی۔

”کیا کر رہی ہو آج کل؟“ اس کے لئے نیچے اتر کر دروازہ کھولتے ہوئے اس نے

پوچھا تھا۔

اور خاموشی سے بغیر کچھ کہے وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔

اس کے نمبروں کی تفصیل سن کر اس نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اور پھر اسے اردو بازار سے خود شاپنگ کروا کے ہوٹل چھوڑ گیا تھا پھر اس کے بعد بھی کئی بار وہ اُس سے ملا تھا وہ بھی کبھی کبھار اس کی طرف چلی جاتی تھی۔ خود بخود ہی بغیر کہے، بغیر اظہار کے ان کے درمیان ایک نامعلوم سی دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ وہ ملتے، باتیں کرتے اور جدا ہو جاتے۔ کبھی وہ بہت اپ سیٹ ہو تا اور یونہی اسے ساتھ لے کر لمبی ڈرائیو پر نکل جاتا۔ اس نے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں بولتی تھیں۔

کبھی کبھی وہ یوں دار فنگی سے اسے تکتا کہ اسے اس کے قریب کھڑا ہونا مشکل ہو جاتا۔ خود نادرہ نے کبھی اس طرح کی کوئی چھچھوری حرکت نہیں کی تھی کہ اسکی کسی بات سے اس بات کا اظہار ہو کہ وہ اس کے دل پر کس طرح قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ لیکن کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے اندر محبت کی آگ جل رہی ہے۔

اور کیا اسے اس کی تپش محسوس نہیں ہوتی۔

اس نے اکثر سوچا تھا اور اس کے دل نے اسے یقین دلایا تھا کہ یہ تپش ضرور اس کے دل تک پہنچ چکی ہے اور محبت کرنے کا نصف تو اسی طرح ہے۔

یونہی چپکے چپکے کسی سے محبت کرنا۔



آج وہ بہت دنوں بعد اس کے دفتر میں آئی تھی۔ اس کا فائنل امتحان ہونے والا تھا۔ اور پھوپھو، ٹپو کے لئے اسے مانگ رہی تھیں۔ پاپا نے اسے خط لکھا تھا۔ وہ اس کی

رائے جانا چاہتے تھے اور انہوں نے اسے اس بات کا اختیار دیا تھا کہ اگر ٹپو سلطان اسے پسند نہیں ہے تو وہ بلا جھجک بتا دے لیکن اس کی کوئی وجہ بھی تو ہونا۔ وہ پاپا کو کیا لکھے کہ اسے ٹپو سلطان کا ساتھ کیوں پسند نہیں ہے۔ کیا وہ پاپا کو لکھ دے کہ وہ مبشر حسن.....

مگر مبشر نے تو آج تک اس طرح کی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس سے آشنائی کے ان طویل برسوں میں سوائے چند ذمہ داری جملوں کے اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کوئی دلیل نہیں تھی..... اور کیا خبر وہ ایک طرفہ محبت کی آگ میں جل رہی ہو اور تب وہ پریشان سی یونیورسٹی سے سیدھی اس کے آفس چلی آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ آج اس سے بات کرے گی اور اب اتنی دیر سے بیٹھی اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی۔

کر دو جو بات کرنی ہے۔

کر دو جو بات کرنی ہے۔

مگر کیا بات کرے ویسے بھی وہ آج اپ سیٹ تھا۔ کبھی کبھی اس پر یہ موڈ طاری ہو جاتا تھا وہ یونہی اپنے انجی کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ اپنے آپ میں گم اور بے خبر سا۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ گہری والہانہ نظروں سے۔

”سنو نادرہ! تم بہت خوبصورت ہو بہت۔“ اس نے سرگوشی سی کی اور نادرہ کا دل جیسے سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آنے لگا۔ رخسار دیکھنے لگے۔ وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا اور پھر پیچھے ہٹ کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا اور پردا ہٹا دیا۔

”بہت..... بہت گھٹن ہے چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔“

وہ کھڑی ہو گئی۔ بہت دیر تک خاموشی رہی، وہ اپنا مخصوص شعر گنگنا تا رہا۔

کس سے کہوں کہ آج مرے ساتھ آ کے پی۔

اور گاڑی تپتی دوپہر میں ایک سڑک سے دوسری سڑک پر مڑتی رہی۔

”آپ کبھی کبھی بڑے پریشان ہو جاتے ہیں۔“ کافی دیر بعد نادرہ نے پوچھا۔ وہ اس کے جملے کے سحر سے باہر نکل آئی تھی۔

”ہاں، کبھی کبھی لگائیں چھوٹ جاتی ہیں۔“

”مگر کیوں؟“

”کیوں؟“ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیا تم نہیں جانتیں کہ میں نے..... پھر بات ادھوری چھوڑ کر وہ ونڈا سکرین سے باہر دیکھنے لگا۔

”پلیز آپ مجھے بتائیں، مجھے اپنی پریشانیوں میں شریک کریں۔ کیا آپ مجھے اپنا دوست نہیں سمجھتے۔ ایک بار آپ نے کہا تھا کہ ہم اچھے دوست ہیں۔“

”ہاں، وہ تو ہیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

”پھر کیا بات ہے؟“ اس نے اصرار کیا۔

”تمہیں پتا ہے نادرہ! میں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ میں عوام کو بتاؤں گا کہ صحیح ڈراما کیا ہے۔ لیکن جب میری ساری تگ و دو ساری کوششیں رائیگاں جاتی ہیں تو بس اسی وجہ سے..... اور تمہیں پتا ہے۔“

اس نے یکدم موضوع بدل دیا۔ ”ابھی جب تم نہیں آئی تھیں تو میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم کہیں سے آ جاؤ اور تم آ گئیں۔ ہے نا عجیب بات۔“ وہ ہنس دیا۔

”میں یونیورسٹی سے سیدھی ادھر آئی تھی، بس یکدم دل چاہا تھا آپ سے ملنے کو۔“

”اے کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں یاد کیا اور تم..... ارے پھر تو تم نے کھانا بھی نہیں کھایا ہو گا۔ چلو کسی اچھے سے ہوٹل میں لے جاتے ہیں۔“

اور پھر فیملی کیبن میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے نادرہ نے پایا کا خط نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

خط پڑھ کر اس نے خاموش سے نادرہ کو واپس کر دیا اور پوچھا۔ ”ٹیپو سلطان کیسا ہے؟“

”اچھا ہے۔“

”پھر تم پریشان کیوں ہو؟“

”میں۔“ نادرہ نے نگاہیں اٹھائیں۔ لمحہ بھر اسے دیکھتی رہی۔ ”میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”کیوں؟“

کس قدر انجان بن رہا ہے۔ نادرہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”کیا وہ اس کے احساسات کو نہیں سمجھتا اور کرن کہتی ہے کہ محبت کا ادراک تو خود بہ خود ہو جاتا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ تمہارے احساسات سے بے خبر ہو، بنتا ہے بس۔“

”مجھے شادی نہیں کرنا۔“ اس نے نظریں جھکا لیں کہ کہیں وہ اس کی آنکھوں میں پھیلتی نمی کو نہ دیکھ لے۔

”ننانوے فیصد لڑکیاں یہی کہتی ہیں۔“ وہ ہنسا۔ ”لیکن شادی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔“

”مگر مجھے شادی نہیں کرنا۔“ اس کے لہجے میں سختی آگئی تھی۔

”اچھا بھئی نہ کرنا۔ دراصل تم اندر سے ابھی وہی سولہ سترہ سالہ بچی ہو۔“

”جی نہیں۔“ وہ چڑ گئی۔ ”میں بچی نہیں ہوں۔“ پھر اس نے ٹشو پیپر کو بیدردی سے کھینچا اور ہاتھ صاف کر کے کھڑی ہو گئی۔ ”چلیں، مجھے ہوٹل ڈراپ کر دیں۔“

”آل رائیٹ۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

اور ہوٹل آکر اپنے بستر پر گر کر وہ خوب روئی۔ کیا چاہتی تھی وہ آخر کس لئے وہ اس کے پاس گئی تھی۔ کیا وہ یہ سننا چاہتی تھی کہ نادرہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم ٹیپو سلطان سے شادی مت کرو۔

”میں۔“ ہاں شاید یہی سننا چاہتی تھی۔ ”اس کے احساس کے آئینے پر شدید ضرب



لگی تھی۔ کرچی کرچی ہو رہی تھی وہ مسلسل رونے کے بعد وہ اٹھی اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ وہ کتنی بے تحاشا خوبصورت تھی۔

اس کی سیاہ لائنی پلکوں والی بادامی آنکھیں، اس کی خوبصورت سی چھوٹی سی ناک۔ اس کے قاتل ہونٹ۔

اس کا دلکش سراپا۔

لا بنے گئے ریشمی بال۔

کیا کسی ایک چیز نے بھی اسے متاثر نہیں کیا تھا۔ اور وہ جو کبھی کبھی کا کہا ہوا ذوق معنی جملہ اور وہ اس کا یونہی بے مقصد اس سے ملنے آنا اور گھنٹوں ادھر ادھر کی لالچنی باتیں کرنا۔

”تو کیا یہ محبت نہیں تھی۔“

تو کیا محبت کچھ اور ہوتی ہے۔

اس کے رنگ ڈھنگ مختلف ہوتے ہیں۔

اور کیا مجھے محبت کی پہچان نہیں ہوئی۔

لیکن میرے دل میں تو اس کی محبت کی آگ جل رہی تھی اور کیا اس آگ سے صرف میرا ہی دل خاک سیاہ ہوتا رہا تھا اور اس تک اس کی تپش نہیں پہنچی تھی۔

وہ آئینے کے پاس سے ہٹ آئی۔ وہ بے حد مضطرب تھی، بہت بے چین، بار بار آنسوؤں سے اس کی پلکیں بھگ جاتیں۔

”شاید محبت اس طرح نہیں ہوتی۔“

اس طرح نہیں کی جاتی۔

میں شاید خوابوں کی دنیا میں رہتی ہوں۔ اس نے کبھی عمر بھر ساتھ نباہنے کی بات نہیں کی تھی پھر..... پھر میں نے کیوں محل تعمیر کر ڈالے اور اب۔ اب پایا کو کیا لکھوں۔“

وہ ساری رات جاگتی رہی۔ روتی رہی۔ صبح آمنہ حیدر نے اس کے کمرے میں

جھانکا۔

”نندا! تمہیں کوئی ملنے آیا ہے۔“

”شاید سنی ماموں ملنے آئے ہیں، اس نے سوچا اور یونہی دوپٹا کندھے پر ڈال کر باہر نکل آئی۔ گیٹ کے ساتھ ٹیک لگائے مبشر حسن کھڑا تھا۔

”آپ!“ وہ ششدر رہ گئی۔

”ہاں۔“ وہ کچھ نادم سا لگ رہا تھا۔ ”نادرہ! تم اپنے پایا کو لکھ دو کہ تم ٹیپو سلطان کے ساتھ شادی نہیں کر سکتیں۔“

”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”کیوں؟“ مبشر حسن نے اضطراب سے اپنے ہاتھوں کو مسلا۔ ”اس لئے کہ میں

کہہ رہا ہوں۔“

اس کے ارد گرد چاروں اور جیسے پھول کھل اٹھے۔

”اور سنو، یہ تم رات بھر جاگتی اور روتی کیوں رہی ہو؟“ ہمیشہ کی طرح اس نے بات بدل دی تھی۔

”نہیں تو۔“ وہ اس کے سامنے بے وقعت نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ یہ ظاہر نہیں کرتی چاہتی تھی کہ اس کی بے اعتنائی سے اسے رنج پہنچا تھا۔ وہ وقار سے اس کے سامنے سر اٹھا کر کھڑا ہونا چاہتی تھی۔

”اچھی پچیاں جھوٹ نہیں بولیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”مجھے پتا ہے۔ تم روئی تھیں۔“

”ریلی، میں روئی نہیں بلکہ مجھے فلو ہے۔“

”اچھا۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ڈاکٹر کے پاس لے چلو؟“

”نہیں۔“ اس نے چہرہ جھکا کر اپنی بے اختیار مسکراہٹ کو چھپالیا۔

”اچھا۔“ خدا حافظ، میں چلتا ہوں پایا کو خط لکھ دینا۔“

”لیکن کیوں؟“ وہ شوخ ہونے لگی۔

”اس لئے کہ.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ”سنو نادرہ، میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں کیا تم بھی۔“

اور اس کا چہرہ جھکتا چلا گیا۔

”تھینک یو۔“ اس نے تھوڑا سا خم کر کے شکریہ ادا کیا اور واپس پلٹ گیا۔

اس روز وہ یونیورسٹی نہیں گئی، وہ اس خوشی کو بھرپور طور پر اکیلے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ تو اس کی ریاضت رائیگاں نہیں گئی تھی۔

اس آگ کی پیش اس کے دل تک ضرور پہنچی تھی جیسی تو..... جیسی تو۔

وہ کتنا سو برا اور باوقار تھا۔

اور اس کی محبت بھی اسی کی طرح تھی۔

باوقار اور میچور محبت۔

جو لفظوں اور جملوں کی محتاج نہ تھی۔

لفظوں سے بے پردہ۔

بڑے بڑے ڈائلاگز اور فضول باتوں سے پاک۔

شاید وہ بھی ساری رات نہیں سویا تھا۔

اس کی محبت میں بھی تڑپ تھی، شدت تھی۔ جب ہی تو وہ صبح ہوتے ہی بھاگتا چلا

آیا تھا۔

وہ تیزی کی طرح سارا دن ہوٹل میں چکراتی پھری، خوشی اس سے سنبھالے

نہیں سنبھل رہی تھی۔ اس نے پایا کو خط لکھ دیا تھا اور ہنی بابا کو بھی جو اس کا پیارا سا چھوٹا

سابھائی تھا۔

وہ جو کرن اور سمیرا کو اپنے رازوں میں شریک نہیں کرتی تھی، پتا نہیں کیوں وہ

بات اسے بتاتی تھیں پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنی خوشی میں انہیں شریک نہ کرتی۔

پاپا نے اس کا خط ملتے ہی شاید سنی ماموں کو فون کیا تھا کہ وہ ایک شام اچانک آگئے۔  
بے حد سنجیدہ اور پریشان سے۔

”ندو! یہ کیا بات ہے؟“

”کون سی بات؟“ وہ حیران سی ہوئی۔

”بھائی جان نے فون کیا تھا اور مبشر کے بارے میں پوچھا تھا۔“

”جی۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”مگر ندو! تمہیں پتا ہے موبی کی اور تمہاری عمروں میں کتنا فرق ہے اور پھر وہ شادی  
شدہ تھا اور شاید آج بھی ہمارے محبت کرتا ہے ہمارے ساتھ اس کی شادی.....“

”میں جانتی ہوں سنی ماموں مگر میں.....“

”کیا وہ بھی؟“ سنی ماموں نے پوچھا۔

”جی۔“

”کیا وہ تم سے ملتا رہا ہے؟“

”جی۔“

”ہم تو دوست تھے گڑیا! پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں شاید تمہیں روک  
لیتا۔ سمجھا لیتا۔ وہ.....“

”آپ کو میں کیا بتاتی سنی ماموں! آپ جو میرے دوست تھے، آپ تو آنٹی کے  
بعد کھو گئے تھے۔“

”مگر ندو! یہ صحیح نہیں ہے وہ تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔“ وہ اسے سمجھاتے  
رہے مگر اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

سنی ماموں نے جانے پاپا سے کیا کہا تھا کہ پاپا اور ماما خود چلے آئے تھے۔ ماما نے زندگی

میں پہلی بار اسے اتنا وقت دیا تھا کہ کئی کئی گھنٹے اس کے پاس بیٹھ کر اسے سمجھایا تھا لیکن سب بے سود تھا۔ تب پایا اس سے ملے۔ انہیں وہ اچھا ہی لگا اور انہوں نے اس کا فیصلہ تسلیم کر لیا لیکن سنی ماموں بدستور پریشان تھے اور اسے قائل کرنے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے۔

”میں تجھے کیسے بتاؤں ندیا کہ تیرے جیسی آئیڈیلٹک لڑکی کے لئے موبی صحیح نہیں ہے۔ وہ اچھا ہے۔ بہت اچھا لیکن ندو.....“

مگر وہ تو کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔

پاپا نے اس کی بات مان لی تھی۔

ماما نے اس کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔

حالانکہ انہیں ٹیپو سلطان بہت پسند تھا۔

آرمی کی وردی میں نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت لگتا تھا۔

کرن نے صرف ایک بات کہی تھی۔

”سوچتی ہوں ندو! تو جو محبت کے بارے میں اتنے نازک احساسات رکھتی ہے۔

کہیں دھوکا نہ کھا بیٹھی ہو۔ وہ اپنی ساری محبتیں لٹا چکا ہو۔ اس کے پاس تیرے لئے اتنے

شدید جذبے نہ ہوں جن کی تجھے چاہ ہے۔“

”نہیں کرن!“ اس نے بڑے یقین سے کہا۔ ”آدمی کے دل میں محبتوں کے لئے

گنجائش ہوتی ہے اور مجھے یقین ہے، اس کے دل میں بھی میرے لئے اتنی ہی شدید

چاہت ہے جتنی میرے دل میں اس کے لئے ہے۔ بس وہ یگ لڑکوں کی طرح چھچھورا

نہیں ہے۔ وہ باوقار طریقے سے محبت کرنا جانتا ہے۔“

بابا نے جانے سے پہلے مبشر حسن کو بلا کر کہا تھا کہ نادرہ کے امتحان کے بعد وہ

پاکستان آئیں گے اور اسے رخصت کر دیں گے۔ پھر پاپا چلے گئے، وہ پڑھائی میں

مصروف ہو گئی۔ مبشر حسن دو تین بار اس سے ملنے آیا لیکن اس کے رویے سے کچھ بتا نہیں چلتا تھا کہ وہ خوش ہے یا نہیں۔ ہمیشہ کی طرح لمبی ڈرائیو پر جانا کسی اچھے سے ہوٹل میں لُنج یا ڈنر پھر ادھر ادھر کی باتیں اور بس۔ اس کے امتحانات سے کچھ دن پہلے وہ باہر چلا گیا۔ وہ اسے ’خدا حافظ‘ کہنے چند منٹ کے لئے آیا تھا اور وِش کر کے چلا گیا تھا۔

اور اس نے خود کو پڑھائی میں گم کر دیا کیونکہ وہ اپنا آخری امتحان بھی شاندار نمبروں سے پاس کرنا چاہتی تھی۔



کس سے کہوں کہ آج میرے ساتھ آ کے پی۔

اتریں گے کس کے حلق سے یہ دلخراش گھونٹ۔

کس سے کہوں کہ آج.....

وہ بڑی دیر سے لان میں آرام کر سی پر نیم دراز تھی اور اس کے لب ہولے ہولے

بل رہے تھے پلکیں نم تھیں۔

”ندو!“ سنی ماموں نے اس کے قریب آ کر آہستگی سے پکارا۔ ”اتنی ٹھنڈ میں باہر

بیٹھی کیا کر رہی ہو.....!“

”کچھ نہیں۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”آپ کب آئے؟“

”بہت دیر سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ ندیا، میری جان، میری زندگی! اب بھی پلٹ

آؤ۔ وہ شخص قابل اعتبار نہیں ہے۔“

”سنی ماموں پلیز، آپ نے اس روز مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ آئندہ اس

موضوع پر بات نہیں کریں گے۔“

”کیسے..... کیسے نہ کروں بات۔“ انہوں نے پریشانی اور اضطراب سے ہاتھ ملے

مجھ سے تمہاری یہ بربادی نہیں دیکھی جاتی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں تم نے یہ کیا روگ لگا

لیا ہے خود کو۔“

”کوئی روگ نہیں سنی ماموں، آپ سے میں نے جاب کے لئے کہا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟“ اس نے بات بدلتے ہوئے سوال کیا۔

”جاب! لیکن بھائی جان تمہیں انگلینڈ بلا رہے ہیں۔“

”نہیں سنی ماموں، میں وہاں نہیں جاؤں گی، وہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ میں یہاں رہوں گی آپ کے پاس۔ پلیز سنی ماموں۔ مجھے خود سے جدا نہ کریں۔“

”اچھا، اچھا بات کروں گا میں بھائی جان سے۔“ انہوں نے اسے تھپکی دی پھر بولے۔ ”چلو واک کر آئیں۔ یہ سامنے بڑی سڑک تک جا کر مڑ آئیں گے۔“

”چلیں۔“ وہ بھی کھڑی ہو گئی۔



مبشر حسن نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ وہ امتحان سے فارغ ہو کر اسلام آباد آگئی تھی لیکن اس کی کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے۔ پایا کئی بار پوچھ چکے تھے۔ پھر اس کا رزلٹ آیا تو اس نے پہلی پوزیشن لی تھی۔ ایک چھوٹا سا دوش کارڈ ایک دن پوسٹ میں اسے دے گیا۔ اس نے کتنے اشتیاق سے لفافہ کھولا تھا مگر کچھ نہیں، نہ کوئی القاب نہ کوئی پیام۔ کونے میں اس کے دستخط تھے اور اوپر کا گریجویٹ لکھا تھا۔ کارڈ لاہور سے آیا تھا وہ لاہور جانے کو بے تاب ہو گئی اور سنی ماموں کے ساتھ لاہور چلی آئی لیکن وہ تو بالکل اجنبی لگ رہا تھا۔ یونہی سرسری سا اس نے اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر سنی ماموں سے باتیں کرنے لگا تھا سنی ماموں نے اسے بتایا تھا کہ بھائی جان اس کے متعلق کئی بار پوچھ چکے ہیں لیکن اس نے سنی ماموں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اپنے اس طرح نظر انداز کئے جانے پر اس کا دل کٹ رہا تھا لیکن وہ چپ بیٹھی رہی۔ اور کچھ ہی دیر بعد یونیورسٹی جانے کا بہانہ کر کے وہ سنی ماموں کو وہیں چھوڑ کر چلی آئیں۔

اور اگلی صبح وہ واپس اسلام آباد آگئی تھی اور چھ ماہ ہو گئے تھے۔ مبشر حسن نہ تو اسلام آباد آیا تھا اور نہ ہی کوئی فون کیا، نہ خط لکھا اس نے جیسے وہ ایک بات کر کے بھول گیا تھا۔ سنی ماموں اکیلے دو تین بار لاہور گئے تھے لیکن انہوں نے ندیا سے اس کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔ پتا نہیں، وہ کیسا تھا اور کہاں تھا اور اس نے نادرہ کو ایک دم فراموش کیوں کر دیا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسے خط لکھے، اس سے پوچھے کہ وہ اس کے دل میں محبت کی آگ جلا کر انجان کیوں بن گیا ہے لیکن پھر اس نے دل کی بات کو رد کر دیا۔

نہیں وہ اس طرح نہیں کر سکتی۔ اس نے کبھی اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اور نہ ہی مبشر نے اس سے کبھی اس طرح بات کی تھی۔ اپنی محبت کے دعوے۔

عمر بھر ساتھ نباہنے کی قسمیں۔

کچھ بھی تو نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں تھا، اس کے پاس، سوائے چند ذمہ جملوں کے اور اس کی اس خواہش کے کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور بس۔

مگر وہ انہی کے سہارے عمر بتا دے گی۔

یہی چند جملے تو اس کی کائنات تھے۔

اس کا سرمایہ تھے۔

وہ بار بار دل ہی دل میں ان گئے چنے جملوں کو دہراتی اور ان سے نئے نئے معنی نکالتی۔ یہ محبت نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ وہ کسی دن اچانک ہی چلا آئے گا مسکراتا ہو اور پھر رخصتی کا تقاضا کرے گا۔ یقیناً وہ اپنے کسی ڈرامے میں الجھا ہوا ہو گا۔ ”یقیناً کوئی نیا اور منفرد خیال اسے الجھائے ہوئے ہو گا اور جب تک وہ اس خیال کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنا لے گا، یونہی اپ سیٹ رہے گا۔ اور پھر جب سب کچھ اس کی

مرضی کے مطابق ہو جائے گا تو وہ اس کی طرف دوڑا چلا آئے گا۔

بڑی سڑک کا موڑ مڑتے ہوئے سنی ماموں نے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا سوچ رہی ہو ندو!“

”کچھ نہیں۔“ وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

”ندیا!“ سنی ماموں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”جو کشتیاں اپنی نہ ہوں ان پر چلنا بہت مشکل ہوتا ہے گڑیا۔ موبی کبھی بھی تمہارا نہیں ہو سکتا۔ وہ آج بھی ہمارے محبت کرتا ہے۔ اتنی ہی شدید جتنی آج سے دس سال پہلے کرتا تھا۔ میں نہیں جانتا اس نے کس جذبے کے تحت تم سے شادی کا فیصلہ کیا ہے لیکن میں جتنی بار بھی اس سے ملا ہوں، اسے اپنی محبت میں روز اول کی طرح بختہ پایا ہے۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ کو ہولے سے دبایا اور دوبارہ بولے۔ ”ندو! میں اس مینے میں کوئی تین بار اس کے پاس گیا ہوں اور اسے خوبصورت لڑکیوں میں گھرا پایا ہے۔ وہ.....“

”سنی ماموں پلیز!“ اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ”آپ پلیز، مجھے یہ سب نہ بتائیں۔“

میں کچھ نہیں جانتی، سوائے اس کے کہ مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔ کسی سے بھی نہیں۔“

”آل رائیٹ ندیا۔ پھر کبھی جب تم کچھ سنبھل جاؤ گی تو ہم اس موضوع پر بات

کریں گے علی حیدر اچھا لڑکا ہے۔ اور مسٹر حیدر تمہارے لئے خواہش مند ہیں۔ مگر میں

ان سے کہہ دوں گا کہ ابھی نہیں۔ ابھی تم سوچ لو۔ سمجھ لو۔“

اس رات وہ بہت اپ سیٹ رہی۔ اس نے اپنے آپ کو اسی طرح اکیلا اور تنہا

محسوس کیا جس طرح بی جان کی موت کی خبر سن کر کیا تھا۔ دیواریں اسے اپنے اوپر گرتی

ہوئی محسوس ہوتی رہیں۔ عجیب طرح کا خوف اس پر مسلط ہونے لگا۔ ایک بار اس کا جی

چاہا، وہ سنی ماموں کو بلائے لیکن وہ اپنے بستر پر بیٹھی لرزتی کانپتی رہی اور پھر دونوں

ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

”کیا تھا جو اگر مبشر اسے اس طرح نظر انداز نہ کرتا۔“

اس طرح خواب دکھا کر۔

امید دلا کر۔

کیا پتا سنی ماموں کو غلط فہمی ہوئی ہو۔

وہ ایسا نہ ہو جیسا سنی ماموں سمجھ رہے ہیں۔

جب وہ بہت روچکی تو اس نے قلم اٹھایا۔ کتنے سارے دن ہو گئے تھے۔ اپنی پریشانی

میں اس نے ہنی بابا کو خط بھی نہیں لکھا تھا۔ وہ یقیناً اس کے خط کا انتظار کرتا ہو گا اور

جب اس کا خط نہیں ملتا ہو گا تو کتنا پریشان ہو جاتا ہو گا وہ ایسا ہی تھا چھوٹے سے دل والا۔

”ہنی بابا۔“ اس نے اسے لکھا۔ ”مجھے حوصلہ دو، مجھے تسلی دو ورنہ میرا دل غم سے

پھٹ جائے گا۔ تم میرے پیارے سے چھوٹے سے منے سے بھائی ہو۔ ہنی بابا اور تم میرے

سب سے گہرے دوست بھی ہو۔ میں اپنا دکھ کس سے کہوں۔ علی حیدر یقیناً بہت اچھا ہو گا

لیکن وہ مبشر حسن نہیں ہو سکتا اور میں۔۔۔ میں تمہیں کس طرح بتاؤں کہ میں.....“

اور ہنی بابا جو اسے اپنی سگی بہنوں، سے بڑھ کر چاہتا تھا اور جس نے صرف اس کی

محبت پا کر محسوس کیا تھا کہ اس کی ساری محرومیوں کا ازالہ ہو گیا ہے۔ اس کا خط پا کر فوراً

ہی پاکستان چلا آیا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”خوشی اور مسرت سے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔“

ہنی نے بالکل بڑے بھائیوں کی طرح اس کا سر سینے سے لگایا اور اس کی پیشانی کو

بوسہ دیا۔

”اتنا۔ اتنا چھوٹا دل ہے آپ کا۔ ارے میں تو آپ کو بڑا با حوصلہ سمجھتا تھا۔ آپ تو

مجھے سمجھاتی تھیں اور یہ لمبے لمبے خط لکھتی تھیں۔“

”تم کتنے بڑے بڑے لگنے لگے ہو ہنی۔ کتنے لمبے ہو گئے ہو اور تم کیسے آگے

اچانک؟“ اس نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے سوال کیا۔

”آپ کا خط ملا اور میں آگیا۔ آپ پریشان ہوں اور میں وہاں بیٹھا ہوں۔“

”مگر تمہاری پڑھائی؟“ وہ پریشان ہو گئی۔

”چھٹیاں تھیں میں نے دادا کو فون کیا، میں ان کے لئے ادا اس ہوں اور میں اگر ان سے

نہ ملا تو پھر پڑھ نہ سکوں گا۔“ بیمار ہو جاؤں گا۔ دادا نے کہا، بیٹے چند دن کے لئے آجاؤ۔“

”بڑے چالاک ہو۔“ وہ ہنس دی۔

”اچھا، اب آپ مجھے سارا مسئلہ بتائیں پھر میں دیکھوں گا، مجھے کیا کرنا ہے؟“

”تم کیا کرو گے ہنی!“ وہ حیران تھی۔

”یہ آپ دیکھنا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”تم..... تم مبشر سے ملو گے؟“

”ظاہر ہے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”تم کیا کہو گے اس سے؟“ وہ پریشان سی تھی۔

”یہ تو ان سے مل کر ہی پتا چلے گا۔“

”دیکھو ہنی! مجھے بھیک میں ملی ہوئی محبت نہیں چاہئے۔ میں اس طرح..... پلیز تم

سمجھو نا۔“

”میں آپ کا ہی بھائی ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کی نظریں کبھی ان کے

سامنے جھکنے نہیں دوں گا اور بھیک میں ملی ہوئی محبتیں میں نے بھی کبھی نہیں چاہیں۔

آپ اچھی طرح جانتی ہیں بجو کہ میں نے تو کبھی اپنی ماں.....“ اس کی خوبصورت

آنکھوں میں درد کروٹیں لینے لگا تھا۔

نادرہ نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔ پھر بولی۔ ”بی ایزی ہنی! آئی لو یو اور مجھے اس

بات پر کتنا فخر ہے کہ تم میرے بھائی ہو۔“

”اور مجھے بھی۔“ وہ ہنس دیا۔ ”پتا ہے بجو، میں کل ہی آیا ہوں اور صبح کی فلائٹ سے

ادھر چلا آیا۔ دادا شور ہی مچاتے رہے کہ ابھی تو انہوں نے جی بھر کے مجھے دیکھا بھی

نہیں اور میں بھاگ رہا ہوں مگر مجھے آپ کی فکر تھی اور میں نے دادا سے وعدہ کیا تھا کہ

شام کی فلائٹ سے واپس چلا آؤں گا۔“

اور پھر وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اور اس کی اس درجہ بے تحاشا محبت پر

اس کا دل بھر بھر آتا..... کون تھا وہ اس کا کیا لگتا تھا۔ محض ایک لفظی رشتہ اور وہ اس

لفظی رشتے کی خاطر سات سمندر پار سے چلا آیا تھا۔ کون کہتا ہے کہ لفظی رشتے جھوٹے

ہوتے ہیں۔ ناپائیدار اور کچے۔ کوئی دیکھتا کہ وہ جو اس کا کوئی نہیں تھا اس کا درد بٹانے اتنی

دور سے چلا آیا تھا۔ وہ سنی ماموں سے گھنٹوں اس کی باتیں کرتے نہ تھکتی۔ وہ تقریباً ہر روز

ہی اسے فون کرتا تھا۔ اسے تسلیاں دیتا اور سمجھاتا۔ جیسے وہ اس سے چھوٹا نہیں بڑا ہو۔

پتا نہیں، وہ کیا کرتا پھر رہا تھا، اس نے بتایا نہیں مگر ایک روز اس نے اسے فون کیا

کہ وہ تیار رہے۔ وہ اسے لینے آرہا ہے۔

”مگر ہنی! آج میرا انٹرویو ہے۔“

”کوئی انٹرویو نہیں۔ دادا آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور میری چھٹیاں ختم ہو رہی

ہیں۔ آپ کو جواب چاہئے نا تو وہ مل جائے گی۔“

اور وہ سچ سچ اگلے ہی دن اسے لینے آگیا۔

اس کے دادا بڑی محبت و شفقت سے اسے ملے۔

”میرے ہنی بابا کا کوئی دوست نہیں تھا۔ مجھے خوشی ہے بیٹا کہ اسے دوستوں جیسی

بہن مل گئی ہے۔“

اس روز کتنی بار اس کا جی چاہا وہ دادا سے مسز فیروز کے بارے میں سنی ہوئی کہانی کی

تصدیق کرے کہ کیا یہ سچ ہے کہ مسز فیروز نے اپنا ہنی بابا بہت سارے پیسوں، بہت

ساری جائیداد کے عوض انہیں دے دیا تھا۔

”مگر نہیں۔ اس نے سوچا۔ اگر یہ سچ ہوا تو اس کا دل اس انکشاف سے پھٹ جائے گا۔ وہ کچھ نہیں پوچھے گی کچھ نہیں نہ جاننا جان لینے سے ہزار درجے اچھا ہوتا ہے۔“  
 ہنی اسے اپنے گھر میں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا اور پھر شام کو وہ لمبی ڈرائیو پر چلے گئے۔  
 ”بجو!“ راستے میں ہنی نے کہا۔ ”آپ نے پوچھا نہیں، میں اتنے سارے دن کیا کرتا رہا؟“

”کیا پوچھوں؟“ اس نے اداسی سے کہا۔ ”اگر کوئی اچھی بات ہوتی تو تم خود ہی بتا دیتے۔“  
 ”بجو! میں نے ان چند دنوں میں مبشر حسن کے بارے میں کچھ معلومات اکٹھی کی ہیں اور.....“

”اور کیا؟“ اس نے بیتابی سے پوچھا۔

”آپ کے ان مبشر حسن نے مایوس کیا ہے مجھے۔ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کر سکتیں۔“

”ہنی۔“ اس کی آنکھیں جھللا گئیں۔ ”تم اتنے چھوٹے ہو، شاید تم نہ سمجھ سکو لیکن بہت سے فیصلے ایسے ہوتے ہیں جن پر نظر ثانی نہیں کی جاسکتی۔“

”ہوں۔“ اس نے پر خیال انداز میں سر ہلایا۔

”یہ تم کہاں جا رہے ہو ہنی؟“ مبشر کے آفس کی طرف مڑتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”آج ذرا ان سے ملاقات نہ کر لی جائے۔“

”میں نے تم سے کہا تھا ہنی کہ مجھے بھیک میں ملی ہوئی محبت نہیں.....“

”میں نے کہیں پڑھا تھا، بجو کہ محبتوں کا اناسے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔“ اس نے

اسے بات مکمل نہ کرے دی۔

”مگر ہنی! میں ایسی نہیں ہوں۔ اس طرح تو میں خود اپنی نظروں میں گر جاؤں گی۔“

”بھئی کچھ نہیں ہوگا، ہم صرف مل کے آجائیں گے۔“

وہ چپ ہو گئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اتنے سارے دنوں بعد اسے دیکھنا کیسے لگے گا بھلا۔ وہ کس طرح بات کرے گی۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیک گئی تھیں۔ دھڑکتے دل کو سنبھالے وہ ہولے ہولے چلتی اس کے ساتھ موبی کے آفس میں داخل ہوئی۔

”ارے مس مومن آپ!“ جہاں زیب نے ریسپشن روم میں گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ ”ہم پچھلے دو دنوں سے آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ موبی نے ایک نیا ڈراما لکھا ہے۔ اس کے لئے کرداروں کا چناؤ کرتے ہوئے کئی بار آپ کا ذکر آیا۔ کیسی ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں۔“ وہ مسکرا دی۔

”جہاں زیب، تم ابھی تک گئے نہیں۔“ مبشر تولنے سے ہاتھ صاف کرتا ہوا دروازے پر نمودار ہوا پھر اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لمحہ بھر یونہی اسے دیکھتا رہا۔ گہری والہانہ نظروں سے۔

نادرہ کی نظریں جھک گئیں۔ رخسار تپ اٹھے۔

مبشر نے چونک کر اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور جہاں زیب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”یار، تم جاؤ۔ کہیں وہ گھر سے نکل ہی نہ جائے۔ آج کسی فلائٹ سے وہ کراچی جا رہا ہے۔ تم اسے فوراً ایک کر لو۔“ پھر وہ نادرہ کی طرف مڑا۔ ”آؤ اندر چل کر بیٹھیں۔“

وہی پرانا انداز جیسے وہ ابھی کل پر سوں ہی ملے تھے اور درمیان میں کہیں کوئی فاصلہ

نہ تھا۔

”کیسی ہو؟“ اندر اپنے نجی کمرے میں بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”فائن!“ وہ مسکرا دی اور ہنسی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مبشر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہ اسد ہے۔“ نادرہ نے جان بوجھ کر پورا تعارف نہیں کرایا۔

”لاہور کب آئی ہو؟“

”آج ہی ہنسی لینے گیا تھا مجھے۔“

”کچھ دن ٹھہرو گی۔“

”شاید نہیں، کل چلی جاؤں گی۔“

”واہ، کل کیسے جائیں گی آپ۔ میں آپ کو اتنی جلدی نہیں جانے دوں گا۔ اب آپ یہاں ہی رہیں گی میرے پاس، جتنے دن میری چھٹیاں ہیں۔“ ہنسی نے لاڈ سے کہا۔

”اچھا بابا، دیکھیں گے۔“

مبشر نے ان کے لئے کولڈ ڈرنکس منگوائی اور پھر اپنے ڈرامے پر بات کرتا رہا۔ وہ اپنے ڈرامے کے سلسلے میں بے حد جذباتی تھا۔

”تم دیکھنا نادرہ! میرا یہ ڈراما بہت نام کمائے گا۔“

”آئی وٹش یو ٹو گڈ لک سر! نادرہ نے کھڑے ہو کر کہا۔ پتا نہیں، کیوں اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ پھر وہ ہنسی سے مخاطب ہوئی۔ ”چلو ہنسی، دادا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”بیٹھو نا۔“ بے اختیار اس نے کہا اور وار فنگی سے اسے دیکھا۔

”نہیں، بس اب چلتے ہیں۔“ وہ سنجیدہ تھی۔

”نادرہ!“ اس نے بڑی آہستگی سے اسے پکارا۔ کمرے سے نکلتے نکلتے پلٹ کر نادرہ نے اسے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہی والہانہ نظریں۔

”نادرہ!“ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔ اس کی شخصیت کا سحر اسے جکڑنے لگا۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”تم..... تم بہت خوبصورت ہو اور میں تمہیں مس کرتا ہوں۔“

”بجوا! ہنسی نے آواز دی تو وہ تیزی سے باہر نکل آئی، دل کی دھڑکنیں ایک دم ہی تیز ہو گئی تھیں۔

وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

اسے چاہتا ہے۔

اور سنی ماموں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

بس وہ مصروف ہے اس لئے۔

اسے یقین ہو گیا۔ ہنسی نے اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھا۔

”لگتا ہے، موبی صاحب نے کوئی بہت ہی خوبصورت بات کہہ دی ہے۔“

”ہنسی۔“ اس نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ ”ہنسی! ابھی تم بچے ہو، جب تم کسی سے محبت کرو گے اور تمہارے دل میں کسی کی محبت کی طلب جاگے گی تو پھر تم سمجھ سکو گے کہ محبت کرنے والے کتنے خوش گمان ہوتے ہیں اور کتنے نازک دل۔“

”آل رائیٹ میڈم! اب کیا پروگرام ہے، گھر چلیں۔“

”ہاں۔“

اور پھر دو دن بعد وہ دل میں نئی امیدوں کے چراغ جلانے ہنسی کے ساتھ واپس اسلام آباد آگئی۔ ہنسی کے پاس صرف پانچ دن تھے اور وہ چاہتی تھی کہ ہنسی یہ سارے دن اس کے پاس رہے۔

”اتنی خود غرض نہ بنیں، دادا کا بھی کچھ خیال کر لیں۔“

”میں خود غرض ہوں۔“ اس نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

”مجھے کیا پتا۔“ اس نے کندھے اچکائے۔



”ہنی، میں تمہیں ماروں گی۔“

”یہ حسرت بھی پوری کر لیں۔ سنا ہے آپ کو بڑی حسرت تھی کہ کوئی چھوٹا بھائی ہو تا تو آپ اس کے کان کھینچتیں۔“

”میں سچ بچ۔“ اس نے ہنی کے کان پکڑ لئے۔

”ارے ارے۔“ ہنی نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور پھر گیٹ سے اندر آتے مبشر حسن کو دیکھا۔

”ارے بچو! ادھر دیکھیں۔“

مبشر حسن نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔

”آپ!“ نادرہ کو حیرت ہوئی۔

”ہاں۔“ وہ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔ ”اسلام آباد آیا تھا، سوچا سنی سے ملتا چلوں۔“

”بیٹھیں آپ، سنی ماموں کہیں باہر گئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔“ نادرہ کو ہمیشہ کی طرح گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

ہنی کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا اور کرسی کھینچ لایا تھا۔

”پلیز!“ اس نے مبشر حسن کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

مبشر حسن بیٹھ گئے، انہوں نے ہنی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہنی نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر نادرہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں دیکھتا ہوں سنی ماموں کو۔ کیا خبر چپکے سے اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گئے ہوں۔“

”ہاں، سنی ماموں کا کچھ بتای نہیں چلتا۔“ نادرہ نے آہستگی سے کہا اور جاتے ہوئے

ہنی کو دیکھا۔ جو مسکراتا ہوا اسے اشارے کر رہا تھا۔

”لاہور سے کب آئی ہو؟“

”دو تین دن ہوئے۔“

”نادرہ!“ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ ”بہت دن پہلے میں نے تم سے ایک بات کہی تھی کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم..... میرا مطلب ہے، کیا تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں، میں اسی سلسلے میں سنی سے بات کرنے آیا ہوں۔“

”نہیں۔“ اس کی پلکیں جھک گئیں اور رخسار متمتا اٹھے۔

”میرا خیال تھا کہ شاید تم۔ میرا مطلب ہے، ہنی تمہارا ہم عمر ہے۔“

”وہ..... وہ۔“ شدید کرب سے الفاظ اس کے اندر ہی پھنس گئے۔ ”مجھ سے بہت

چھوٹا ہے اور میرے لئے سگے بھائیوں کی طرح ہے۔“

اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔

”سوری نادرہ! تم ہرٹ ہوئی ہو لیکن دیکھو نا، مجھے کیا پتا۔ تم نے کبھی بتایا مجھے۔“

”اور آپ نے کبھی پوچھا۔ کبھی خبر لی ان چھ سات ماہ میں۔“

”میں بہت مصروف تھا لیکن یقین کرو، میں نے اکثر تمہیں سوچا۔ جب کبھی میں اکیلا ہوتا۔ جب کبھی.....“

”ارے موبی۔“ سنی ماموں نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ بات ادھوری چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ بہت مطمئن تھی، اس کا انتظار رائیگاں نہیں گیا تھا۔ سنی ماموں نے پیلا سے بات کر کے اس کی رخصتی کی تاریخ طے کر دی تھی ہنی کو افسوس تھا کہ وہ اس کی رخصتی تک رک نہیں سکتا۔ تین روز بعد اس کی فلائٹ تھی اور لاہور سے دادا کے فون پر فون آ رہے تھے۔ وہ اس کے کمرے میں ہی بیٹھا بیگ میں کپڑے ٹھونس رہا تھا۔

”یہ کیا کر رہے ہو ہنی! ایسے کپڑے رکھتے ہیں لاؤ مجھے دو؟“ اس نے بیگ اس سے چھین لیا۔ ”بہنوں کی موجودگی میں بھائی کام کرتے اچھے نہیں لگتے۔“

تب ہی مبشر حسن نے دروازے پر دستک دی۔

”سنی ماموں آجائیں۔“ لیکن ان کے بجائے مبشر کو دیکھ کر اس کے رخساروں پر شفق دوڑنے لگی۔

”میں واپس جا رہا تھا، سوچا خدا حافظ کہہ دوں۔“

”ہنی بھی جا رہا ہے۔ دو گھنٹے بعد اس کی فلائٹ ہے۔“ نادرہ نے بتایا۔

”اچھا، پھر تو ساتھ رہے گا۔ مجھے بھی دو گھنٹے بعد جانا ہے۔“

”پھر تو سفر اچھا کئے گا۔“ ہنی ایک دم سے خوش ہو گیا اور نادرہ سے بیگ لے کر جلدی جلدی کپڑے اس میں رکھنے لگا۔

”آپ بیٹھیں نا۔“

”نہیں، مجھے ابھی ایک کام ہے۔ خدا حافظ!“ وہ وہیں سے واپس پلٹ گیا۔

”آپ کے ان صاحب بہادر کے موڈ کی سمجھ نہیں آتی کبھی ایک دم بہت اچھا اور کبھی ایک دم بہت خراب۔“ بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے جب ہنی نے کہا تو وہ مسکرا دی۔



ایئر پورٹ پر مبشر ملا مگر وہ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا اور سارا وقت سنی ماموں سے اپنے ڈرامے کی باتیں کرتا رہا۔ جاتے ہوئے وہ ایک لمحہ اس کے پاس رکا تھا اور سر کو جھکا کر ہو لے سے خدا حافظ کہا تھا۔ پھر تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ ایک بار بھی اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا البتہ ہنی جہاز کی آخری سیڑھی تک مڑ کر اسے دیکھتا اور ہاتھ ہلاتا رہا۔ ہنی نے وہاں جا کر اسے کوئی فون نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس نے کتنی تاکید کی تھی کہ سیٹ اگر اوکے ہو جائے تو وہ اسے انفارم کرے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اسے ضرور سیا آف کرنے جائے گی۔ وہ جو اتنی دور سے صرف اس کی خاطر آیا۔ اس کی پریشانی اور اداسی کا خیال کر کے حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی پریشانی دور کرنا اس کے اختیار میں نہیں ہوگی پھر بھی۔ اور اب پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ کیا وہ واپس چلا گیا تھا، یونہی بغیر اسے

اطلاع دیئے، بغیر اسے خدا حافظ کہے۔ اس نے خود کئی بار ٹرائی کیا تھا لیکن ادھر بیل ہوتی رہتی کوئی اٹھاتا ہی نہیں تھا۔ کیا دادا بھی اس کے ساتھ چلے گئے تھے اور سارے نوکر کہاں گئے تھے؟

وہ بہت پریشان تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ہنی کے متعلق آخر کہاں سے پتا کرے کہ اچانک اسے مبشر کا خیال آ گیا ہاں ٹھیک ہے۔ میں انہیں ہی فون کر کے کہہ دیتی ہوں کہ ذرا ہنی کا پتا کر دیں۔ مبشر کو فون کرنے کے خیال سے وہ اٹھی ہی تھی کہ بیل بج اٹھی۔ دوسری طرف ہنی تھا۔

”ہنی کے بچے کہاں تھے تم؟“ اس کی آواز سنتے ہی وہ چیخ پڑی۔ ”فون کرتے کرتے میرے ہاتھ تھک گئے مگر.....“

”فون خراب تھا۔“ ہنی نے آہستگی سے کہا۔

”تم کہیں اور سے، باہر سے فون نہیں کر سکتے تھے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم اب تک امریکا پہنچ گئے ہو گے۔ اگر تم چلے جاتے نا مجھے خدا حافظ کہے بغیر تو میں سمجھتی تم سے، بتاؤ نا کیوں نہیں فون کیا تم نے.....“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”کیا ہوا تھا تمہیں؟“

”پتا نہیں۔“

ہنی کے بچے، یہ تم اتنے سنجیدہ کیوں بنے ہوئے ہو۔ صحیح طرح سے بات کرو نا مجھ سے۔“

”کیا بات کروں۔“ وہ بہت سنجیدہ تھا۔ چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔

”صبح میری فلائٹ ہے میں نے سوچا آخری بار آپ کو خدا حافظ کہہ دوں۔“

وہ چیخ اٹھی۔ ”ہنی یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں، مجھے پریشان کیوں کر رہے ہو؟“

”آپ کو کیا خبر کہ ان بیٹے ہوئے چند دنوں میں، میں نے نے کتنی اذیت اٹھائی ہے اور میں کتنا پریشان رہا ہوں۔“

”ہنی پلیز۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔ ”پلیز بتاؤ نا کیا ہوا ہے تمہیں۔ کیا ادا یہاں ہیں؟“

”نہیں، دادا تو ٹھیک ہیں۔“

”پھر؟“

”کچھ نہیں۔ اچھی سی کوئی بات کریں، آخری بار میں آپ سے اچھی اچھی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”آخری بار! آخری بار ایسی بات کیوں کر رہے ہو، میں رو پڑوں گی۔“

”دل تو میرا بھی چاہتا ہے رونے کو مگر۔“ وہ لمحہ بھر کو چپ ہو کر بولا۔ ”کچھ لوگ کتنے بد نصیب ہوتے ہیں بجو میری طرح محبتیں پا کر کھودیتے ہیں۔“

”ہنی مجھ سے صاف صاف بات کرو۔“ وہ رو پڑی۔

”بجو آپ کی محبت پا کر میں سمجھتا تھا کہ میری عمر بھر کی محرومیوں کی تلافی ہو گئی ہے۔ میں کتنا زیادہ خوش ہوتا تھا اور وہاں نیو جرسی میں اپنے کلاس فیلوز کو بھی بتایا کرتا تھا کہ میری ایک بہن ہے، بہت ہی پیاری اور محبت کرنے والی۔“

”کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے ہنی۔ مجھ سے خفا ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے ادا سی سے کہا۔ ”آپ کی آئندہ زندگی کی خوشیوں کی خاطر بجو میں نے۔۔۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی زندگی سے نکل جاؤں۔“

”ہنی!“ وہ ساکت سی ہو گئی۔ ”کیا موبی نے تم سے کچھ کہا؟“

”کچھ نہیں، بہت کچھ۔ اسلام آباد سے لاہور تک کا سفر بہت اچھا کٹانا کی معیت میں۔“

”میں بات کروں گی موبی سے شاید کوئی غلط فہمی.....“

”نہیں، کوئی غلط فہمی نہیں مگر وہ ایسا ہی ہے۔“ ہنی نے اسی طرح ادا سی سے کہا۔ ”خدا کرے، آپ خوش رہیں۔ وہ آپ کو خوش رکھے۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔ میں یہی سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہوں گا کہ اس بھری دنیا میں کہیں کسی جگہ میری ایک بہن ہے جو میرے لئے دعائیں کرتی ہو گی اور۔“ اس نے بات مکمل کئے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

”نہیں، ہنی نہیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رودی۔

”وہ ہنی کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔۔۔ اور موبی کو بھی نہیں، یکا یک وہ بیچ دورا ہے پر آکھڑی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، مبشر سے بات کرے، اس سے پوچھے تو۔ مگر آخر کیا کہے گی وہ اس سے، تب پریشان ہو کر اس نے پھر ہنی کو فون کیا۔

”ہنی بابا، یہ میں تھی جس نے تمہیں خود لندن میں بلایا تھا، تم تو مجھے جانتے تیک نہ تھے۔ اور اب۔ نہیں ہنی بابا میں مبشر سے کہہ دوں گی کہ میں اس رشتے کو جسے میں نے خود قائم کیا تھا نہیں توڑ سکتی۔ وہ چاہے تو.....“

”نہیں پلیز، بجو آپ کو میری قسم آپ کچھ نہیں کہیں گی ان سے، مجھے یقین ہے، بہت جلد آپ مجھے بھول جائیں گی۔ خدا آپ کو بہت بہت خوش رکھے۔ میں آپ کا بھائی ہوں نا اور بھائی تو بہنوں کو اپنے گھروں میں آباد دیکھ کر ہی خوش ہوتے ہیں۔“

وہ بہت دیر تک اسے سمجھاتا رہا لیکن اس کے دل پر ادا سی کا کھر سا گرتا رہا۔ وہ ساری رات جاگتی رہی۔ ہنی کی فلائٹ اسلام آباد سے ہی جانا تھی، وہ اسے سی آف کرنے پہنچ گئی۔ بہت دیر تک اس کے ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگائے وہ روتی رہی۔

وہ ساکت کھڑا رہا اور جب وہ جہاز کی سیئر ہیاں چڑھ رہا تھا تو مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا وہ اسے مسز فیروز کا دہی ہنی بابا لگا جو پلٹ پلٹ کر مسز فیروز کو دیکھ رہا تھا اور جس کی اداس

آنکھوں کی جھیلوں میں کہیں ایک آنسو منجمد ہو گیا تھا مگر پگھلا نہیں تھا۔

پاپا اور ماما آگئے تھے لیکن وہ بہت اداس تھی اور اس بے نام اداسی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ اتنی خوش نہیں تھی جتنا اسے ہونا چاہئے تھا اس کی رخصتی سے دو تین دن قبل کرن اور سمیرا بھی آگئی تھیں وہ دونوں کتنی خوش تھیں اور کتنی مطمئن کیا وہ بھی ان کی طرح خوش ہو سکے گی۔ کیا مبشر حسن کی محبت ان ساری محبتوں کی کمی پوری کر دے گی جو اسے زندگی میں مل مل کے بچھڑتی رہی تھیں۔

بی جان کی محبت۔

آنٹی کی محبت۔

اور..... اور ہنی بابا کی محبت۔

”شاید..... شاید سارے خلا پر ہو جائیں، سارے زخم بھر جائیں۔ صرف ایک اس کی محبت ساری محرومیوں کی تلافی کر دے۔

ہاں، ایسا ہی ہو گا۔

سارے خلا پر ہو جائیں گے وہ اسے چاہے گا اتنا ٹوٹ کر کہ پھر کوئی پچھڑی محبت یاد نہیں آئے گی۔

ایک امید بھری مسکراہٹ اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیتی تو کرن اسے چھیڑتی۔

”سچی ندو! تو کتنی بے تحاشا خوبصورت ہو گئی ہے، مجھے تو ڈر ہے کہیں مبشر حسن غش کھا کر گر ہی نہ پڑے۔“

مبشر حسن غش کھا کر تو نہ گرا لیکن وہ بہت دیر تک اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے اسے دیکھتا رہا۔ پھر یکدم یوں پیچھے ہٹ گیا جیسے اس نے آگ کو چھو لیا ہو۔ اس کی طرف پیٹھ کئے وہ کھڑکی کے پاس بہت دیر تک جانے کیا سوچتا رہا اور نادارہ

حیران سی سر جھکائے بیٹھی رہی۔

”نادارہ!“ یکایک وہ اس کی طرف پلٹا۔ ”تمہیں پتا ہے، تم ہمارے کتنی بے تحاشا ملتی ہو۔ تمہاری یہ خوبصورت آنکھیں، یہ دلکش ہونٹ ہو بہو ہما کی طرح ہیں۔“

نادارہ نے بے اختیار سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، وہ دلہن تھی اور سب کے بقول قیامت ڈھا رہی تھی لیکن وہ اس سے کتنا بے نیاز اور بے پروا اس سے اتنی دور کھڑا ہما کو یاد کر رہا تھا اور اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے آج ان کی شادی نہیں ہوئی تھی بلکہ ہمیشہ کی طرح وہ یونہی اس سے ملنے چلی آئی ہو اور.....

”اور تم جانتی ہو، میں نے اس کے عشق میں ہفت خواں منزلیں طے کیں۔ ہر منزل پر سینکڑوں بلائیں اور عفریت میرے منتظر تھے۔ میرا سفر بڑا کٹھن اور طویل تھا اور جب میں ان طویل کٹھن مسافروں کے بعد منزل پر پہنچا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں تو اس آخری منزل پر بالکل اکیلا اور تنہا ہوں۔“

وہ اپنی بڑی بڑی کشادہ آنکھیں کھولے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا بھاری دوپٹا اس کے سر سے پھسل گیا تھا لیکن وہ بے خبری اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اور وہ نہیں تھی۔ میں نے اسے بھلانے کی کوشش کی لیکن نہیں بھلا سکا۔ وہ تو آج بھی میرے دل میں روز اول کی طرح ہے اور اس کی محبت میری رگوں میں میرے لبوں کے ساتھ دوڑ رہی ہے۔“

اس کے اندر کچھ ٹوٹنے اور پکھلنے لگا۔

”تم کہو گی نادارہ کہ پھر میں نے تم سے شادی کیوں کی؟ شاید میں کچھ عجیب ہوں۔ جب وہ مجھے بہت بے تحاشا یاد آتی تو بے اختیار میں تمہاری طرف آ جاتا۔ اور دل چاہتا کہ تمہیں دیکھتا رہوں۔ تمہاری آنکھوں کو اور تمہارے ہونٹوں کو، تمہاری موجودگی

سے میں خود کو بہلاتا تھا۔ تمہارے نقوش میں اسے ڈھونڈتا۔ پھر جب تم نے بتایا کہ تمہارے پاپا تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے لگا جیسے میں ہما کا دکھ برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ مجھے اعتراف کر لینے دو کہ تم نے ہما کی جدائی کا دکھ سہارنے میں غیر ارادی طور پر میری مدد کی۔ میں تھوڑا سا خود غرض ہو گیا تھا، میں چاہتا تھا تم میرے سامنے رہو ہمیشہ۔ جب کبھی ہما کی یاد بہت شدت سے آئے تو تم مجھے سہارا دو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم کسی دوسرے کی دسترس میں چلی جاؤ۔ تم جو ہمارے اتنی ملتی جلتی ہو۔ تم جو اسی کی طرح خوبصورت اور دلکش ہو۔ میں ہمیشہ تمہیں اپنے پاس اپنے قریب دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے شاید یہ وفا نہیں تھی، ہما کے ساتھ۔۔۔ وفا نہیں ہے۔ ہما یہی سوچے گی لیکن یہ بات اسے کون بتائے کہ میں تم سے محبت نہیں کر سکتا۔ پھر بھی میں تمہارے معاملے میں خود غرض ہوں میں نہیں چاہتا کہ کوئی جہاں زیب کوئی ہنی تمہاری طرف دیکھے بھی۔“

اسے لگا جیسے اس کا وجود کپچی کپچی ہو رہا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں کوشش کروں گا کہ تمہارے سارے حقوق ادا کر سکوں لیکن مجھ سے محبت کی طلب مت کرنا۔“

وہ خدا جانے کیا کیا کہہ رہا تھا مگر آوازیں جیسے اس کے ارد گرد مر گئی تھیں، وہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔۔۔ اس کے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے، طوفان اٹھ رہے تھے اور اندر ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی یوں جیسے زلزلہ آگیا ہو اور عمارتیں دھڑا دھڑا گر رہی ہوں اور بلبے کے نیچے دبنے والوں کی چیخوں اور شور سے کچھ سنائی نہ دے رہا ہو۔

وہ دونوں ہاتھوں کی تھیلیاں بیڈ پر ٹیکے تھوڑا سا آگے جھک گئی۔

”کرن سنو! میں محبت کرنا چاہتی ہوں، بڑی میچور قسم کی محبت اور وہ مجھ سے یوں

محبت کرے گا۔ اس طرح اس دنیا میں کسی نہ کسی کو نہیں چاہا ہو گا۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”اور دیکھو تم مجھ سے ڈر گئے۔ حالانکہ میں تو۔۔۔ میں تو۔“ اس کے لب بل رہے تھے لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔

مبشر حسن اس کی کیفیت سے بے نیاز اس کی طرف پیٹھ کئے کھڑکی سے باہر جانے تاریکی میں کیا دیکھ رہا تھا۔

”اور تم محبت سے ڈر گئے۔“

اس کے ہونٹ ہنسی کے انداز میں پھیل گئے۔

”اور ہنی بابا تم کہاں ہو؟“

آؤ میں تمہارے کندھے پر سر رکھ کر رولوں۔

بی جان۔

مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

میرے اندر خلا ہی خلا ہیں، گہرائیاں ہی گہرائیاں۔“

ایک ایک اس نے اپنے ہاتھ اٹھا لئے اور کھڑی ہو گئی۔ اس کا دو پٹا نیچے گر گیا تھا۔ ”سنو سنو۔ تمہیں پتا ہے میرا نام نادرہ ہے۔“

اور انار کلی بھی نادرہ تھی۔

ہم دونوں محروم محبت ہیں۔“

پھر وہ تیزی کی طرح گھومی۔

اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

بس ایک بار۔

اس نے اپنی بند ہوتی آنکھوں کو زبردستی کھولا، بند کیا۔

بس ایک بار مجھے ٹوٹ کر ملے کوئی۔

پھر۔۔

اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے ایک نظر مبشر حسن کی طرف دیکھا جو اس کی طرف پیٹھ کئے کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں کے کونوں میں آنسو اکٹھے ہونے لگے۔

وہ مڑ کر یو نہی پاؤں لٹکائے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

مبشر حسن نے اچانک مڑ کر اسے دیکھا۔

اجنبی نظریں۔

اس کی پلکیں جھک گئیں وہ مڑا اور الماری سے اس نے اپنا وہی پسندیدہ مشروب نکالا۔

”سوری تاد رہ! آج کی رات میں بہت اپ سیٹ ہوں، تم آرام کرو۔“

وہ گلاس اور بوتل اٹھائے باہر نکل گیا۔

کونوں میں اٹکے ہوئے آنسو رخساروں پر پھسل آئے اور اس کے اندر جیسے سب کچھ ڈھے گیا، ختم ہو گیا۔

اب وہاں صرف ملبہ تھا اور اس سے اڑنے والی دھول، اسے لگا، جیسے وہ مر رہی

ہے۔ انسانی جسمانی طور پر ہی نہیں، کبھی کبھی روحانی طور پر بھی مر جاتا ہے۔

”ہنی بابا!“

کیا میری موت پر نہیں آؤ گے۔

کیا مجھے کندھا نہیں دو گے۔ آؤ میں تمہاری آنکھوں میں جے ہوئے آنسو کو اپنی

انگلیوں سے پونچھ دوں۔

کرن! تم جی کہتی تھیں۔ میں دھوکا کھا گئی۔

”شیر دل سنو۔“

وہ ایک دم پھر کھڑی ہو گئی۔ اسے لگا جیسے دیواریں ہولے ہولے اپنی جگہ سے کھسک رہی ہوں۔ وہ کانپنے لگی۔ لہرانے لگی۔

”بس ایک بار۔“ اس کے لب ہلے۔

”پھر اس کے بعد بکھر جاؤں۔“ وہ ایک طرف کو جھک گئی۔

”بس ایک بار۔“ اس کی آواز ٹوٹ گئی لیکن اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور وہ گری جا رہی تھی۔